سیپ




بیش مزا - بیش قدر
نئی
رچ برو
Lipton
RICHBRU
250 grams
NEW
RICHBRU
پاکستان بھر میں
سب سے زیادہ
والی چائے
LRB 2 87


اگر آپ کو اپنے صنعتی منصوبے کے لئے سرمایہ درکار ہے تو
این ڈی ایف سی سے رجوع کیجئے!
طویل المدت کے قرضے اور دیگر اسلامی طرز کی سرمایہ کاری
زرمبادلہ میں قرضے
اجارہ
عبوری مالی اعانت
لیٹر آف کریڈٹ گارنٹی
صنعت کو چلانے کے لئے قرضے
بیرونی تجارت کے لئے قرضے
مارکیٹنگ، تکنیکی اور مالی مشورے
ملکی مشینری کی برآمدات کے لئے قرضے
غیر سودی سرمایہ کاری
سنڈیکیشن
سرمایہ کاری کے علاوہ ہماری ماہرانہ رائے سے بھی استفادہ فرمائیے۔ جس کی بدولت آپ کے صنعتی منصوبے بروقت اور کم سے کم لاگت میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں گے۔ ہمارا مطمح نظر قومی ترقی اور پیداوار کو بڑھانا ہے۔ چاہے یہ مقصد نجی صنعتکاری سے حاصل ہو یا سرکاری شعبے میں صنعتکاری سے ہو۔ اگر آپ نے کسی پروجیکٹ کے بارے میں سوچا ہے تو آپ بصد شوق این ڈی ایف سی سے رابطہ قائم کیجئے۔ (ٹیلیفون: ۹/۷۷۔۵۵۱)
ہم آپ کی سرمایہ کاری کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں
نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن
PID/Islamabad.
ADGROUP

[illegible]



ہٹاچی لومینر ٹیوب لائٹ

جاپان کے اشتراک سے تیار کردہ واحد ٹیوب لائٹ

دن کی قدرتی روشنی کا احساس
آنکھوں کے لئے راحت، چہروں پہ مسکراہٹ

ہٹاچی لومینر ٹیوب لائٹ

- دیگر ٹیوب لائٹس کی نسبت زیادہ عرصے تک کار آمد
- سفید روشنی
- ۷۵ سالہ ترقی یافتہ جاپانی ٹیکنالوجی
- اصلی جاپانی پرزہ جات

ڈسٹری بیوٹرز:
پاکستان ریڈیو اینڈ گراموفون ایجنسی (پرائیویٹ) لمیٹڈ
کراچی۔ ملتان۔ لاہور۔ راولپنڈی

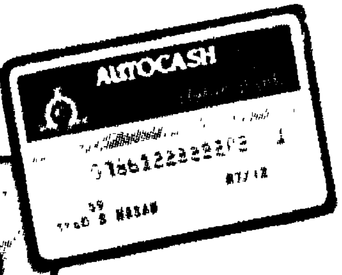
☐ THINKER 3 86

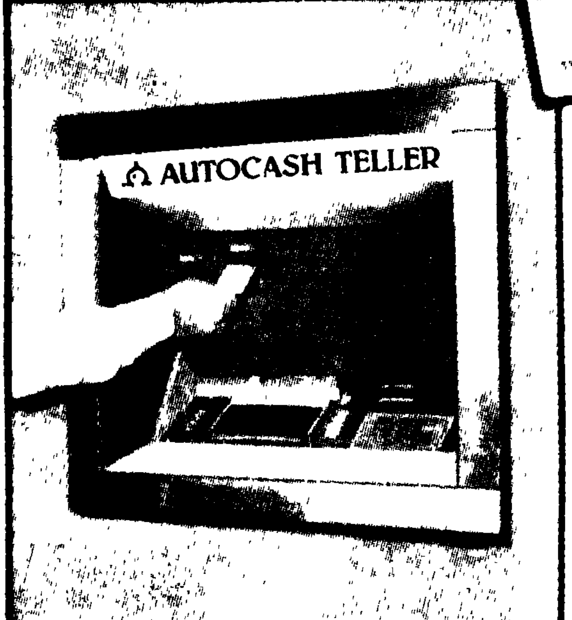
حبیب بینک

ٹیکنالوجی کے ایک نئے دور میں

Self Service Banking
Autocash Teller

یہ مشین 24 گھنٹے
اور سال کے 365 دن
آپ کو رقم نکالنے کی
سہولت فراہم کرتی ہے





فوری ضرورت کی تکمیل کے لیے 24 گھنٹے میں کسی بھی وقت آٹوکیش کارڈ مشین میں ڈالیئے اور:

i ۔ رقم نکالیئے۔
ii ۔ چیک بک یا اسٹیٹمنٹ آف اکاؤنٹ کی درخواست کیجیئے۔
iii ۔ کھاتے میں موجود رقم معلوم کرنے کی درخواست کیجئے

کارڈ ڈالتے ہی خودکار مشین خوشگوار آواز میں پوری طرح آپ کی رہنمائی کرے گی۔ تاکہ آپ کمپیوٹرائزڈ طریقے سے خودکار خدمات حاصل کر سکیں۔

اپنے کھاتے داروں کی اضافی سہولت کے لئے حبیب بینک کراچی نے سینٹرل برانچ، حبیب بینک پلازہ میں ایک اے ٹی ایم مشین نصب کر دی ہے اور دوسرے شہروں میں یہ مشینیں جلد نصب کر دی جائیں گی۔

اپنے کھاتے داروں کو جدید بینکاری کی خدمات مہیا کرنے کے سلسلہ میں حبیب بینک کی یہ ایک اور مفید پیشکش ہے۔

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

فکرِ نو کا ترجمان

ماہنامہ

سیپ

شمارہ — ۵۱

سہ ماہی اشاعتِ خاص

مدیر

نسیم دُرّانی

موجودہ شمارہ: قیمت: ۳۰ روپے۔ چار شماروں کی قیمت ۱۰۰ روپے مع رجسٹری فیس

سیپ پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴، کراچی ۲۸

فون: ۶۸۰۱۰۶ — ۶۸۴۸۸۸ — ۶۷۳۲۶۷

ترتیب

اداریہ : ۱۸
سرورق : جمیل نقش

حمد	صبا اکبر آبادی	۲۰
حمد	اُمید فاضلی	۲۱
نعت	صبا اکبر آبادی	۲۲
ناطاحاط	عبدالعزیز خالد	۲۳
نعت	سرشار صدیقی	۲۴
نعت	مانی فاروقی	۲۵
نعت	غفار بابر	۲۶

مضامین/جائزے

اردو رسالے کا ایک باب ۔ سرزمین کلیان	ڈاکٹر الیاس عشقی	۱۹۸

(۲)

اردو کے عصری تقاضے	ڈاکٹر انور سدید	۲۱۳
شاعری ساختیت کے نقطۂ نظر سے	قمر جمیل	۲۲۳

(۳)

دشتِ زرفشاں	مجنوں گورکھپوری	۲۲۷
کیمیا گر	ڈاکٹر حنیف فوق	۲۲۹
اللہ میگھ دے	محمد افسر ساجد	۲۳۳
گیان درپن	شان الحق حقی	۲۳۵

شخصیت

ناصر کاظمی کی یاد میں	سہیل احمد	۱۰۷

افسانے

ہم رقص	صادق الخیری	۲۸
کلینڈر اور قحط	شرون کمار ورما	۳۷
وزن	سلطان جمیل نسیم	۴۱
پہچان کا کرب	ستیش بترا	۵۳
احمق گھڑ پتلی	سلیم اختر	۵۷
گم شدگی	مشرف احمد	۶۳
اونگھتا منظر	رشید امجد	۶۷
ہوا یہ کہ اک دن	احمد یوسف	۶۹
سبزہ اور سنگ زاد	نجم الحسن رضوی	۷۵
مسافر اور تلاشِ منزل	حفیظ احسن	۸۱
کمیونیکیشن گیپ	طارق محمود	۸۷
سوچوں کا جزیرہ	طاہرہ بلوچ	۹۳
پکار	علی تنہا	۹۷
ریت کے محل	خالد سہیل	۱۰۳

غزلیں

شکایت نہ لب پر گلا ہے یہاں کیوں خلاصہ اس کو چاہت کا سمجھ بیٹھے تھے ہم گرد کی چادر تنی ہے دیکھئے آرزو کا یہ تماشا کیا ہے ہر طرف یہ دھواں سا کیسا ہے تجھے پا کر تجھے پانے کی ہم نے حسرتیں کیا ہیں بحال ہو کے بھی اب جی نڈھال کیسا ہے بسا ہے آنکھوں میں صحرا یہ حال تو دیکھو تجھے پا کر میں خود میں آؤں کیسے گمان اپنا ہوں یا میں خیال اپنا ہوں	احمد ہمدانی	۱۱۴

نہ کسی یار سے ناراض نہ اغیار سے ہم ہیں برگ زرد سے خالی بدن درختوں کے کوئی بھی نام نہ تھا لب پہ تیرے نام کے بعد مجھ سا ہے مجھے وہ بھی خود پسندوں میں آنکھیں بھی عذاب دے رہی ہیں فولاد میں ڈھل رہی ہے دنیا ہر چہرہ ہے اک کتاب پڑھے کچھ کم ہوا اضطراب مجھ میں	محسن احسان	۱۱۹
آدھا جیون بیتا آہیں بھرنے میں ڈھلتا سورج آنکھ کا ریزہ ہو جاتا ہے شب چراغ کر مجھ کو اے خدا اندھیرے میں ہر آن ایک نیا امتحان سر پہ ہے چاند نکلا جب افق پر تری انگڑائی کا آخر شب جو ہم صبح کے اسباب ہوئے سبز شجر سے توڑ کے رشتے اب پچھتاتے ہیں خوابوں کے یہ جگنو مری آنکھوں میں نظر بند خواب اپنی تعبیر سے ڈر گئے آنکھوں میں ہر سانس میں ہے سر پہ خامہ	شبنم رومانی	۱۲۳
کبھی بوند بوند سحاب میں اُسے دیکھنا سکوت اس روز بحرِ ہفت آسماں میں تھا ہوا میں اُڑتے رہے شبنمیں گلوں کے رنگ بدلتے مناظر کی مشتاق نظریں وہیں رہ گئیں اک روشنی بجھتے ہوئے ذرات میں آئی رستے میں رات آئی تو نمدہ بچھا لیا	خالد اقبال یاسر	۱۲۸
ہوا ہے نازل اک آئینے پہ غضب ہوا کا طلب نہیں ہے متاعِ خورشید کی ہوا کو اک اشارے پہ ہوتی ہے جب تیار ہوا کھلا ہے رنگِ دنیا پھر ہوا سے	غلام حسین ساجد	۱۳۱

اس پار سمندر کے جاگیر ہوا کی ہے
بھڑکتا ہے مرے دل میں چراغِ شہر ہوا کا
گلے سے بھی لگایا تھا دمِ رخصت ہوا نے
چراغِ صبح سے چھینا ہے اس کا حق ہوا نے
خوش آیا نہیں صبح کا منظر بھی ہوا کو
راس آتی ہے نظمِ جہاں کو اگر اس دیئے کی ہوا
پھر کھینچتی ہے شمعِ جہاں تاب کی ہوا
کہاں محصور کرتی ہے مناظر کو ہوا میری
بنا لیا ہے کہیں فلک پر مکاں ہوا نے
چراغ اور آئینے سے منہ موڑ کر ہوا نے
تھکن سے گھومتا رہتا ہے سر زیری ہوا کا
نقش کریں گے جبر کے ماتھے پر تحریر ہوا کی
اسیر کیسے کروں گا اس نیلمیں ہوا کو
اس خواب کے ورثے میں اک دہر ہوا کا ہے
ہر چند آئینے کو نسبت نہیں ہوا سے
کئی دن سے بلاتے ہیں ستارے بھی ہوا کو

غلام حسین ساجد — ۱۳۳

وہ دل نواز ہے کیوں دل کو اعتبار نہیں
وہ بے مثال تھا اور مجھ سے پیار کرتا تھا
میں تیری آنکھ میں ٹھہرا ہوا ہوں
جگر کو چاک کروں صاحبِ ہنر ٹھہروں
میں آگ ہوں نہ میرے پاس آ جلا دوں گا
یہ کون ہے مجھے بلا رہا ہے

کرامت اللہ غوری — ۱۴۱

پلک جھپکتے حقائق فسانہ ہوتے ہیں
تلاشِ رزق میں دیوان کرتا رہتا ہوں
زیادہ خواب بھی اعصاب کو تھکاتے ہیں
وہ ایک نام جو دریا بھی ہے کنارا بھی
میں شاعر کاذب لفظوں کا میں عاشق کچے رنگوں کا
اب کے اداسیوں کی تب و تاب اور ہے

اسعد بدایونی — ۱۴۴

سورج کی طرح قریۂ مہتاب میں آیا مرے رنگ زار میں اس برس یہ کمال موجِ بلا کا تھا ہم اپنے ہجر میں اپنے وصال میں گم ہیں رہی اگرچہ نگاروں کی مہربانی بھی	اسعد بدایونی	۱۴۷
ہمیں خبر تھی بچانے کا اُس میں یارا نہیں تو بدل کر کبھی انداز پذیرائی کا شام کا پہلا ستارہ ڈوبا کسی نے حشر بپا کر دیا ہے پتھرائی ہوئی آنکھ میں آنسو نہ رہا رقص کرتی لہر یہ بس مسکرانا چاہیے	یاسمین حمید	۱۴۹

نظمیں/نثری نظمیں

اندھی مسافت کا بھنور ہونی انہونی محبتوں کے نگار خانے میں عہدِ بے نام کا منظر نامہ	احمد ظفر	۱۵۴
خوشبو کے بعد نجات شہر میں ایک تحریر موت شناخت	بلراج کومل	۱۶۰
شاخِ نبات	عبدالعزیز خالد	۱۶۳
نادان لمحوں کی خوشبو علم زینہ زینہ اُتر کے دیکھو	ادیب سہیل	۱۶۷
جہاں پناہ خیریت نامہ دیوارِ گریہ کی جانب	شبنم رومانی	۱۶۹

خیمہ بستی شہرت آشوب	شبنم رومانی	۱۷۰
وقت بھی کتنا ظالم ہے صدائے آشنا	امجد اسلام امجد	۱۷۲
اظہارِ ہنر	اظہر قادری	۱۷۳
اب شام ڈھلے	رحمٰن فراز	۱۷۵
زندگی میرا گھر	مختار کریمی	۱۷۶
آسرا تعلق مشغلہ	جلیل عالی	۱۷۸
آئینہ	محمد افسر ساجد	۱۷۹
جو پیڑ صدیوں کا تھا پرانا وعدہ	جمیل عظیم آبادی	۱۸۰
نئے موسم کی سوغات پوروں میں آنکھیں	رحمٰن خاور	۱۸۲
محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے	سلیم کوثر	۱۸۳
مجھے ڈر لگتا ہے ایک سوال المنظر کی ایک شام مصروفیت	فاطمہ حسن	۱۸۴
خموشی بیان تک پہنچی ایک رات کا مہمان	تسلیم الٰہی زلفی	۱۸۵
راستے سفر میں ہیں سراغ کا ایک لمحہ آج کڑوا گھونٹ	ثروت سلطانہ	۱۸۶

عشقِ بیچاں	لطف المنان	۱۸۸
سرِ ساحل یاد	ماہ طلعت زاہدی	۱۸۹
کہانیاں حاصلِ صد عمر	رب نواز مائل	۱۹۰
بیروت میں کربلا کی بازگشت ڈرو اس وقت سے	محمد فیروز شاہ	۱۹۱
سارے ساتھ چلتے ہیں انتباہ	ثمینہ راجہ	۱۹۲
حادثہ زرد پتوں کی بہار	شاہین بدر	۱۹۳
آگ نظم	گوہر سلطانہ عظمیٰ	۱۹۴
شکنجے طفل تسلی دوسری غلطی مسافر معترض سے گاہک مقصدِ حیات نظم جذبۂ تعمیر سلامت فرض منصبی	ارشد جہلمی	۱۹۵

غزلیں (۲)

کربِ ہجر کے لمحے، خود بخود گزر جائیں	ظہیر کاشمیری	۲۴۰
اپنی خاموشی ریاضت کا اثر بھی دیکھو تری نگاہ نے بدلے ہیں فیصلے کتنے	جمیل ملک	۲۴۱
ستم صیلوں میں جھول کر بھی کوئی نبرد آزما رہا ہے [illegible] یادوں کو سہا سکتے نہیں	فارغ بخاری	۲۴۳

اندھیرے رستے میں رہنما ہو، مگر کہاں ہو	پرتو روہیلہ	۲۴۴
میں جہاں تھا ایک جنگل خوف سے لبریز تھا صبح ناشاد کر رہی ہے ستاروں کے قریب	قمر جمیل	۲۴۵
تاروں سے بھری راہ گزر لے کے گئی ہے	مظہر امام	۲۴۶
سیل در سیل ہم رواں ہی رہے	غلام محمد قاصر	۲۴۷
اگرچہ، صاحبو غم باعثِ خانہ خرابی ہیں	کیف انصاری	۲۴۸
کب تک لکھا اور لکھوگی کہاں جاؤں کہ میرا گھر کہاں ہے	صائمہ خیری	۲۴۹
ہیبت میں زمیں پہ یہ بلاؤں کی طرح ہیں رشتوں کی دھوپ چھاؤں سے جب تک کٹے نہ تھے	شوکت مہدی	۲۵۰
تیرگی کے روپ میں پھیلے گی رسوائی میری سجائے ہاتھوں پہ خواب ہم نے حنا سمجھ کر	کوثر صدیقی	۲۵۱
جب مجھ پہ عیاں ہوگا مری ذات کا جنگل وہی کہ دستِ خزاں میں بکھر گئے میرے	نسیم سحر	۲۵۲
سہیں کیوں رنج بختِ آسماں تبدیل کرنے میں خبر کا اجر ترے شہر میں کیا دیتے ہیں	گلزار بخاری	۲۵۳
ہوا کے ساتھ پرندوں کے پر نہیں آتے ملتا ہے سکوں وصل کی باتوں میں زیادہ	فاضل جمیلی	۲۵۴
خاموش تھا یہ بات مرے حوصلے کی تھی اس بار عجب کرب کا احساس ہوا ہے	شمیم روش	۲۵۵
وہ چراغ سا چہرا ہوا کو سونپ آئے آوازوں کی دھند سے ڈرتا رہتا ہوں	قیوم طاہر	۲۵۶

دوہے / گیت

دوہے	جمیل عظیم آبادی	۲۵۸
چھنکے تو گجرے کھیلو ہمار سکھی ری اک اور کی منگ ہے	ناصر شہزاد	۲۵۹
وہاں بٹ ہمارے پردیس	[illegible]	[illegible]

رُباعیات

رباعیات	ساجد امجد	۲۶۳

ہائیکو

ہائیکو	فاطمہ حسن	۲۶۶
ہائیکو	سلمان سعید	۲۶۷
ہائیکو	قیوم طاہر	۲۶۸

غزلیں (۳)

مے تلخِ ضعیفی پی رہا ہوں	صبا اکبر آبادی	۲۷۰
اس زمانے کے علاوہ بھی زمانے ہیں بہت	جگن ناتھ آزاد	۲۷۱
اس کا جوبن تھا غضب رات گئے وابستگانِ دامنِ شب ہو گئے خموش	جوہر سعیدی	۲۷۲
دل کے سیماب رنگ سیپارے سرشکوں کا پانی دُھواں بن گیا ہے	شیر افضل جعفری	۲۷۳
ہو گئی عام محبت کی کہانی کتنی بس یہی زندگی کی ہے پہچان	ضیاء علیگ	۲۷۴
آئینہ ذہن کو ماضی کا دکھا دیتی ہے بے نیازی جو ترے حسن کا انداز رہا	حاصل مُراد آبادی	۲۷۵
ابتدا رہی میں انتہا گُم ہے کاوشِ خود سری نہیں ہے ابھی	وفا براہی	۲۷۶
منجمد شب سے جگا دے مجھ کو رنجِ دُنیا سے آشنا نہ رہا	احمد شریف	۲۷۷
جانے یہ کیسا شور اُٹھا ہے پسِ غبار مشعلِ دردِ حبّ ہے رخشندہ	سُہیل غازی پوری	۲۷۸
اس کارگہِ شوق میں یہ میرا ہنر تھا صیقل کروں لہو سے تو دل آئینہ بنے	رئیس احمر	۲۷۹
ہم چکوروں کو کوئی خواب دکھایا جائے ہم نے اک کرمکِ شب تاب کو مہتاب لکھا	شجاعت علی راہی	۲۸۰

اس دُنیا میں لوگو، ہم نے کیا سوچا کیا دیکھا ہے خود فراموشی کا ہر اک زاویہ اچھا لگا	گفتار خیالی	۲۸۱
بچھڑتے وقت فقط میں نے اتنا سوچا تھا چھین کے لے گیا وہ جیسے خدائی میری	عابدہ کرامت	۲۸۲
فراقِ یار کا موسم گزر نہ جائے کہیں گریز پا تھیں مگر کن ترانیاں کیا کیا	شرافت عباس	۲۸۳
نہ جانے کیوں مری آنکھوں سے اکثر روٹھ جاتا ہے حاصلِ ادراک احساسِ زیاں	پنہاں	۲۸۴

تبصرے

ہم کلام	ڈاکٹر اسلم فرخی	۲۸۶
چہار خواب / آئینے کے اس طرف خواب سفر / واسوخت لمحۂ موجود	ڈاکٹر ساجد امجد	
شاخِ ویرانۂ دل / خوابوں کے جزیرے بنجر ہتھیلیاں / موجِ واپسیں ہم سفر بگولوں کا	خواجہ رضی حیدر	
پریم چند کا تنقیدی مطالعہ	صابر وسیم	
چاند میری زمیں / یہ چراغ ہے تو جلا رہے میری نظمیں میرے گیت / اعجازِ سخن خواب دریچہ / صلیبِ انقلاب	ڈاکٹر ساجد امجد	
قافیہ پیمائی	نظیر صدیقی	
پڑوسن کا کوٹ / بڑی بڑی آنکھیں کتھا نگر / وقت سمندر سورج مکھی / مسکراتا ہوا شخص ۲۴ گھنٹے کا شہر / نہیں تعریف اس خدا کی	سلطان جمیل نسیم	۳۰۶

ناشر: نسیم درانی ــــ طابع: انجمن پریس ــــ مقام اشاعت: بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸
شمارہ: ۵۱ - اگست ستمبر ۱۹۸۷ء

اداریہ

تھوڑی دیر میں یہ بات گھر کے ہر فرد کو معلوم ہوگئی ــ بچوں نے محلّے میں دوسروں کو یہ بات بتائی ،
' ابّو ٹی وی پر مشاعرہ پڑھنے جا رہے ہیں ـــ دعوت نامہ آیا ہے ــ '

پھر وہ ٹی وی کے مشاعروں میں جاتے رہے، اور ایک دن اچانک وہ دُنیا ہی سے چلے گئے، جنگل میں دوست کی تلاش میں گئے تھے، خود کھو گئے، ڈاکوؤں نے اُنھیں قتل کر دیا۔

اُن کے لواحقین پر قیامت گزر گئی، تدفین کے بعد، گھر کے بچّے، پڑوس میں شام ہی سے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے، اُن کے ابّو معروف شاعر تھے، کئی شعری مجموعوں کے مُصنّف تھے، شہر کی ادبی تنظیموں کے فعال رُکن تھے، ٹی وی سے بھی اُن کے نام دعوت نامے آتے رہتے تھے، خبروں میں اُن کے قتل کے بارے میں ضرور بتائیں گے۔

سیاسی اور معاشرتی خبروں اور کھیلوں کی خبروں کے درمیان وہ سنبھل کر بیٹھ گئے، اِس طرح کی خبروں کے لئے ٹی وی والوں کا اتنا ہی ظرف ہے، آخری خبر افریقہ کے کسی مُلک میں کار کے ایک حادثہ کی تھی، ــ پھر کھیلوں کی خبریں تھیں، کوئی کھلاڑی زخمی تھا، کسی کا پٹھا چڑھ گیا تھا، اور اُن کے لئے لاکھوں رُوپے کے انعامات کا اعلان تھا ـــ پھر موسم اور پھر سونے اور روئی کا بھاؤ اور شیئرز کے اُتار چڑھاؤ ـــ

بچّے یکدم اُداس ہو گئے، اُن کے ابّو کے اِنتقال کی خبر نہیں تھی۔ اُنھوں نے سوچا شاید اُن کے ابّو شاعر نہیں تھے، وہ اِس کے اہل نہیں تھے کہ اُن کے اِنتقال کی دس سکنڈ کی خبر دی جا سکے ـ تب ایک بچّے نے دوست سے پوچھا" اگر وہ اتنے ہی غیر اہم شخص تھے تو ٹی وی والے اُنھیں تے کیوں تھے ــ ؟

چلیں حیدر آباد سندھ کے بسمل آغائی مرحوم ٹی وی کے اربابِ اختیار کی نظر میں ایک غیر معروف غیر اہم شا تھے لیکن کیا ۶۵ سال تک ــ اُردو افسانے کو سینکڑوں اعلیٰ درجہ کی کہانیاں دینے والے برّ صغیر کے نامور افسا: ابو الفضل صدّیقی بھی غیر اہم اور چھوٹے ادیب تھے؟

عقیدت

صبا اکبرآبادی

حمد باری تعالیٰ

تیرے ہی در پہ کیا جاتا ہے ہر اک سجدہ
کوئی معبود زمانے میں نہیں تیرے سوا

حمد میں تیری ہی مصروف رہے لوح و قلم
ثبت ہے صفحۂ کونین پہ سکّہ تیرا

تیری قدرت کے کرشمے ہیں بہار اور خزاں
تیرے اجلال کے مظہر ہیں جبال و صحرا

تیری تسبیح میں مشغول طیورانِ جناں
تیری تعریف میں مصروف زبانِ گویا

بزمِ کثرت میں ہے جلوہ تری یکتائی کا
تیری وحدت کے نشانات ہیں ظاہر ہر جا

مہر و انجم ترے دربارِ معلّیٰ کے چراغ
دلِ ہر ذرّہ میں موجود ہے تیری ہی ضیا

فہم و ادراک رسائی میں ہیں تجھ تک معذور
گو رگِ جاں سے بھی نزدیک ہے مسکن تیرا

تیرے عرفان کے مشتاق رسولانِ کرام
تیرے الطاف کے خواہاں ہیں شہنشاہ و گدا

زندگی کے لئے تُو مُفت عطا کرتا ہے
ورنہ ممکن ہی نہیں تھا عوضِ آب و ہوا

یُوں تری ذات پہ چھائے ہیں حجاباتِ صفات
ایک پردا جو اُٹھا دوسرا پایا پردا

ہے ترے لطف سے صحرا پہ نزولِ باراں
ہیں ترے فیض سے گلزار میں امواجِ صبا

حیب کراچی
حمید فاضلی

حمد باری تعالیٰ

اللہ اللہ اُس کا مقدّر — نام ہے تیرا جس کے لب پر
سب ہیں تیرے حُسن کے مظہر — کیا گُل و لالہ کیا مہ و اختر
تیری ضو سے تیری لَو سے — سُورج روشن، چاند مُنوّر
عِشق ہے تیرا، عالم عالم — حُسن ہے تیرا منظر منظر
کیا کیا پیارے نام ہیں تیرے — مالک، داتا، خالق داور
لاکھ ہو کوئی مُنکر لیکن — تُو ہے سَب کی رُوح کے اندر
تیرے دَر پر ناصیہ فرسا — کیسے کیسے پیر پیمبر
یاد ہے تیری، ذکر ہے تیرے — ذہن مُنوّر، قلب مُعطّر
میرا سَب کچھ تیرے دم سے — میں ہوں قطرہ تُو ہے سمندر

میرا وظیفہ، میرا عقیدہ
اللہ اکبر، اللہ اکبر

با اکبرآبادی

نعتؐ

گرچہ ہم سا ہی اِک آدمی تھا وہ لوگو
مگر جہاں کے لیے روشنی تھا وہ لوگو
اُسی کے نقشِ قدم پر چلے چلو بے خوف
کہ رہنمائے رہِ زندگی تھا وہ لوگو
اُسی کے نُور سے ہر اک نبی کو فیض ہُوا
جہاں کا اوّل و آخر نبی تھا وہ لوگو
خدائی قبضۂ قدرت میں اُس کے تھی لیکن
نمونۂ عمل بندگی تھا وہ لوگو
جسے زمانے نے اِک بوریا نشیں دیکھا
جمالِ مسندِ پیغمبری تھا وہ لوگو
بہارِ گلشنِ انسانیت اُسی سے ہے
کمالِ عظمتِ انسان بھی تھا وہ لوگو
بقدرِ ظرف جہاں اور بڑھتا جاتا ہے
عجب خزینۂ حق آگہی تھا وہ لوگو
دلوں کو فتح کیا لُطف و خُلق سے اُس نے
بساطِ جنگ پہ مردِ جری تھا وہ لوگو
صبا سوال کسی کا نہ رد کیا جس نے
لباسِ فقر میں ایسا غنی تھا وہ لوگو

عبدالعزیز خالد

حاط حاطؐ

(زبور میں نام ولیوا از حضورؐ ہے " حاط حاط " خالدؔ !)

اے آفتابِ ہُدا !
اے احمدِؐ مجتبےٰ !
محمدؐ مصطفےٰ
رسولِ رحم و رجا
نبیِ شکر و رضا
پیمبرِ کلمۃ
ترا روئے دلکشا
—— امامِ اہلِ صفا
غلامِ اہلِ خدا
بلالِؓ حق آشنا
نے دیکھتے ہی کہا :
بہ جذب و سوز و تپش
زبانِ اہلِ حبش
کا رُتبہ جس سے بڑھا
" —— اَرَہْ بَرَہْ کَنْکَرَہ
کَرَہ کَرِی مَنْدَرَہ !"
کہ جس کا حسانؓ نے
ترے ثنا خوان نے
کہ جس کا ادنیٰ لقب
ہے شہر یارِ ادب

وہ مردِ نعت و مدیح ——
—— اسی گھڑی فِی البدیہہ
زبانِ اہلِ عرب
میں ترجمہ یوں کیا ——
" وَاِذَا الْمَکَارِمُ فِیْ اٰفَاقِنَا ذُکِرَتْ
کَاَنَّمَا بِکَ فِیْنَا یُضْرَبُ الْمَثَلُ "

—— ڈھلے یہ قولِ عجب
یہ بندشِ بے بدل
یہ شعرِ بے ساختہ
کچھ ایسے اے خوش لقا !
اے آفتابِ ہُدا !
مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ رَبْ ——
بہ قالبِ ریختہ
—— کہ خوبیوں کا موجب
ہمارے ہاں تذکرہ
تو ذکر آئے ترا
بطورِ ضربُ المثل ! ۔

سرشار صدّیقی

نعتؐ

اُنؐ کے در کی گدائی پا کر میں تو بہت مغرور ہوا
جن کے غلاموں میں کوئی سرمدؔ اور کوئی منصورؔ ہوا

حمد، حرم میں بیٹھ کے لکھّی، نعت حضورؐ کے قدموں میں
رُوح وہاں سیراب ہوئی تھی، قلب یہاں معمور ہوا

دُور سے گنبدِ خضرا دیکھ کے، دل اس طور سے دھڑکا تھا
رُوح کے گہرے سنّاٹے میں جیسے شورِ نشور ہوا

میں نے بھی آج اپنے ربّ سے اپنے دل کی باتیں کیں
دامنِ کوہ صَفا تو مجھ کو وادیٔ کوہِ طور ہوا

اس ظاہر عاصی سرشار کی قسمت پر رشک آتا ہے
دولتِ حسنِ شفاعت پائی اور مفلس مشہور ہوا

ماؔنی فاروقی

نعت

پھر بخت سنور جاگا، پھر بادِ صبا لائی پیغام مدینے سے
پھر ہوش مجھے آیا، جینے کو بھی دل چاہا جینے کے قرینے سے

وہ آیۂ رحمت ہیں، رحمت ہیں سراپا وہ، میں طالبِ رحمت ہوں
میری یہ تمنّا ہے، مجھ کو بھی عنایت ہو رحمت کے خزینے سے

انوارِ تقدّس کے ہر سمت نظارے تھے، سرکارؐ جو آئے تھے
وہ کیف کا عالم تھا، جبریل اُتر آئے افلاک کے زینے سے

پھولوں کو ملی خوشبو اور سارا چمن مہکا خوشبوئے گُلِ تر سے
ہر عطر میں بُو اُن کی، عنبر بھی مُعنبر ہے اُنہی کے پسینے سے

بس ایک اشارہ تھا اور ماہ دو پارہ تھا، محبوبِ خدا ہیں وہ
رُک جائے سمندر بھی، زمزم بھی اُبل آئے کہسار کے سینے سے

طوفان کی شدت ہے، دریا میں تلاطم ہے، پر خوف نہیں مجھ کو
وہ میرے نگہباں ہیں، ہر موج گزرتی ہے بچ بچ کے سفینے سے

مانا کہ خزف ہے وہ یا خاک کا ذرّہ ہے، ماؔنی جسے کہتے ہیں
ہر حال میں بہتر ہے، مولاؐ کے کرم سے وہ ہیرے کے نگینے سے

غفار بابر

نعتؐ

مَیں نے اُسؐ ذات پہ لکھنے کی جسارت کی ہے
جسؐ کے دامن پہ فرشتوں نے عبادت کی ہے
جسؐ نے ہم خاک نشینوں کو فلک بوس کیا
جسؐ نے بونوں کو عطا خلعتِ قامت کی ہے
کس کی جرأت میرے آقا کے برابر آئے
میرے آقاؐ نے تو نبیوں کی اِمامت کی ہے
زخم کھا کر بھی جو پھولوں کی ردائیں بخشے
میرے آقاؐ نے تو کانٹوں سے محبّت کی ہے
اللہ اللہ وہ کیا لوگ تھے جن لوگوں نے
چلتے پھرتے میرے آقاؐ کی زیارت کی ہے
اُن پہ سوچوں تو مدینہ نظر آتا ہے مجھے
طے جو لمحات میں برسوں کی مُسافت کی ہے
مَیں کہ اِک ذرّۂ ناچیز ہوں خورشید بکف
مجھ پہ اُسؐ ذاتِ گرامیؐ نے عنایت کی ہے
میرے مولا کی رضا ہے میرے آقاؐ کی رضا
میرے آقاؐ نے تو بابرؔ وہ ریاضت کی ہے
آسمانوں پہ زمینوں پہ حکومت کی ہے
جس نے بابرؔ میرے آقاؐ کی اطاعت کی ہے

افسانے



صادق الخیری

ہم رقص

عقل و دانش اور کتوں کا شہر ——— لندن ۔ مجھے حیرت کدہ معلوم ہوا ۔ لیکن میں ان عالی شان ریلوے اسٹیشنوں، برق رفتار ٹرینوں، پرشکوہ ہوائی مستقروں، بلند و بالا عمارتوں، پرہجوم بازاروں اور حیران کن سپر مارکٹوں کا ذکر نہیں کروں گا جن کی وجہ سے لندن دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے ۔ میں اس کی بے مثال سیرگاہوں، آرٹ گیلریوں، مادام توساڈ کے عجائب گھر، ٹرافلگر اسکوائر، ہائیڈ پارک بڑے بڑے ہوٹلوں، انواع و اقسام کے ریستورانوں اور اوپیرا ہاؤسوں کو بھی یاد نہیں کروں گا جن کا سارے عالم میں شہرہ ہے ۔ برطانیہ کی عظیم صنعتیں اور تجارتیں، فلاحی مملکت کی برکتیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے جلوے ——— یہ سب مجھے پسند بے شک آئے مگر انہوں نے میرے دل میں جگہ نہیں پائی ۔ مجھ پر جن چیزوں نے سحر کیا وہ ویسٹ منسٹر ایبے ہے جہاں اکابر و مشاہیر دفن ہیں ۔ آکسفورڈ، کیمبرج اور لندن کے وہ علمی ادارے ہیں جہاں علم و فراست کے سرچشمے پھوٹتے ہیں ۔ چیلسی کا وہ علاقہ ہے جہاں کبھی علما، شعرا اور اُدبا رہتے تھے ۔ ونڈسر کا وہ محل ہے جس کے ڈیوک نے مسز سمپسن کی خاطر تخت شاہی ٹھکرا دیا ۔ شیکسپیرین تھیٹریکل کمپنی کا وہ ہال ہے جہاں میں نے اس نابغۂ روزگار کا ڈراما A MIDSUMMER NIGHT'S DREAM دیکھا ۔ انڈیا لائبریری کا وہ کتب خانہ ہے جہاں ہزاروں لاکھوں کتابیں، رسالے اخبارات دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں ۔ کیٹس ہاؤس کی وہ عمارت ہے جہاں اس جواں مرگ شاعر کا مکان اس اہتمام کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا جیسے وہ ابھی ابھی اُٹھ کر کہیں چلا گیا ہے ۔ اور کوئی دم میں واپس آکر اپنے ڈرائنگ روم میں رونق افروز ہوگا ۔ یا اپنے خوبصورت لان میں نکل کر اسی درخت کے نیچے بیٹھ جائے گا جہاں اس نے ODE TO A NIGHTINGALE لکھی تھی اور پھر مجھے لندن کے کتوں کا خیال آتا ہے جو حیوانی بھی تھے اور انسانی بھی ۔

حیوانی کتے جیسے ہمارے ہاں ہوتے ہیں، ویسے ہی لندن میں بھی تھے ۔ مگر زیادہ خوبصورت، زیادہ صحت مند اور زیادہ مہذب ۔ ان کی پرورش اور انہیں تمیز سکھانے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے ۔ ان کے لئے عمدہ عمدہ اور صحت بخش غذائیں ایجاد اور فروخت ہوتی رہتی ہیں ۔ ان سے لاڈ پیار بلکہ ان کا احترام کیا جاتا ہے ۔ کم و بیش ہر شخص کا ایک ذاتی کتا ہوتا ہے، دل بستگی کے لئے بھی اور حفاظت کے لئے بھی ۔ انسانی کتوں کا مطلب یہ ہے کہ میں نے انگلستان کے لوگوں کو اس عالم میں دیکھا جس میں حیوانی کتے بھی عام طور پر نہیں ہوتے ۔ انگریز، کتوں کی طرح باغوں اور تفریح گاہوں، گزرگاہوں اور گلیوں بازاروں اور چوراہوں، حد ہے پکاڈلی سرکس کی چکا چوند کر دینے والی روشنی میں محوِ اختلاط نظر آئے ۔ واقعی لندن میں آزادی کا بول بالا ہے وہاں ہر قسم کی آزادی کا چلن ہے وہ سیاسی ہو یا مذہبی، معاشرتی ہو یا شخصی اور

ذہنی ہو یا جنسی !
میرا دل لندن سے بھر گیا۔ تو میں نے اپنے دوست ونگ کمانڈر سے کہا ' اب وطن یاد آرہا ہے۔

ونگ کمانڈر عباس سے میری لڑکپن کی دوستی تھی۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں ہم نے دن رات اکٹھے گزارے تھے۔ پڑھائی اور کھیلوں میں ہمارا مقابلہ رہتا تھا۔ جیت اور ہار میں ہم دونوں کو بڑا لطف آتا تھا۔ ہم مذاقی اور یک دلی کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو عزیز تھے اور جب بڑے ہو کر ہم دونوں کی پیشہ ورانہ راہیں جدا ہوگئیں تو اس وقت بھی ہم میں کوئی غیریت نہیں آئی۔ پھر جب جوانی کا زمانہ رخصت ہوا اور وہ ریٹائر ہونے کے بعد لندن جا کر آباد ہوگئے تو ان کا تقاضہ اور اصرار رہا کہ میں سیر و سیاحت کے لئے لندن آؤں اور ان کے ساتھ قیام کر کے گزرے دنوں کی یاد تازہ کروں۔ آخر پچھلے سال میں نے رخت سفر باندھا اور ایک عرصے بعد ان کی صورت دیکھی۔ صورت بالکل بدلی ہوئی تھی اور اگر ان کے چہرے پر وہی بشاشت نہ ہوتی تو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ وہ ہمیشہ سے ہنس مکھ اور بذلہ سنج تھے۔ کلین شیو ہونے اور ننگے سر رہنے کے علاوہ انہوں نے ہمیشہ انگریزی لباس پہنا مگر اب ان میں بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ چہرے پر داڑھی، سر پر ٹوپی اور پتلون کے ساتھ بش شرٹ یا شیروانی۔ ہاں باتوں میں ہنسی مذاق کے باوجود وہ پہلی جیسی بے باکی اور بے ادبی نہیں رہی تھی۔ موقع موقع سے دینی شغف کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔

ونگ کمانڈر لندن سے باہر ستر اسی میل دور ایک کاؤنٹی میں رہتے تھے۔ یہاں ان کا اپنا مکان تھا اور وہ بیوی کے انتقال کے بعد سے اکیلے رہتے تھے۔ کوئی نوکر نہیں تھا۔ سارے کام خود کرنے پڑتے تھے۔ میری خاطر وہ چپاتی اور دال سالن بھی پکایا کرتے ورنہ انہوں نے توس مکھن اور ڈبوں کے کھانوں کی عادت ڈال لی تھی۔ صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر وہ مجھے ٹیوب میں لندن لے آتے اور دن دن بھر دیر رات گئے تک سیر کراتے۔ اب جو میں نے کہا کہ لندن سے طبیعت اکتا گئی ہے تو انہیں میرا وطن واپسی کا ارادہ شاق گزرا اور انہوں نے کہا ' تم نے شہر دیکھا ہے، ذرا دیہات کی بھی سیر کرو۔ تم ایک زمانے میں طامس ہارڈی کے عاشق تھے۔ اس نے جو WESSEX TALES لکھی ہیں، اب تم اس ماحول سے ملتی جلتی آبادیاں دیکھو — تم حیران رہ جاؤ گے۔ دلی اور کراچی میں رہ کر تم نے جس جنت کا تخیل باندھا ہوگا، لندن کے نواح دیکھ کر وہ اور بھی دل فریب معلوم ہوگی۔

یہ بات میرے دل کو لگی۔ ہارڈی کے شاہ کار، خصوصاً FAR FROM THE MADDING CROWD میرا پسندیدہ ناول ہے۔ بیتھ، شیبا، بولڈین اور گیبرئیل روک کے غیر فانی کرداروں سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اور ہارڈی نے شہری زندگی سے گریز کر کے دیہات کی جو دنیا آباد کی تھی اسے دیکھنے کا موقع میسر آجائے تو میں اُسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً ہامی بھر لی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ونگ کمانڈر شروع شروع میں تو چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہے مگر آہستہ آہستہ وہ مجھ سے اجازت لے کر کئی کئی گھنٹے غائب ہو جاتے اور ایک دن انہوں نے کہا کہ جمعہ، ہفتہ اور اتوار ان تین دن کی مجھے چھٹی چاہیئے۔ میں نے کرید اتو پتہ چلا کہ ان کا مذہبی رجحان بہت بڑھ گیا ہے اور وہ کچھ تبلیغی کام کرتے ہیں۔ ان کا خاص شغف قرآن شریف کے انگریزی نسخے نہایت خوبصورت اور بے حد سستے چھاپ کر انہی دکانوں میں تقسیم کرنا ہے جہاں عیسائیوں کی انجیل فروخت ہوتی ہے۔ انہوں نے میری سہولت اور رہنمائی کے لئے بہت سے گاؤں کے نقشے اور ٹرینوں بسوں کے ٹائم ٹیبل فراہم کر دیئے تھے اور مشورہ دیا تھا کہ میں صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر نکل جایا کروں اور رات ہونے سے پہلے گھر آجایا کروں۔ دوپہر کے کھانے کے لئے انہوں نے تجویز کیا تھا کہ کسی سرائے یا چھوٹی سی ریستوران میں ہلکی پھلکی غذا مثلاً سینڈوچ اور کافی پر اکتفا کروں۔ میرے آرام، تفریح اور کھانے پینے کے لئے انہوں نے ڈھیروں سامان مہیا کر دیا تھا۔ ڈیری والا علی الصباح دروازے پر دودھ

کی بوتل، انڈے، ڈبل روٹی وغیرہ رکھ جاتا تھا۔ بیدار ہوتا تو روزانہ کے اخبار موجود ہوتے۔ خالی اوقات کے لئے ٹی۔ وی، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر تھا۔ غرض ان کی عدم موجودگی میں بھی مجھے کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہوئی۔

مشکل بس یہی تھی کہ سارا کام خود کرنا پڑتا تھا۔ میں بھرے پُرے گھر کا رہنے والا ہوں۔ پاکستان کا رہنے والا ہوں۔ وہاں مجھے اپنا وطن بہت یاد آیا جہاں دنیا جہان کی سہولتیں اور گھریلو نعمتیں میسر ہیں۔ مگر لندن میں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں، کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں، کوئی خدمت کرنے والا نہیں۔ پاکستان میں بیوی بچے، بہن بھائی، عزیز و اقارب، نوکر چاکر سب ہی ہوتے ہیں۔ مگر یہاں گھر کی صفائی، کھانا پکانا کپڑے دھونا، قمیص کے بٹن ٹانکنا، یا کھونٹی بھرنا، حد ہے اپنا غسل خانہ تک خود صاف کرنا — پہلے پہل مجھے بڑا تعجب آیا مگر ونگ کمانڈر کو ہر کام کرتے ہوئے دیکھ کر۔ ان کے منع کرنے کے باوجود میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ ان سے چائے، کافی، آملیٹ اور چھوٹی موٹی چیزیں پکانی بھی سیکھ لیں اور اس طرح جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق، چھوٹے موٹے پیمانے پر میں انگریزوں کے رنگ میں رنگ گیا۔

آج جمعہ تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور ٹیلی وژن بند کر کے دروازہ کھولا۔ ایک نوعمر لڑکی گلے میں خوانچہ لٹکائے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے خوانچے کے سامان کی طرف اشارہ کیا جس میں موزے، رومال، بوڈیس اور گھریلو ضروریات کی چیزیں بھی تھیں اور انکساری سے پوچھا "کیا آپ ان میں سے کچھ چیزیں خریدیں گے؟"

مجھے وہ بھولی بھالی لڑکی بہت اچھی معلوم ہوئی مگر یہ عجیب سا لگا کہ ہمارے ہاں یہ دن لڑکیوں کے کھیلنے کھانے کے ہیں۔ اور انگلستان میں ہوشیار ہوتے ہی ماں باپ انہیں خود کمانے کے لئے باہر نکال دیتے ہیں۔ بہرحال، میں نے کہا "گھر کے مالک تو باہر گئے ہوئے ہیں اور میں یہاں مہمان ہوں۔"

اس نے مجھے ملتجی نگاہوں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی "کیا آپ مجھے کافی پلا سکتے ہیں؟"

مجھے ذرا تکلف ہوا تو اس نے اپنی بات دہرائی۔ "میں تھک گئی ہوں اور یہاں قریب کوئی ریستوران نہیں ہے۔"

میں نے اپنی ہچکچاہٹ کی معذرت کی اور اسے اندر بلا لیا۔ انگریزوں کے قاعدے کے مطابق دروازہ اندر سے مقفل کر کے میں اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اس نے اپنا خوانچہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ "آج مجھے بہت دور چلنا پڑا۔ صبح ناشتہ نہیں کیا تھا۔"

میں نے جواب دیا "آپ باورچی خانے میں جا کر اپنے لئے ناشتہ اور کافی تیار کر لیجئے۔ لیکن میں آپ کی مدد نہیں کروں گا۔ ہمارے ہاں کھانے پکانے کا کام مرد نہیں کیا کرتے۔ یہاں آ کر تھوڑا بہت کرنا پڑتا ہے مگر مجھے پسند نہیں۔"

اُسے یہ سن کر ہنسی آ گئی۔ میں نے مزید کہا "کچن میں ہر طرح کا سامان موجود ہے۔ اپنی پسند کا جس طرح چاہے ناشتہ تیار کر لیجئے۔"

اس نے مجھے شکر گزار نگاہوں سے دیکھا اور میرے اشارے پر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں اس کی آواز آئی۔ "آپ کافی پئیں گے؟"

میں نے جواب دیا "براہِ مہربانی میرے لئے چائے بنا دیجئے۔"

میرے خیال میں اس نے دیر لگائی۔ اس لئے میں اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اس نے اپنی پسند کا ناشتہ تیار کر کے نہایت سلیقے سے میز پر سجا دیا تھا اور وہ میرے لئے چائے لے کر آ رہی تھی۔ میں نے پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی اور شکریہ ادا کر کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہ میز پر

ناشتہ کر چکی تو اس نے برتن اُٹھائے اور دھو دھلا کر قرینے سے رکھ دیئے۔ جب وہ باہر آئی تو اس کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی تھی۔ اس نے اپنے خوانچے کی طرف دیکھا۔ اور اُسے اٹھانے کے لیے جھکی تو میں نے اس سے کہا "ذرا بیٹھ جائیے۔"

وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ پیچھے سرکنے سے اس کا اسکرٹ گھٹنوں کے اوپر ہوگیا۔ اس نے نیچے سرکانے کی کوشش کی مگر وہ گھٹنوں سے نیچے نہ آسکا۔ میری نظر اس کی شفاف ٹانگوں اور گلابی جلد پر گئی۔ دفعتاً مجھے میراجی کا خیال آگیا جو گوری سڈول ٹانگوں کے گھائل تھے۔ اور جن کی وجہ سے ان کی جنس بے راہ روی کی داستانیں مشہور تھیں۔ اتنی مشہور کہ مجھے شاہد احمد دہلوی کا وہ مقالہ یاد آگیا جو انہوں نے میراجی کی ایک یادگاری تقریب میں پڑھا تھا اور جس میں ان کی پتلون کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی ذی ہوش انسان کسی خوبصورت میم کو دیکھتا ہے تو اس کے حسین چہرے کے ساتھ ساتھ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر بھی اس کی نظر ضرور پڑتی ہے۔ بالوں کا بھین، چہرے کی نزاکت اور جسم کی لطافت کی وجہ سے وہ مجھے سترہ اٹھارہ سال کی معلوم ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ اب معصومیت کے دور سے گزرنے کے بعد، زندگی کی سختیاں جھیلنے کے لیے پر تول رہی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "تم روزانہ کتنا کما لیتی ہو؟"

پہلے وہ ذرا سی مسکرائی اور بغیر کسی تصنع کے کہنے لگی۔ "مجھے چلنا بہت پڑتا ہے۔ گھر گھر جاتی ہوں۔ روزانہ چھ سے آٹھ گھنٹے محنت کرتی ہوں اور کبھی دو، کبھی تین اور قسمت اچھی ہوئی تو چار پونڈ مل جاتے ہیں۔"

مختلف ممالک میں کافی عرصہ رہنے کے باوجود میری یہ عادت ابھی تک نہیں گئی کہ میں غیر ملکی کرنسی کا شمار کر کے اسے دل ہی دل میں پاکستانی کرنسی میں تبدیل کر لیتا ہوں۔ اس حساب سے ساٹھ ستر روپے یومیہ کی کمائی تو خاصی بڑی رقم ہوئی۔ لیکن یہ حساب غلط تھا وہاں کے اخراجات بھی تو اسی نسبت سے ہوں گے۔ پھر بھی میں نے کہا "یہ تو خاصی رقم ہے۔"

وہ ایک دم بولی "ایسی بڑی نہیں۔ ایک پونڈ تو مجھے ممی کو دینا پڑتا ہے کیوں کہ میں ان کے گھر میں رہتی ہوں۔ پھر بسوں کا کرایہ ہے اور ایک آدھ دفعہ کافی یا سینڈوچ بھی خریدنا پڑتا ہے۔"

مجھے کچھ دکھ سا ہوا۔ یہ عجیب معاشرہ ہے۔ بچوں کو بڑا ہوتے ہی انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ بچے اپنی کمائی میں سے ماں باپ کو ان کے گھر میں رہنے کے لیے کرایہ ادا کرتے ہیں اور ضرورت کے وقت ان سے چھوٹی موٹی رقم لے لیں تو اسے قرض کی طرح واپس ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کیسا دیس ہے کہ ہر ایک کے لئے کمانا فرض ہے۔ ہر شخص کو اپنے اخراجات خود برداشت کرنے پڑتے ہیں ہماری طرح نہیں کہ کنبے بھر کے لئے سارے خرچ اُٹھاؤ اور پھر اولاد کی شادی بیاہ کے لئے اپنے آپ کو قرض اور مفلسی میں جکڑ کر اپنی حیثیت سے زیادہ اٹھاؤ . . . . میں اپنے خیالات میں گم تھا کہ اس نے کہا "اب میں جاتی ہوں۔ آپ کی عنایت کا شکریہ!"

میرا دل چاہا کہ وہ کچھ دیر اور ٹھہرے مگر کوئی بہانہ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے پوچھا "تم صبح کیسی تھیں کیوں؟"

اس نے کھرے کھرے جواب دیا "میرے والد نے رات شراب زیادہ پی لی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ممی سے لڑنے لگے۔ جب وہ دونوں لڑتے ہیں تو گھر میں بہت بدمزگی ہو جاتی ہے۔ میں چپ چپاتے اپنا خوانچہ لے کر نکل آئی۔ میرے پاس اتنی پینس تھے۔ چالیس کرائے میں خرچ ہو گئے۔"

مجھے خیال آیا کہ یہ قوم A NATION OF SHOPKEEPERS کہلاتی ہے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ بیچتا ہے۔ بڑے لوگ بڑی بڑی تجارتیں کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ دماغی صلاحیتیں فروخت کرتے ہیں۔ چھوٹے لوگ چھوٹی چھوٹی اشیا اور ہاتھ پیر کی محنت بیچتے ہیں اور کچھ پاس نہ ہو تو جسم یا وقت بیچتے ہیں، جیسے بے بی سٹنگ! میں نے اُسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا "تم پھیری کیوں لگاتی ہو، نوکری

کیوں نہیں کرتیں؟"

"ابھی مجھے بیچنے کا تجربہ حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی سیلز گرل کی ملازمت مل سکے گی۔"

میں نے اُسے سرتاپا دیکھا اور اُس سے کہا "میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ میں جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو لندن کے نواح کی ایک سیاحت کرنا چاہتا ہوں۔ تم اگر چاہو تو ان دنوں میں میری رہنمائی اور ہمراہی کرو۔ میں تمہیں ہر روز تین پونڈ دیا کروں گا۔"

اس نے اپنی آنکھیں ایک ادائے دلنوازی کے ساتھ گھمائیں اور میرے ہی صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ "صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک۔ آٹھ گھنٹے ہوئے" اور کچھ حساب کتاب کرتے ہوئے کہنے لگی "لنچ بھی آپ کے ذمے ہوگا۔ مجھے منظور ہے ــ لیکن ہفتے کے روز نہیں، اس روز گھر کے کام ہوتے ہیں۔ ساحل پر بھی جاتی ہوں اور شام کو میرے بوائے فرینڈز آتے ہیں۔ جمعہ اور اتوار ممکن ہے۔"

میں نے اس کی ہفتے کی مصروفیات دلچسپی سے سنیں۔ یہ لوگ غریبی میں بھی تفریح کو اہمیت دیتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا "ٹھیک ہے۔ تم آئندہ جمعہ کو آجانا۔ ناشتہ کر کے چلیں گے ــــ اور تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی "فلورنس ــــ اور آپ کا نام؟"

میں چونک پڑا "میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا۔" اس نے اصرار نہیں کیا۔ اور مسکراتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

لندن کے دیہات دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ گاؤں کا جو تصور ہمارے ذہن میں ہے اس کا یہاں نام و نشان تک نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا گاؤں شہر نما، نہایت صاف ستھرا، نئی روشنی سے آشنا اور تہذیب و تمدن کا مظہر ہے۔ روزمرہ کے لباس اور رہن سہن سے کوئی دہقان نظر نہیں آتا۔ اور گھما گھمی سے دُور نکل جائیں تو ایسے ایسے سرسبز و شاداب قطعات اور پھولوں سے لدے باغات نظر آتے ہیں جو میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اور جن کی تراش خراش اور بناوٹ سجاوٹ میں انتہائی محنت کی گئی ہے۔ ان سے بھی آگے بڑھیئے تو وہ بن اور جنگلات (WOODS AND FORESTS) ملتے ہیں جہاں قدرت اپنی پوری جلوہ سامانی کے ساتھ فردکش ہوتی ہے۔ جہاں آدمی بچہ بن جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ آزادانہ گھومے پھرے، دوڑے بھاگے۔ غرض انگلستان کے ان گاؤں میں میلوں پھیلے ہوئے سبزہ زاروں، دراز قد ہریالے درختوں، اٹھلاتی ہوئی نہروں، پھولوں اور پودوں کی بہتات، پرسکون فضاؤں، خوش نما حسیناؤں اور گلاب رو غنچوں کو دیکھ کر جنت کا ایک نیا تصور جنم لیتا ہے۔

دو تین ہی ہفتوں میں فلورنس بے تکلف ہوگئی۔ وہ ورکنگ وومن کی بجائے خوش نما اور دل لبھانے والا لباس زیب تن کر کے آتی۔ بال بھی نئی نئی وضع کے بناتی اور ہلکا ہلکا میک اپ اس کی موہنی شکل کو اور بھی دلکش بنا دیتا۔ آبادیوں سے دور نکل کر وہ ہرنی کی مانند کلیلیں بھرتی اور میں پیچھے رہ جاتا تو وہ ہاتھ پھیلا کر دوڑی آتی اور مجھے ساتھ لے کر چلنے لگتی تھی۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کرائے کی ہمراہی ہے بلکہ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ وہ میری مخلص دوست ہے۔ وہ میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ اور جو چھوٹے چھوٹے کام مجھے کرنے ہوتے مثلاً بس کے ٹکٹ خریدنا، سیلف سروس کی میز پر کھانے کی ٹرے لانا، ریستورانوں کے بل چکانا، ریلوے اسٹیشنوں سے معلومات فراہم کرنا۔ یہ سب کام وہ کرتی تھی اور جب ہم دونوں تنہا گوشوں میں آرام کرنے بیٹھ جاتے تو وہ مجھ سے طرح طرح کی باتیں کرتی اور چاہتی کہ میں بھی اس سے کچھ پوچھوں کوئی سوال کروں۔ ایک دن اُس نے کہا "آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کا ملک بہت خوبصورت ہے لیکن ہمارے اخبار اور بی بی سی کہتے ہیں کہ وہاں بڑی مصیبت ہے، پریشانی ہے، ہر وقت قتل و غارت ہوتا رہتا ہے۔ انڈیا سے لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔" مجھے اس کی سادگی پر ہنسی آگئی اور میں نے اس کی منتظر آنکھوں میں بھولپن کی جھلک دیکھ کر جواب دیا۔

"تم جب خوب بڑی ہوکر اخبارات کو گہری نظر سے پڑھنے لگوگی، انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کا صحیح حال جان لوگی، سیاست اور تاریخ کا تجزیہ کرنا سیکھ لوگی تو تمہیں معلوم ہوگا کہ انگریز قوم جتنی اچھی ہے، اس کے سیاست داں اور حکمراں اتنے ہی چالاک اور خود غرض ہیں۔ ان کے ہاں ایک شخص ماؤنٹ بیٹن گزرا ہے جس کا انجام اس طرح ہوا کہ یہیں انگلستان میں اس کی لاش کے پرخچے اڑ گئے۔ وہ بڑا مکار اور کینہ پرور تھا۔ اس نے ہندوؤں سے سازباز کرلی اور ریڈکلف کو ایک ناپاک سازش میں شامل کرکے پاکستان کو مجروح کردیا۔ یہ سب جو تم اخباروں میں سنتی ہو وہ سب اسی کے شاخسانے ہیں۔ انگریز نے اگر تقسیم ہند میں خلوص اور دیانت داری برتی ہوتی تو نہ صرف پاکستان بلکہ سارے برصغیر میں امن و امان ہوتا۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے نہیں، خلا میں دیکھ رہی ہے۔ میری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ میں نے ملائمت سے اس کے رخساروں کو تھپ تھپایا۔ اور کہا "یہ سیاست اور تاریخ کا کھیل ہے۔ یہ داؤ پیچ تمہارے ننھے سے دماغ کے لئے بہت بھاری ہیں۔ اچھا اب میں ذرا آرام کروں۔"

میں وہیں فرش زمردیں پر دراز ہوگیا تو وہ میرے سرہانے سرک آئی اور بغیر کسی تامل کے اس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور اپنی باہیں میری گردن کے گرد حمائل کردیں۔ یہ مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ اس کے گداز جسم اور مرمریں بازوؤں کے مس نے مجھے بے حد استراحت پہنچائی اور میں خیالات میں گم ہوگیا۔

یہ ماحول خاص میری پسند کا تھا جس میں میرے دل کی کلی کھلتی ہے۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ، شادابی ہی شادابی۔ بے شمار رنگوں اور وضع وضع کے گلاب اندر گلاب، سامنے ہولے ہولے بہنے والی جھیل، سایہ دار درخت اور پہلو میں ایک ماہ پارہ۔ میں نے اس کی نیلی آنکھوں کو جیسے خواب میں دیکھا۔ اور آہستہ سے کہا: "تم نے عمر خیام کا نام سنا ہے؟"

اس نے ٹھیر ٹھیر کر نام دہرایا اور جواب دیا "نہیں!"

میں اسے تکتا رہا اور کہتا رہا: "وہ ایران کا بہت بڑا شاعر تھا۔ کوئی ہزار سال ہوئے اس نے بڑے فکر انگیز اور پرمعنی اشعار کہے جو کہ رباعیات کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ رباعیات ان تمناؤں، امیدوں اور زندگی سے متعلق شکوک کا پیکر ہیں جو ہر زمانے اور ہر ملک میں عورت اور مرد کے دل میں موجزن ہوتے ہیں۔ خود اسے یقین نہیں تھا کہ موت کے بعد روح فنا ہو جاتی ہے یا مرنے کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے ان اشعار میں حیات و ممات کے اہم سوالات کا، اپنی جانب سے جواب پیش کر دیا ہے۔ عمر خیام کے نجی حالات کسی کو نہیں معلوم۔ بس لوگ اتنا جانتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے میں ایک مہندس اور ماہر فلکیات مشہور تھا۔ لیکن اس کی ذات اور دلی کیفیات کا اندازہ ان رباعیات سے ہو جاتا ہے جن میں وہ اپنے کتب خانے، اپنی محبوبہ، ایک کوزہ گر کی دکان ایک کارواں سرائے اور آخر، آخر ایک مقبرے کا ذکر کرتا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ میری باتیں پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی لیکن میں اپنی رو میں کہتا رہا: "عمر خیام بڑا زبردست شاعر تھا۔ شاید تصوف اور غور و فکر نے اس کے دل و دماغ کو گھیر لیا تھا۔ بڑھاپے میں ایک نوخیز دوشیزہ کی ہمراہی نے اس کے احساسات میں طوفان مچا دیا تھا۔ وہ ایک ہرے بھرے درخت کی گل بہار شاخ کے سایہ تلے حسن کا دامن تھامے، شراب کا پیالہ پی کر، زندگی کے آلام بھلا دینا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا، ماضی دفن ہو چکا ہے، مستقبل کا پتہ کسی کو نہیں معلوم، اگر وہ ہو بھی تو ماضی میں گم ہو جائے گا۔ بس جو کچھ ہے، حال ہے ۔۔ صرف آج، صرف یہی لمحہ! اس لئے آج، اس لمحے، اس آن، مجھے حسن کی چھاؤں میں رہنے دو، قدرت کی گود میں رہنے دو، پیٹ بھرا رہنے دو، لاؤ شراب لاؤ۔"

اس نے یکایک اپنی مخروطی انگلیاں میرے لبوں پر پھیریں اور سرگوشی کے لہجے میں کہا" آپ بہت رومانٹک معلوم ہوتے ہیں۔"
پھر میرے سر کو سہارا دیتے ہوئے بولی" شام ہونے والی ہے، اب چلیے۔"

ایک دن ہم سٹون ہنج (STONE HENGE) گئے۔ اس دُور دراز علاقے میں ہم نے قدرت کی عجوبہ کاری دیکھی کیا سینکڑوں سال پہلے وہاں کے باشندوں نے یا شاید حملہ آوروں نے بڑے بڑے پتھر، پتھر کیا عظیم الجثہ چٹانیں اس طرح ایک دوسرے پر جمائی تھیں کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ اس زمانے میں بوجھ اٹھانے والی مشینیں تو ایجاد نہیں ہوئی تھیں پھر یہ بڑے بڑے پتھر کس طرح اٹھا کر اتنی بلندی پر جمائے گئے؟ سیاح کثیر تعداد میں اس عجوبے کو چاروں طرف سبزہ زاروں میں گھرا ہوا دیکھ کر عش عش کر رہے تھے۔ اور فلورنس آئس کریم کا مزا لیتے ہوئے مجھے بڑے اشتیاق سے اس صناعی کے متعلق بتا رہی تھی۔ میں وقتاً فوقتاً دکانوں اور ریستورانوں سے چاکلیٹ اور آئس کریم لے کر اسے دے دیا کرتا تھا تو وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ اس نے کہا کہ دیکھیے ہم نے کتنے قدیم اور انوکھے نوادرات محفوظ کر رکھے ہیں مگر مجھے ان پتھروں کو دیکھ کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ تم نے مصر کے اہرام نہیں دیکھے۔ وہ تو ہزاروں سال پہلے تعمیر ہوئے تھے اور پاکستان جا کر موہنجو ڈارو کی گہرائیوں میں صدیوں سال پرانے شہر دیکھو۔ تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم اہلِ مغرب اپنے معمولی سے معمولی کمال کو بھی اہمیت دیتے ہو اور تمام دنیا کو دکھا کر اپنی تعریف کراتے ہو اور ہم اپنے بڑے سے بڑے کارنامے کو بھی حقیر سمجھتے ہیں۔ وہ بے معنی سی ہنسی ہنس کر میرے قریب آ گئی اور میرے بازو میں اپنی بانہہ ڈال کر نشیب میں چلنے لگی۔

گھر پہنچتے پہنچتے بادل امنڈ آئے اور ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ عام طور پر وہ راستے میں اتر جاتی تھی۔ مگر آج بہت زیادہ چلنے کی وجہ سے میں تھک گیا تھا۔ اس لئے وہ مجھے گھر تک پہنچانے آ گئی۔ میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا" گرم کافی پی کر چلی جانا۔" اس نے میرا کہا مان لیا اور اندر آ کر اس نے اپنے لئے کافی اور میرے لئے چائے بنائی۔ میں نے چاہا کہ وہ تھوڑی دیر اور میرے ساتھ رہے مگر اس کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے کچھ سوچا اور کہا" اب میں وطن واپس جانے والا ہوں۔ کل اور پرسوں دو دن رہ گئے ہیں۔"

اس یاد دہانی سے وہ ملول ہوئی۔ پھر بولی" مجھے آپ کو بتانا تھا کہ پرسوں میں مصروف ہوں گی۔ لہٰذا کل ہفتے کو آ سکتی ہوں۔"

میں نے اس کے بے ترتیب بالوں اور تھکے ہوئے چہرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور بے ساختہ کہا" کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کل رات کو بھی میرے ساتھ رہو؟"

اس نے اپنی نیلی آنکھیں شرارت سے گھمائیں اور مسکراتے ہوئے کہا" رات کو بھی؟ اس کے لئے پانچ پونڈ فاضل ہوں گے۔"

"اچھا" میں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے جواب دیا" ہم رات کو کہیں باہر کھانا کھائیں گے ـــــ اور آخری رات منائیں گے۔"

وہ بہت خوش ہوئی۔ کافی پی چکنے کے بعد اس نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا" آپ رقص کرتے ہیں؟"

میں اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے قدرے توقف سے جواب دیا" جوانی میں بال روم ڈانسنگ سیکھی تھی۔ آج کل کے ناچوں سے وحشت ہوتی ہے۔"

وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی" آپ ایسے بوڑھے تو نہیں ہیں۔ اچھا، کل کا دن اور کل کی رات میں آپ کے ساتھ گزاروں گی۔"

مجھے انگریزوں کی یہ خوبی پسند ہے کہ دن کو وہ چاہے جیسے کپڑوں میں ہوں لیکن شام کو عام محنت کش بھی ایسا عمدہ لباس پہنتے ہیں اور ڈنر پر ایسی شان و شوکت سے شریک ہوتے ہیں کہ کوئی ان کے پیشے اور حیثیت کو نہیں پہچان سکتا۔ اس کے علاوہ اگر ان کی انگریزی شستہ ہو تو

یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے شرفا میں سے ہیں یا اس درجے سے تعلق رکھتے ہیں جسے ہمارے ہاں نچلا طبقہ کہا جاتا ہے۔

شام ہوتے جب سیر سے ہم واپس آئے اور اس نے منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیا، جو وہ اپنے ساتھ ایک بیگ میں لائی تھی تو وہ مجھے مارگریٹ تھیچر کا نشستی نظر آئی۔ اس کے خوش نما کپڑے، پرکشش سنگھار، شفق رنگ گردن میں سفید موتیوں کی کنٹھی دیکھ کر وہ مجھے ایک بہت ہی معزز مہمان معلوم ہوئی۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تو وہ آپ ہی آپ مجھ سے بغل گیر ہو گئی۔

میں اسے واٹرلو لے گیا۔ اور ایک کافی معقول اور مہنگے ریستوران میں ہم نے کھانا کھایا۔ جب وہ سیر ہو کر کھا چکی تو ہم نے تھیٹر کا رخ کیا جہاں ڈیبورا کار (DEBORAH CARR) کا آخری کھیل تھا۔ ڈیبورا کار میری محبوب اداکارہ ہے اور میں اس وقت سے اس کا مداح ہوں جب زمانہ ہوا میں نے اس کا فلم TEA AND SYMPATHY دیکھا تھا۔ میرے لئے انگلش تھیٹر میں ایسے ڈرامے کی دیکھنا مشکل ہے جس میں خالص مغربی نازک خیالیاں اور لطیف باریک مزاح ہو۔ شاید اس لئے کہ میں انگریز کا مزاج داں نہیں ہوں اور جس ظرافت، لطیفے اور فراق کا وہ لطف اٹھاتے ہیں، مکالمہ ادا ہوتے وقت میں اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میرا مقصد تو صرف ڈیبورا کار کی اداکاری کو اسٹیج پر دیکھنا تھا۔ تمثیل نہیں کیوں کہ یہ ایک ہلکی پھلکی کامیڈی تھی جس سے مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ فلورنس کو خوب لطف آ رہا تھا۔ اور وہ بار بار بے تحاشا ہنستی رہی۔ جب تماشا ختم ہوا تو ہم انڈر گراؤنڈ ٹرین میں بیٹھ کر روشنیوں سے جھلملاتے مکانوں اور اسٹیشنوں پر مرد عورت کے جوڑوں کو ایک دوسرے میں پیوست دیکھتے ہوئے گھر آ گئے۔

کافی کا دور چل چکا تو اس نے اپنے بیگ میں سے کیسٹ نکالا اور ٹیپ ریکارڈر میں لگا کر کھڑی ہو گئی۔ والز کی مدھم مدھم دھن سن کر اس نے میری طرف اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور سرگوشی کے لہجے میں کہا "آیئے رقص کریں!"

عرصہ دراز کے بعد میں نے یہ موسیقی سنی تھی۔ وہ میرا عہد شباب تھا جس کو بیس پچیس سال بیت گئے تھے میں آن کی آن میں دور گزشتہ میں چلا گیا۔ اور وہ اصرار کر رہی تھی۔ "آیئے، آیئے نا!" میں کھڑا ہو گیا اور کہا "میں شاید بھول گیا ہوں۔"

اس نے ادائے دلبرانہ سے گردن ہلائی "ایک دفعہ قدم ملانے آ جائیں تو آدمی کبھی نہیں بھولتا۔ تھوڑی سی کوشش کیجیے۔"

— اور ہم دونوں جانے کب تک ناچتے رہے۔ وہ صرف ٹیپ ختم ہونے پر اسے بدلنے کے لئے رکتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ساری رات رقص کرتے ہوئے گزار دے گی۔ وہ رقص کر رہی تھی اور میں اپنے خیالات میں محو تھا۔ مجھے اس وقت ن۔م۔ راشد کی نظمیں "رقص" اور "انتقام" یاد آ رہی تھیں۔ "اے مری ہم رقص، مجھ کو تھام لے!" راشد اپنی انگریز محبوبہ کو آغوش میں لئے، اس کی قوم کو کوس رہا تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی تذلیل کا اس کے جسم سے، اس کے قرب سے، اس کے لبوں سے بدلہ لے رہا تھا۔ لیکن میرے دل میں ایسا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ مجھے انگریز حکمرانوں اور سیاست دانوں سے شدید نفرت تھی۔ انہوں نے میری قوم کو بے حرمت کیا، میرے وطن سے غداری کی، میری نسل کو لاچار کیا مگر یہ لڑکی، یہ ماہ جبیں، یہ فلورنس، ماؤنٹ بیٹن نہیں تھی، ریڈکلف نہیں تھی۔ اسے داغدار کرنے کا سودا میرے دل میں نہیں سمایا۔ میں اس سے کوئی انتقام نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ میری باہنوں میں ایک پھول کی مانند تھی — نرم و نازک، خوش نما، خوش رنگ، آرام دہ۔ اس نے اپنے لب کئی بار میرے لبوں کو پیش کئے مگر جواب نہ پا کر وہ کچھ مایوس سی ہوئی۔ اور آخر، رقص کے دائروں میں وہ اپنا رخسار میرے رخسار سے ملا کر جھومنے لگی۔ پھر جب رات زیادہ ڈھل گئی اور ٹیپ ختم ہوا تو میں نے آہستگی سے اس کی آغوش کھول دی۔ اور ملائمت سے کہا "اب سوئیں۔"

جب وہ شب خوابی کے لباس میں میرے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو میں اسے دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ باریک نائیٹی میں اس کا گلابی جسم اس طرح جھلک رہا تھا کہ زہد شکن کی ترکیب ایک دم میرے ذہن میں آ گئی۔

میں نے اسے بتا دیا تھا کہ برابر کا بیڈ روم اس کا ہے مگر وہ یوں بے حجابانہ میرے کمرے میں چلی آئی تو مجھے بہت اچھا لگا۔ مگر فوراً سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کیا کہوں۔ وہ میرے بستر پر آ کر نیم دراز ہو گئی۔ اور میرا سر اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس کے قرب کے احساس سے مجھ پر بے خودی سی چھا گئی۔ اور مجھا میرے دل نے کہا، زندگی کا مقصد یہی ہے بلکہ زندگی یہی ہے، صرف یہی آج۔ صرف یہی لمحہ۔ اس سے پیشتر جو بھی روح فرسا لمحات گزرے ہیں، جن پریشان کن مراحل سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جو بھی غم اور اُداسیاں نصیب ہوئی ہیں وہ بے معنی ہیں۔ اور آئندہ بھی جو کچھ بیتے گی، جن مصائب کو بھی جھیلنا ہوگا، جو جسمانی اور ذہنی آفات تقدیر میں لکھی ہیں ان کی اس لمحے کوئی وقعت نہیں۔ میرے دل نے کہا، اصلیت، حقیقت اور وجود بس اس لمحے کا ہے جو شیریں ہے، روح پرور ہے اور میری دسترس میں ہے۔ میں اس لمحے کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں۔ حسن اور جوانی جو اس پیکر میں اتر آئی ہے اس میں سما جاؤں، گم ہو جاؤں۔ سرمستی اور عشرت کا یہ لمحہ ہی کل کائنات ہے، حیات ہے، جاوداں ہے۔ باقی سب پرچھائیں ہے، موہوم ہے، گریزاں ہے۔ . . . . لیکن دوسرے ہی لمحہ میری عقل میرے دل پر غالب آ گئی اور پیشتر اس سے کہ میرے جذبات میں ہلچل مچ جاتی، میرے دل میں طوفان اٹھ آتا، میرا وجود ہوش کھو بیٹھتا، مجھے اپنی آواز سنائی دی جو خود مجھے اجنبی سی معلوم ہوئی "میرا مطلب یہ نہیں تھا میں تمہاری معیت سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا۔ جاؤ۔ جا کر سو جاؤ۔ صبح باتیں کریں گے۔"

وہ بڑی متعجب ہوئی۔ مجھے بھی تعجب ہوا کہ یہ قوم اپنے وقت کی قیمت وصول کرتی ہے مگر اس قیمت کا بدل بھی فراہم کر چکاتی ہے۔ وہ اپنی اُجرت کا پورا عوض ادا کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ بولی "میں یہیں سوؤں گی۔"

میں آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسے کمبل اوڑھاتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا "ہاں تم یہیں سوؤ۔ میں تمہارے سامنے اسی کمرے میں صوفے پر سو جاؤں گا۔"

میں صبح ذرا دیر میں بیدار ہوا تو وہ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر چکی تھی اور ناشتہ کی میز پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں جلدی جلدی تیار ہو گیا اور ہم ناشتہ کر چکے تو اس نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ میں نے اسے لفافے میں رکھ کر دس پونڈ دے دیئے۔ اس نے شکریہ ادا کر کے لفافہ بیگ میں رکھ لیا۔ اور چلتے چلتے قدرے تکلف سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے بے ساختہ لپٹا لیا۔ تو اُس نے انداز محبوبانہ سے ٹھوڑی اونچی کر کے کہا "کیا آپ مجھے الوداعی بوسہ کریں گے؟"

میں نے چاہا کہ کم از کم اس بار، صرف ایک دفعہ اس کے لبوں کو چوم لوں ـــــ کہ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ مکان دھوئیں کی طرح اُڑ گیا ہے۔ دیواریں آپ ہی آپ تحلیل ہو گئی ہیں اور ہم کھلے میدان میں کھڑے ہیں جس کے چاروں طرف لوگ ہی لوگ جمع ہیں۔ ان میں اپنے بھی ہیں اور غیر بھی۔ دوست احباب بھی ہیں اور رشتے دار بھی، ونگ کمانڈر بھی ہیں اور انگریز بھی۔ اور وہ سارا مجمع کھڑا قہقہے لگا رہا ہے۔ میں جھکتے جھکتے رہ گیا۔ اور میں نے اس کے احمریں لبوں پر محبت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "نہیں، مگر تم بہت اچھی ہو۔ میں پرسوں کی فلائٹ سے وطن واپس چلا جاؤں گا۔ اور شاید پھر کبھی لندن نہ آؤں۔ مگر تم مجھے یاد آیا کرو گی۔"

میرا خیال تھا وہ آبدیدہ ہو جائے گی مگر وہ صرف مسکرائی اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی "سر، بوڑھے آدمی تو بڑے ادبا شر ہوتے ہیں!" ـــــ اور خدا حافظ کہہ کر جلد ہی سے باہر نکل گئی۔



شرون کمار ورما

کلنڈر اور قحط

سلیقے کی لاٹ جیسی وہ عورت اپنی بھیگی دھوتی سنبھالتی کلنڈر سے نکل کر کمرے کے فرش پر آگئی تھی۔ وہ کسی زخمی، شکست خوردہ جانور کی طرح کمزور سا پڑا اُسے دیکھ رہا تھا جیسے آخری حملہ کا انتظار کر رہا ہو وہ اس کی چارپائی کے گرد چکر لگا کر اس پر جھکی، مسکرائی، اسے نرمی سے چھوا اور کمرے کی فضا میں گھل گئی۔ بس یہیں گھپلا ہو جاتا تھا۔ وہ حملہ کا منتظر ہوتا۔ بدن کی پور پور سے نس نس تنی ہوتی اور وہ مسکرا کر فضا میں تحلیل ہو جاتی اور بھیگی دھوتی کی نمی اور عجیب سی مہک اس کے گرد تیرتی رہتی۔

"پتہ نہیں یہ عورت نیکنوں کی طرح نمکین ہے کہ گلوکوز کی طرح میٹھی، کراری ہے کہ بھیگی دھوتی کی طرح گیلی سیلی!"

یہ جملہ اس کی ڈائری میں درج تھا۔ اور اس کے بعد ڈائری کے پتے خالی تھے اور پلاسٹک کور کی تہہ میں ڈاکٹر کا نسخہ قید تھا۔

کانچ کی صراحی میں باسی پانی اُبلنے لگا تھا۔ اس کا رنگ بہتے خون کی طرح سیاہی مائل سرخ ہو رہا تھا۔ یہ خون اس کی ناک سے بہا تھا۔ گروپ "A" کا خون اور نرس نے ہنس کر کہا تھا کہ اس کا بلڈ گروپ بھی "A" ہے اور نایاب بھی اور وہ چاروں لڑکیاں جو سر سے پیر تک سفید ہو رہی تھیں، سر جوڑ کر سرگوشی کرنے لگیں اور اس نے دیکھا کہ ان کی سفید یونیفارم سیاہی مائل سرخ ہوتی جا رہی ہیں اور وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ وہ کھکھلا کر ہنسیں۔

پانی کھولتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے صراحی بھک سے اُڑ گئی اور کمرے کی سفید دیواروں پر خون کے چھینٹے آدمی، بونی، ٹیڑھی میڑھی عورتوں کی شکل میں بکھر گئے اور کانچ کی باریک کرچیں اس کی رگ رگ میں اُتر گئیں۔ بھیگی دھوتی ساون کی گھٹا کی طرح لہرانے لگی۔

وہ عورت بے باکی سے مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے کب سے اس پر جھکی مسکرائے جا رہی تھی۔ مسکراہٹ کے جگنو اس کے اردگرد اُڑ رہے تھے۔ کئی مرتبہ تو وہ عورت کلنڈر سے سیدھی اس پر آگری تھی۔ وہ چیخ کر رہ جاتا۔ تب اس کے کمرے کو مکان سے علیحدہ کرنے والا، کچی لکڑی پتلے تختوں والا دروازہ چرمرا کر کھلتا اور پتلے سوکھے جسم پر رکھا پیلا، بیمار سا چہرہ کمرے میں جھانکتا اور کانچ کی چوڑیاں بج اٹھتیں۔ چوڑیوں کی مدھر کھنک کھنک کے پیچھے پیچھے بلغمی کھانسی چلی آتی اور اس کا جی متلانے لگتا۔ دوائیوں کی بُو اس کے ذہن میں کڑواہٹ بھر دیتی۔

دروازہ سنگڑا کر بند ہو جاتا۔ چوڑیوں کی کھنک اور سوکھے چہرے کی زردی رہ جاتی۔

بھیگی دھوتی بار بار اس کے چہرے کو چھو رہی تھی اور اس کے اندر کی وہ سُلفے کی لاٹ غائب تھی۔ کلنڈر پر بھی نہیں تھی۔ وہاں تو

بسکٹ رہ گئے تھے لیکن ایس بیسٹاس شیٹ کی چھت والا وہ تپتا ہوا کمرہ اس کے وجود سے بھرا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ سر کے بوجھ تلے کسمسا رہے تھے۔

"یہ ہاتھ تمہارے دشمن ہیں۔ ایک دن تمہارا ہی گلا گھونٹ دیں گے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب، بھیگی دھوتی پہنے نیم عریاں عورت کا بسکٹوں کے کرارے پن اور ذائقے سے کیا تعلق ہے ؟"

اور سفید یونیفارم سر سے پاؤں تک گلابی ہو گئی تھی اور پھر ایک نقرئی قہقہہ دور تک خاموش برآمدے کے چکنے فرش پر پھسلتا چلا گیا۔

ٹرنیکولائزرز اس کی رگوں میں پہنچ کر بے اثر ہو رہے تھے۔ ہاتھ جب دشمنی پر اُترتے تو آگا پیچھا کچھ نہیں دیکھتے تھے۔ اس کا بُرا حال کر ڈالتے۔ بہت عرصہ پہلے گاؤں میں، پڑوسن چاٹی میں زور زور سے مدھانی چلا کر مکھن نکالا کرتی تھی۔ وہ دیکھ دیکھ کر حیران تھا لیکن وہ ان کم بخت ہاتھوں کا کیا کرتا۔ اپنے تھے ـــــ دشمن ـــــ کمرے کے کرائے، ڈھابے کی پیشگی اور چار پائی کے خرچ کے بعد خالی رہ جاتے۔ ان کا خالی ہونا ہی مصیبت ہو گیا تھا۔

کچی لکڑی کے پتلے تختے کے سوراخ میں اس کی نگاہ اٹک کر رہ گئی تھی۔ اور دل پسلیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ یہ سوراخ اس نے نہیں کیا تھا۔ کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ گانٹھ کا گول ٹکڑا کثرت استعمال سے جیسے ڈھیلا ہو کر ایک دن خود بخود فرش پر آ گرا تھا۔ اور اس نے وہ کالا چٹا اٹھنی جیسا ٹکڑا جیب میں محفوظ کر لیا تھا کہ اُسے انگلیوں میں گھمانا اچھا لگتا تھا۔

اور اب اس کی نگاہ سوراخ میں اٹکی ہوئی تھی۔ نکل ہی نہیں رہی تھی۔ پرلی طرف وہ دُبلا، کمزور جسم تھا جو چاول اور مچھلی کے باوجود سوکھا اور نحیف تھا۔ پیلی دھوپ، پیلا جسم ـــــ اُسے یاد آیا لوہے کی چابی کا سوراخ ہونٹوں سے لگا کر سیٹی بجایا کرتا تھا ـــــ یہ بچپن کی بات ہے۔ اب سیٹی بجانا بد اخلاقی ہو گا ـــــ پتلی پتلی ٹانگیں، آنگن میں دھوپ کو کچل رہی تھیں۔ وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ نہ تو نگاہ ہی سوراخ سے نکل رہی تھی اور نہ وہ دروازہ کھول کر اس جنگ کو روک سکتا تھا۔ اُسے بلغمی کھانسی سے دہشت ہوتی تھی اور دوا کی چھوٹی بڑی شیشیوں سے خوف آتا تھا۔

وہی کھوں کھوں، ایک گالی اور خالی آنگن میں پسری دھوپ رہ گئی تھی۔ رسی پر ہری دھوتی جھول رہی تھی۔ اندر کی منڈیر پر کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ غسل خانے کا نل پورے زور سے خالی ٹب میں پانی پھینک رہا تھا۔ وہ پیلا، پتلا جسم اِدھر اُدھر ہو گیا تھا اور اٹھنی جتنا دھوپ کا جلتا ہوا ٹکڑا اُس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا دماغ میں جا گھسا تھا۔ اور وہاں سب کچھ تہس نہس کر کے، نیچے پیٹ میں اُتر گیا تھا اور وہاں سب کچھ راکھ کرنے پر تلا تھا۔

اُس کی نگاہ تو سوراخ سے نکل آئی تھی لیکن اب زخمی تھی۔ اور دھوپ اپنی تمام تر حدت اور شدت کے ساتھ اس کے اندر سما گئی تھی وہ بار بار ایڑیاں چارپائی کی پٹی پر مار رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سر کے نیچے دبے تھے اور آزاد ہونے کے لئے بے قرار تھے۔ اور وہ اپنا تمام بوجھ ان پر ڈالے تھا۔

تبھی وہ کچی لکڑی کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔

اُس کے ہاتھ شل ہو گئے۔ پیٹ میں آگ کا گولا ٹھنڈا ہو گیا۔ اور نگاہوں میں سوکھا ماری دھرتی بھر گئی۔

"تم نے آج پانی نہیں لیا۔ اتنی گرمی میں بھی تم کو پیاس نہیں لگتی ؟"

کلنڈر والی عورت بسکٹ چبا رہی تھی۔

نرسں شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

"صراحی بھر دوں ۔۔۔ ؟"

"صراحی ۔۔۔! وہ تو ٹوٹ چکی ہے۔"

پیلی سوکھی عورت نے کلنڈر کو دیکھا۔ صراحی کو دیکھا۔ وہ تو ثابت و سالم تھی۔ اُسے کلنڈر والی صحت مند، گلابی بدن، مسکراتی آنکھوں والی عورت سے جلن ہونے لگی۔

"صراحی تو خالی ہے۔"

"لگتا ہے۔"

وہ چھپکلی، جو ایک کپڑے کے لالچ میں رنگتی ہوئی چھت کی شیشٹ پر آ گئی تھی، دھپ سے فرش پر آ گری۔ عورت اچھل کر دروازہ پار کر گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن وہ سوراخ وہیں تھا، اور اب ان میں سے کریہہ صورت، پیلے پیٹ والی چھپکلیاں اس کی طرف رینگ رہی تھیں۔ وہ گھبرا کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک چیل گرمیوں کے اُجاڑ آسمان میں اکیلی چھپا رہی تھی اور دھوپ ہر طرف سے یلغار کر رہی تھی۔ وہ لپک کر ایک بس میں سوار ہو گیا۔ بس میں مسافر خالی صراحیوں کی طرح سیٹوں پر رکھے تھے۔ وہ راڈ سے لٹک گیا۔ اس کے آگے ٹیلکم پاؤڈر کا ایک خوبصورت، پھولوں والا، لمبا تپلا ڈبہ مہک رہا تھا۔ پسینے کی تیزابی بو میں گھلتی ہوئی مہک ۔۔۔ زور دار جھٹکا ۔۔۔ اور وہ پاؤڈر کے ڈبے پر جا گرا اور پسینے میں نہا گیا۔

"بچ گیا ۔۔۔ سالے سڑک کو باپ کا گھر سمجھتے ہیں۔"

راڈ دوبارہ تھام کر اس نے معذرت خواہ نظروں سے اس مہکتی ہوئی سواری کی طرف دیکھا ۔۔۔ وہ جانتی تھی غلطی کسی کی نہیں تھی۔ اس بھیڑ بھڑکے والے شہر میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ وہ مسکرا دی۔

صراحیاں ایک دم بولنے لگی تھیں۔ پلاسٹک پھول جو خوشبو اور مہک سے عاری تھے باتیں کر رہے تھے۔ جھوٹ اور سچ کی پہچان پر بہت پرانی اور گھسی پٹی باتیں ۔۔۔ "بھائی چھیلا پٹیالے والے" کے ریکارڈ کی طرح ۔۔۔ جن سے اُسے سخت چڑ تھی کہ یہ باتیں کسی نتیجے پر نہیں پہنچاتی تھیں ۔۔۔ وہ اپنی پیٹھ پر پاؤڈر کے ڈبے کا ہلکا، نرم و نازک دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ اور دھوپ کا ٹکڑا اس کی ناف میں جلنے لگا تھا۔

"کچھ دنوں تک سمندر صاف ہو جائے گا، پھر چلیں گے۔" کوئی کہہ رہا تھا۔

اگر اسے سمندر تک جانے کی توفیق ہو تو وہ دھوپ کا ٹکڑا اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈبو دے یا خود ڈوب جائے۔

"کرائے بہت بڑھ گئے ہیں۔"

"ایم۔ پیز۔ اور وزراء کے اخراجات بھی تو بہت بڑھ گئے ہیں۔"

"ہمارا بجٹ لوگوں کو نہیں، وزراء کو نظر میں رکھ کر بنایا جاتا ہے۔"

وہ اس موڑ پر اُتر گیا جہاں سے سڑک اسپتال کی طرف جاتی تھی۔ چلتے چلتے اس نے سوچا، اس وقت تو ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہوگا نہیں۔ خالی چکنے برآمدے ہوں گے اور زرد چہرے اور سفید وردیاں جو دیکھتے دیکھتے سیاہی مائل سُرخ ہو جاتی ہیں، جسم سے نکلے خون کی طرح۔ سفید وردیوں میں بند پرندے اڑ نہیں سکیں گے۔

فٹ پاتھ پر پارک ریلنگ سے کلنڈر لٹکے ہوئے تھے۔ کلنڈر ہی کلنڈر اور ان پر عورتیں براجمان تھیں، لیٹی تھیں، بیٹھی تھیں، اونگھ رہی تھیں، جاگ رہی تھیں، بھگا رہی تھیں ۔۔۔ دیویاں، ایکٹرسیں، محض عورتیں۔ وہ گھبرا کر پارک میں داخل ہو گیا۔

باٹ ٹون کے کلنڈر سے، بھدے رنگوں والی ایک عورت جامن کے سائے میں بکھری پڑی تھی۔ وہ ٹھہر گیا۔ جیسے کسی نے زنجیر کھینچ لی ہو۔ اس کے پیروں تلے ننگی زمین تھی۔ مسلسل استعمال نے گھاس کو جڑ سے ختم کر دیا تھا۔ وہ چھوٹی سی پگڈنڈی اس عورت تک چلی گئی تھی۔ شاید آگے بھی جاتی ہو۔ اس سے پرے وہ دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ کچی لکڑی کے تختے کا وہ سوراخ، اس کے اور عورت کے بیچ آ گیا تھا۔ اور وہ اُسے اس سوراخ میں سے دیکھ رہا تھا۔

ایک جامن اُسے آ کر لگا۔ اس نے دیکھا وہ نیلی سی پگڈنڈی ننگی پنڈلی تک چلی گئی تھی۔ دوسری ٹانگ گھٹنے تک ننگی ہو رہی تھی۔ ہونٹوں پر جامن کا گہرا رنگ۔ عورت سوراخ میں سے مسکرائی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بس کی ٹکٹ کے ساتھ گانٹھ کا وہ اکٹھی جتنا ٹکڑا نکل آیا۔ اُسے پسینہ آ گیا۔ وہ عورت لہرا کے اٹھی جیسے ساحل کی ہر پیسنجر پر سے گزر جانے کا ارادہ رکھتی ہو — وہ پریشان ہو گیا۔ اُسے اپنے چاروں طرف کلنڈر اڑتے ہوئے محسوس ہوئے اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر گر پڑا۔ کلنڈر سے وہ سلفے کی لاٹ نکلی لیکن تب تک دھوپ کا وہ ٹکڑا، جو اس کی ناف کے عین نیچے پیٹ میں جل رہا تھا، فرش پر جگہ اپڑا تھا اور اس کے ہاتھ بے جان سے لٹک رہے تھے۔



سُلطانہ جمیل نسیم

روزن

زندگی خواب نہیں ہے مگر خوابوں میں زندگی ہوتی ہے۔ نجمہ کی زندگی میں بھی خوابوں سے بھی راتوں نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے آپ کو سمجھاتی — نجمہ بیگم۔ اتنے خواب دیکھو گی تو حقیقت سے آنکھیں نہ ملا سکو گی۔ مگر مجبوری تھی۔ نیند قابو میں تھی نہ خواب اختیار میں۔ وہ بچپن ہی سے گہری نیند سوتی تھی اور خواب دیکھتی تھی۔ بچپن میں معصوم خواب جن میں وہ رنگ برنگے پھولوں اور تتلیوں کی تلاش میں دوڑتی پھرتی تھی۔ پھر کسی کانٹے کی چبھن یا کسی سنگریزے سے ٹھوکر اس کے خواب بکھیر دیتی۔ تب وہ آنکھیں کھول کر وحشی ہرنی کی طرح ماحول کا جائزہ لیتی اور پھر اپنے بستر میں دبک کر پھولوں اور تتلیوں کے تعاقب میں چوکڑیاں بھرنے لگتی۔

عمر کے ساتھ خوابوں کا ماحول بھی بدلتا چلا گیا تو اس نے ململ کے دوپٹے کی طرح خواب اوڑھ کر راتوں کا سینہ ڈھک لیا۔

اس رات بھی وہ ایک ایسا ہی خواب دیکھ رہی تھی جو فرصت کے جاگتے لمحوں میں اگر خیال بن جائے تو سارے بدن پر لمس کی صورت یوں رینگنے لگے کہ بیٹھے بیٹھے جھرجھری آجائے۔ نیند کی پھواروں میں خواب کا سائبان اس کے وجود کو اپنے پھیلاؤ میں سمیٹے ہوئے تھا کہ یکایک وہ سرگوشیوں کی موسلادھار بارش میں بھیگنے لگی۔ . . . . نیند سہم گئی۔ خواب سمٹ گئے۔ اس نے آنکھوں کے دریچے کھولے تو سارے گھر کو ایک بھونچال کی لپیٹ میں پایا۔

بڑی آپا کے لاکھ چھپانے پر بھی اُسے تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ محلے کے ایک لڑکے سے ان کا آنکھ مچولی کا کھیل جاری ہے۔ چھوٹے چھوٹے کنکروں کے ساتھ باندھ کر ایک دوسرے کی طرف خط اچھالے جاتے ہیں۔ گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر ہو یا کڑکڑاتے جاڑوں کی اندھیری راتیں سب کی آنکھ بچا کر چھت کے پھیرے بے سبب تو نہیں ہوتے۔ تو کسی نہ کسی طریقے سے ملاقات طے ہو گئی ہو گی۔ آپا رات کے پچھلے پہر دروازہ کھول کر گلی کے ملگجے اندھیرے میں انتظار کرتے ہوئے اس لڑکے سے ملنے چلی گئیں۔ جس طرح اتفاق کی کوکھ سے واقعات جنم لیتے ہیں، اسی طرح آج ہوا۔ ابا پیشاب کو اُٹھے تو ان کو احساس ہوا جیسے دروازہ کھلا ہے مگر انہوں نے اپنا واہمہ جانا — پھر واپسی پر — پلنگ پر لیٹتے لیٹتے وہ اُٹھے اور سیدھے دروازے کی طرف چل دیئے۔ کنڈی کھلی تھی۔ انہوں نے دروازہ [illegible] کر باہر جھانکا تو میونسپلٹی کی ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کی روشنی میں دو سائے نظر آئے۔ ابا کھنکارے۔ ایک سایہ تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کے سرپٹ بھاگا اور دوسرا، لمحہ بھر ساکت رہنے کے بعد لرزتے قدموں چلتا ہوا آگے بڑھا اور کھلے دروازے میں کھڑے ہوئے ابا کے پیروں پر گر پڑا۔ ابا پہلے تو گنگ ہو کر رہ گئے۔ پھر ایسے لڑکھڑائے جیسے پیروں تلے سے زمین سرک گئی ہو۔ سنبھلے تو وجود میں زلزلہ سا آگیا۔ پھر سارے گھر میں گھٹی گھٹی آوازوں کی آندھیاں اٹھنے لگیں۔ آپا نے ایسا

اُٹھایا کہ نیند نجمہ کی آنکھوں کے پٹ کھلتے ہی ہوا ہو گئی
بات گھر سے نکل گئی تو ساتوں گھر ہی میں بیٹھی رہ جائیں گی۔ یہ خیال اتنا حاوی ہوا کہ لڑکیوں کی صورتیں دُھندلا گئیں اور سات کا ہندسہ اُبل کر اور اُبھر کر ماں باپ کی پتلیوں پر پھیل گیا۔

اس رات کے بعد تو سب رات آنکھوں میں کٹنے لگی۔ نجمہ کو پھر جی بھر کے سونا نصیب نہیں ہوا۔ اس کی گہری نیند ہلکی سی آہٹ پر اُچٹ جاتی اور پھانس کی طرح آنکھوں میں کھٹکتی رہتی۔

دن کا حال اور ابتر ہو گیا۔ جب یہ احساس ہو جائے کہ ہر لمحہ کوئی دیکھ رہا ہے تو انسان بہت ہی محتاط ہو جاتا ہے۔ نگرانی تو ہر لڑکی کی ہو رہی تھی مگر نجمہ کا حال بُرا تھا۔ جب چلتی تو ماں باپ کی نظروں کی زنجیریں پیروں میں پڑی محسوس ہوتی۔ اور بہنوں کا تو پتہ نہیں مگر وہ خود کو مسلسل نظربند سمجھتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کو یہ احساس ہونے لگا کہ آپا سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا ہے بلکہ اصل مجرم وہ ہے اور اس سے پہلے کہ وہ احساس کی دلدل میں دھنس جاتی یوں ہوا کہ ابا کے ایک کاروباری شراکت دار کے ساتھ آپا کا رشتہ طے ہو گیا۔

زندگی میں وہ رات نہ آئی ہوتی تو آپا کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا کہ ابا سے ذرا چھوٹی عمر کا شخص ان کا شوہر کہلائے۔ آپا کی شادی کے بعد تو ابا نے یہ وطیرہ بنا لیا کہ جو رشتہ آیا قبول کر لیا۔ پھر گھر کے سُونے آنگن میں اور بھائیں بھائیں کرتے اپنے خوابوں کے ویرانے میں وہ بھی بہت دن چھپی نہ رہ سکی۔ اور اس کا گھر بھی بسا دیا گیا۔

نجمہ کی جب شادی ہوئی تو اس کی عمر سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ عمر پختہ نہیں تھی اور نیند بھی کچی ہو گئی تھی۔ جاگتی آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں نے بکھر کر گلابی ڈوروں کا ایسا جال بچھا دیا تھا کہ جس کی طرف نظر اٹھ جاتی وہ اسیر ہو کے رہ جاتا۔ اپنی ان ہی نیم وا آنکھوں کے ساتھ جب وہ عروسی پلنگ پر بٹھائی گئی تو امجد کا اوڑھنا بچھونا ہو کے رہ گئی۔

نجمہ کچھ تو کم گو تھی ہی، رہا سہا بات کرنا امجد نے ختم کرا دیا۔ وہ کہتا، تمہاری تو آنکھیں بولتی ہیں۔ پھر یہ ہونٹ، یہ باتیں کرنے کے لئے نہیں ہیں۔ امجد بھی زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ اس کی تو نظریں ہی نجمہ کے بدن کو ایسے چھو کے دیتی تھیں کہ رواں رواں جاگ اٹھتا اور بدن کی اس گنگناتی بیداری میں امجد بھی آواز سے آواز ملا دیتا۔

شادی پر آئے ہوئے امجد کے عزیز و اقارب جب اپنے اپنے گھر سدھار گئے تو نجمہ کو اکیلے رہ جانے کا احساس ہوا مگر یہ احساس دیرپا نہیں تھا۔ دو چار ہی دن میں اسے سب کچھ اپنے زیرنگیں معلوم ہونے لگا۔ اُسے خیال آیا کہ ایسی ہی خودمختار زندگی تو اس کے خوابوں میں چھپی ہوئی تھی حاکمیت کے اس جذبے کو امجد کے رویے نے بھی اُبھارا کہ گھر کی ہر چیز کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس کی مرضی کا تابع تھا۔ مگر یہ حکمرانی دن بھر چلتی تھی۔ رات محکوم بنا کے چھوڑ دیتی تھی۔

شادی کے گیارہویں مہینے ایک بیٹی کی ماں بنی۔ دوسری بھی بیٹی ہوئی۔ پھر تیسری۔ چوتھی بچی کی پیدائش پر وہ فکرمند ہوئی کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ بھی اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چل رہی ہو کہ سات بیٹیاں اور . . . . . مگر اس نے اللہ کا شکر ادا کیا جب چار لڑکیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش پر اس نے امجد سے پوچھا۔

"کیا ابھی اولاد کی اور خواہش ہے؟"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

"میرا خیال ہے اب میں آپریشن کرا لوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

آپریشن کے بعد اُسے گھر پہنچے مہینہ بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ امجد کے تبادلے کا حکم نامہ آ گیا۔ اہم سرکاری دفاتر نئے دارالحکومت منتقل ہو رہے تھے۔ ضروری سامان کی پیکنگ کرنے، جو چیزیں ساتھ نہ جا سکتی تھیں ان کو ٹھکانے لگانے اور بچوں کے اسکولوں سے ضروری سرٹیفکیٹ لینے میں جتنا وقت صرف ہو سکتا تھا، اتنے دن بعد وہ اسلام آباد منتقل ہو گئے۔

کراچی کی مرطوب آب و ہوا کے مقابلے میں اسلام آباد ایک صحت افزا مقام ثابت ہوا۔ نجمہ کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ بدن پر اور گدراہٹ چھا گئی۔ مگر امجد نے محسوس کیا کہ ان تبدیلیوں کے باوجود نجمہ کے مزاج میں کچھ چڑچڑا پن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اور اس کی یہ چڑچڑاہٹ دوسروں کے بجائے خود اپنی ذات کے لئے زیادہ ہے۔ سارا دن گھر کے کاموں میں یوں اُلجھی رہتی ہے کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ اگر امجد کے ٹوکنے اور بچوں کے کہنے سے کبھی خود پر ذرا سا دھیان دیتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے سزا کاٹ رہی ہو، حالاں کہ پہلے یہ خیال رکھتی تھی کہ امجد کے دفتر سے آنے سے پہلے ہی سارے گھریلو کاموں سے نچنت ہو جائے اور اُجلے کپڑوں اور مسکراتے چہرے سے اس کا استقبال کرے۔ اور اب ــــ اب تو اپنی ذات سے لاپروا ہوتی جا رہی ہے۔ امجد نے اس کی وجہ سوچی تو ظاہری سبب یہی نظر آیا کہ یہاں اکیلا پن برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ کراچی میں تو کوئی نہ کوئی عزیز ملنے کے لئے آ ہی جاتا تھا۔

ایک دن اس نے نجمہ سے کہا۔

"بچوں کے اسکول بند ہوتے ہی میں بھی دو مہینے کی چھٹی لے لوں گا۔ پھر سب کراچی چلیں گے۔"

نجمہ نے نظریں اٹھا کے اُسے دیکھا۔

"وہاں رہیں گے کہاں؟"

"کیوں ــــ بہت ٹھکانے ہیں۔ تمہارے والدین ہیں۔ بہن بھائی ہیں۔ پھر حمید بھائی ہیں۔"

"حمید بھائی کے ہاں تو جاؤں گی نہیں۔ ان کی بیوی کی ڈانٹ پھٹکار سے بچے سہمے رہتے ہیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ پھر ہم . . . . . ."

"ابّا میاں کا حال تم کو معلوم ہی ہے۔ اب پہلے جیسے حالات تو رہے نہیں۔ اس عمر میں نوکری کر رہے ہیں۔ اماں اگر حکمت چھوڑ دیں تو گزارہ مشکل ہو جائے۔ بہنیں اپنے اپنے جنجال میں الجھی ہوئی ہیں۔ رہے بھیّا تو وہ . . . . . ."

وہ بیٹھا نجمہ کا مکالمہ سنتا رہا۔ "پھر جیسی تمہاری مرضی" کہہ کر اس کی کہی ان کہی باتوں پر رضامند ہو گیا۔

بیٹھے بیٹھے گم ہو جانا، اور گھر کے کام کاج کرتے ہوئے خود سے اُلجھتے رہنے کا رویہ جب دن کے ہنگاموں سے نکل کر رات کی خاموش تنہائی میں بھی کھلنے ملنے لگا تو امجد کو اور تشویش ہوئی۔ اُسے احساس تھا کہ دن بھر کی مصروفیت نجمہ کو پلک جھپکنے کی بھی مہلت نہیں دیتی ہے۔ اور رات میں جب بچے گہری نیند سوئے ہوتے ہیں تو وہ اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیتا ہے۔ مگر ایسا تو سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ نجمہ کے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے۔ اب ــــ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اس میں یہ تبدیلی کیوں پیدا ہو رہی ہے ــــ؟ بہت سوچ بچار کے بعد یہی بات ذہن میں بیٹھی کہ جب سے نجمہ نے آپریشن کرایا ہے تب ہی سے اس کی یہ کیفیت ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جذبات کی وہ لو بھی مدھم پڑ گئی ہے جس کی روشنی میں وہ انبساطی لمحوں کا راستہ دیکھ لیا کرتا تھا۔ مگر چند ہی لمحوں کے بعد اُسے اپنا یہ خیال بھی خام نظر آنے لگتا۔ جذبات کی لو مدھم نہیں ہوئی ہے۔ روشنی تو پہلے ہی جیسی ہے بس اب اس روشنی میں حدت نہیں رہی۔ بلکہ ٹھنڈک سی آ گئی ہے۔ آخر اس ٹھنڈک کی وجہ کیا ہے۔ سارا دن اپنی مرضی کے مطابق گزارتی ہے۔ رات میں حکومی کا عالم بھی پہلے ہی جیسا ہے۔ تو یہ اچانک بغاوت کی ایک لہر سی کیوں پیدا ہو جاتی ہے جیسے تیز رفتار گاڑی میں ایک دم بریک لگا دیئے جائیں، جیسے پھیلی ہوئی چاندنی میں یکایک بادل کا ایک ٹکڑا کہیں سے آ کر چاند کو ڈھک لے اور اُجالا اندھیرے کے تالاب میں

غوطہ کھا جائے۔ آخر یہ تبدیلی اس میں کیوں پیدا ہوئی۔ کیا اس لئے کہ یکے بعد دیگرے چھ بچے پیدا ہوئے۔ نہیں۔ ہر بچے کی پیدائش کے بعد اس کی گرمجوشی میں اضافہ ہی ہوا۔ لے دے کر یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس آپریشن نے کوئی ایسی خرابی پیدا کر دی ہے جو بھڑکی ہوئی آگ پر پانی کی طرح گر پڑتی ہے۔

امجد نے جب اپنے اس خیال کی تصدیق نجمہ سے چاہی تو اس نے نہایت بے رخی سے کہا۔

"بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ چونچلے کب تک چلیں گے۔"

یہ سن کر امجد نے بھرپور نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ جوانی کی ہریالی پورے بدن پر پھیلی ہوئی تھی اور عمر کی ایسی منزل کوسوں دور تک نظر نہ آتی تھی جہاں سے پت جھڑ کے موسم شروع ہو جاتے ہیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ صرف ایک بات سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟"

"ہم نے آپس میں باتیں کم کی ہیں۔ اور پیار زیادہ کیا ہے۔ تو کیا اب صرف باتیں کرنے کا زمانہ آگیا ہے؟"

یہ سن کر نجمہ کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے روشنی کا کوندا لپکا۔ پھر وہی بے تعلقی کے دیئے ٹمٹمانے لگے۔ امجد نے سوچا کہ کسی ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کرنا چاہیئے۔

دوسرے دن اس نے لیڈی ڈاکٹر سے فون پر شام کا وقت طے کر لیا۔

دفتر سے گھر آتے ہوئے وہ نجمہ کے خیالوں میں ہی گم تھا کہ سائیکل کا پہیہ ایک معمولی پتھر کا سامنا نہ کر سکا۔ توازن بگڑا اور امجد سنبھلتے سنبھلتے بھی گر پڑا۔ چوٹ تو زیادہ نہیں آئی تھی مگر سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پتھروں کی ڈھیری پر گرنے سے خراشیں بہت پڑ گئیں۔ وہ اٹھا۔ گری ہوئی سائیکل کو اٹھانے کے لئے جھکا تو کمر میں درد محسوس ہوا۔ نشتم پشتم گھر پہنچا۔ نجمہ نے حالت دیکھی تو تڑپ اٹھی۔ گرم پانی سے ہاتھ پیر صاف کرانے کے بعد خراشوں پر ٹنکچر آیوڈین لگایا اور ضد کر کے نیم گرم دودھ کا ایک گلاس پلایا۔

امجد لیٹ گیا۔

"میں نے آج شام کے لئے ایک ڈاکٹر سے وقت لیا ہے۔ پانچ بجے تیار ہو جانا۔"

"مجھے کیا ہوا ہے۔ خود ہی گر پڑ کر آگئے ہو۔ جا کے دکھا دینا۔"

امجد یہ بات سُن کر ہنس دیا۔

"بھئی میں نے لیڈی ڈاکٹر سے وقت لیا ہے، تمہارے لئے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

"جیسی تمہاری مرضی" کہہ کر امجد اس خیال سے خاموش ہو گیا کہ شام ہوتے ہی کسی بہانے سے لے جائے گا۔ مگر گھنٹہ بھر بستر پر لیٹے رہنے کے بعد جب اس نے اٹھنا چاہا تو چیخ نکل گئی۔ کمر میں شدید درد تھا۔ نجمہ بھی بے قرار ہو گئی۔ خوب بام ملا۔ گرم پانی کی بوتل سے سینکائی کی لیکن درد کی شدت میں کمی نہیں ہوئی تو رات میں ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے درد کم کرنے کی دوائیں دیں اور نیند کا انجکشن لگا دیا۔

امجد سویرے اٹھا تو درد پوری شدت کے ساتھ باقی تھا۔ دو چار دن کے علاج کے بعد ڈاکٹر بدلا۔ دوسرے ایکسرے کرائے اور سلپ ڈسک کی بیماری تشخیص کی۔ مہینہ بھر تک بستر پر پڑے رہنے کے بعد بھی تکلیف میں کمی نہ ہوتے پر امجد نے کہا۔

"مجھے کراچی لے چلو - حمید بھائی کا ایک داماد ڈاکٹر ہے۔ وہ میرا علاج کرادیں گے۔"

نجمہ نے بظاہر تو رضامندی کے انداز میں گردن ہلادی مگر امجد کی یہ بات اس کے دل کو کاٹ گئی۔ کیا یہاں علاج نہیں ہو رہا ہے؟ یہ سوال گنبد کی صدا کی طرح اس کے وجود میں گونج اٹھا۔ اسی شام پنڈی سے ایک بڑے ڈاکٹر کو بلاکر معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کا مُہرہ ٹوٹ گیا ہے۔ علاج صبر طلب ہے۔ دو ایک دن اسی تکلیف کے عالم میں گزرے۔ پھر یہ ستم اور ٹوٹا کہ فالج نے آدھا دھڑ سُن کر کے ڈال دیا۔ اس نئی افتاد پر نجمہ کے تو اوسان جاتے رہے۔ وہ امجد کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی راتوں کی نیندیں بھی تج دیں۔ صورت ایسی ہوگئی کہ بیمار اور تیمار دار کا فرق جاتا رہا۔ امجد کی غذا برائے نام رہ گئی تھی۔ گلوکوز کی ڈرپس بدن میں کتنی زندگی اتارتیں۔ ایک رات اس نے نجمہ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ کہنا چاہا اور خاموش ہوگیا۔ امجد کے خاموش ہوجانے پر نجمہ نے بھی چپ سادھ لی۔ اس نے بین نہیں کئے۔ سترہ برس کی ازدواجی زندگی کا سکھ اتار کر بیوگی کے دکھ کا سکوت اوڑھ لیا۔ سارا دن گم سُم گھر کے کاموں میں لگی رہتی اور راتیں کروٹیں بدلتے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے گزار دیتی۔

نجمہ کا حال دیکھ کر ہمدردوں نے بچوں کو مشورہ دیا کہ اب کراچی لوٹ چلو۔ اسلام آباد تو سرکاری افسروں کا شہر ہے۔ یہاں میل ملاقات بھی ملنا ملنے کی پابند ہوتی ہے۔ تم سب اسکول چلے جاتے ہو تو وہ خالی گھر میں باؤلی ہوجاتی ہے۔ آخر سب نے مل کر اُسے کراچی جاکر رہنے پر آمادہ کیا۔ محکمے سے ملنے والے واجبات وصول کرنے اور امجد نے جو ایک قطعۂ اراضی الاٹ کرایا تھا اُسے فروخت کرنے کے بعد کراچی میں ایک فلیٹ خرید کر اس میں آن بسی۔

بیٹی نے میٹرک پاس کرلیا۔ باقی بچے ابھی پڑھ رہے تھے۔ تھوڑی بہت جو رقم ہاتھ میں تھی وہ زیادہ عرصے چلتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ نجمہ سسرال والوں کا بھی احسان لینا نہ چاہتی تھی اور کوئی ایسا تھا نہیں جو بچوں کی تعلیم مکمل ہونے تک ساتھ دے سکتا۔ دن بھر یہ فکریں اور رات بھر امجد کا خیال۔ دماغ ماؤف ہونے لگا۔ آخر بڑی بیٹی نے اُسے رضامند کرکے ایک نجی اسکول میں ملازمت کرلی۔ اس طرح نجمہ ایک بڑی فکر سے آزاد ہوئی کہ رفتہ رفتہ گھر کے معاملات ہی سے بالکل لاتعلق ہوگئی۔ بچیوں کے سگھڑاپے اور لڑکوں کے سلیقے نے ملنے جلنے والوں کو یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ہے اور ماں کا دل مرچکا ہے۔ ایسے عالم میں بھی جب کہ نجمہ رات رات بھر جاگا کرتی اور خیال اُسے نڈھال کئے رکھتے تھے وہ رات میں کئی بار اٹھ کے یہ اطمینان ضرور کرلیا کرتی کہ لڑکیاں اپنے بستر پر موجود ہیں۔

ہر رات تو اتر کے ساتھ وہ زندگی کے ورق پلٹتی۔ اور ان اوراق پر صرف راتوں کی کہانیاں پڑھتی۔ کنوارپنے میں خواب دیکھتی ہوئی آنکھوں کی کہانیاں، بڑی بہن کا گھر سے نکل کر گلی میں کھڑے ہوئے لڑکے سے ملنے جانا۔ پھر شادی کی رات۔ بیدار آنکھوں میں بنجر مستقبل کے عکس سمیٹ کر التجا بھرے لہجے میں کہنا: "مجھے کہیں سے زہر لادو نجمہ۔" پھر دوسری بہنوں کی شادیوں پر چہل پہل کے بجائے راتوں کا ٹھنڈی سانس لے کر تاریکی میں منہ چھپالینا۔ پھر اپنی شادی۔ بہنوں سے سنی ہوئی باتوں پر گھبراہٹ۔ سوچ کے سمندر میں اٹھنے والے طوفان۔ رات کی کھائی میں گرتے وقت امجد کے مضبوط بازوؤں کا سہارا۔ پھر امجد کا راکبِ شب ہونا۔ پھر امجد — اور امجد — امجد ہی امجد — سینکڑوں گزری ہوئی راتوں کو وہ ایک رات میں سمیٹ لیتی۔ آنکھوں پر دستک دیتی ہوئی نیند کو اس وقت بلاتی جب رات آخری انگڑائی لے رہی ہوتی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اُسے خیال آیا کہ میرا بھرا پُرا گھر — وہ گھر جس کی راتیں میرے اور امجد کے تنفس سے گونجا کرتی تھیں اور دن بچوں کی چہکار سے منور، آنے جانے والوں کی وجہ سے بارونق رہتے تھے، ایسا سونا سونا کیوں ہوگیا۔ یقیناً میرے گھر پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ ضرور کسی دشمن نے کوئی عمل کیا ہے، ورنہ امجد کے مرنے کے دن تو نہیں تھے۔ راتوں کی ویرانی کا موسم تو نہیں تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے دشمنوں کا کھوج لگانا شروع کردیا۔ پہلے وہ بہنیں خیال میں آئیں جو اس کو امجد جیسا شوہر ملنے پر خوش نصیب کہا کرتی تھیں اور اپنے شوہروں سے شاکی رہتی

تھیں۔ ۔ ۔ ۔ نہیں۔ وہ ایسا کیوں سوچنے لگیں۔ مانا ان کے شوہر امجد سے بہت کم تر ہیں مگر وہ تو بہنیں ہیں۔ پھر امجد کے بڑے بھائی حمید کے بارے میں سوچا۔ ہاں ان کی بیوی سے بعید نہیں۔ زبان دراز، مغرور۔ باتیں چٹ پٹکیوں جیسی۔ ایک مرتبہ یہ بھی تو کہا تھا کہ میں زنخے جیسے مرد پر کتنا اتراتی ہوں۔ انہوں نے امجد کو زنخا کہا۔ ارے امجد جیسا مرد تو انہوں نے خیالوں میں بھی نہیں برتا ہوگا۔ بس یہ کیا دھرا انہیں کا ہے۔ کسی پیر کی مُرید بھی تو ہیں۔ اپنے ہر بچے کے تعویذ باندھ رکھا ہے۔ میرے لئے بھی ضرور گنڈا تعویذ کیا ہوگا۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے بچوں کو آواز دی۔

"ارے سنو، تمہاری تائی اماں نے تعویذ کیا ہے جب ہی تو تمہارے ڈیڈی مر گئے۔ مجھ سے تو شروع ہی سے جلتی تھیں۔" بچے ماں کی باتوں پر حیران ہوئے، پھر سمجھانے لگے۔

نجمہ نے بچوں کی باتیں سن کر کہا۔

"یہ اسی تعویذ کا اثر ہے جو تم بھی میری بات نہیں مان رہے ہو۔"

ماں کی حالت دیکھ کر اور باپ کی یاد آنے پر بچے پریشان ہوئے۔ ان کو روہانسا دیکھ کر نجمہ ہنس دی۔

"دیکھا، میں نے آخر چور پکڑ ہی لیا۔"

بڑی بہن کی واپسی پر سب نے ماں کی کیفیت بیان کی۔ وہ بہت دیر تک نجمہ کے پاس بیٹھی اُسے سمجھاتی رہی اور نجمہ اس کی باتیں بغیر حیل حجت کے سنتی رہی۔ جب وہ اُٹھ کر گئی تو نجمہ نے اشارے سے دوسری بیٹی کو قریب بلایا اور کہا۔

"دیکھو اس لڑکی کے بال دھوپ میں سفید ہو رہے ہیں۔ چلی ہے مجھے سمجھانے۔ مگر نہیں ۔۔ وہ لڑکی کہاں ہے، وہ تو میرا کماؤ پوت ہے۔ اس کو ناراض نہ کرنا ورنہ سب بھوکوں مرو گے۔"

اسی طرح ایک دن سویرے سویرے اس کی دوسری بیٹی چائے کا کپ لے کر آئی تو اس نے پیالی لیتے ہوئے بیٹی کو بڑے غور سے دیکھا پھر بہت محبت سے کہا۔

"آ ۔۔ میرے پاس بیٹھ۔"

بیٹی اُس سے لگ کر بیٹھ گئی تو نجمہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے کہا۔

"تو بڑی شیطان ہے۔"

سارے بچوں میں سب سے بھولی بیٹی نے ماں کی زبان سے یہ فقرہ سنا تو ہنس دی۔

"کیا شیطانی کی ہے میں نے امی؟"

نجمہ نے چائے کی پیالی بستر پر قریب ہی رکھ لی۔ اور بیٹی کے سر سے ہاتھ اُٹھا کر اس کی کمر پر گھونسہ مارا۔

"اتنی جلدی جوان ہوگئی اور پوچھتی ہے کیا شیطانی کی ہے۔ ارے بن باپ کی بچیوں کو جوان نہیں ہونا چاہیئے۔"

یہ سن کر بیٹی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ بھاگ کر باورچی خانے میں جا گھسی اور وہاں بہت دیر تک روتی رہی۔

وہ ایک چھٹی کا دن تھا۔ سب دن چڑھے تک سوتے رہے۔ جب اٹھے تو ایک خوش گوار حیرت کا سامنا ہوا۔ نجمہ نے نہا دھو کر بال سنوارے تھے اور ایک اُجلی ساڑھی باندھے، ناشتہ تیار کئے سب کے اُٹھنے کی منتظر تھی۔ امجد کے مرنے کے بعد وہ اپنی ذات سے بالکل لاپروا ہو گئی تھی۔ لڑکیاں زبردستی غسل خانے بھیجتی تھیں۔ لباس تبدیل کراتی تھیں۔ کنگھی چوٹی کرتی تھیں۔ آج ماں کے اندر اتنی تبدیلی دیکھی تو سب کھل اُٹھے۔

"تم لوگ ناشتہ کرلو اور تیار ہوجاؤ۔ پھر مجھے اپنی پھوپی کے ہاں لے چلو۔"

"پھوپی کے ہاں — امی — آج وہ کیسے یاد آگئیں آپ کو؟" چھوٹے بیٹے نے پوچھا۔ نجمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف مسکرادی۔

بچوں کو لے کر وہ اپنے نند کے یہاں پہنچی۔ خاصی دیر تک وہاں بیٹھی اور کوئی ایسی بات نہیں کی جو قابلِ اعتراض ہوتی ورنہ سسرال کا کوئی رشتہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ امجد کے انتقال کے بعد تو اس کا ناتا تو اپنے آپ سے ٹوٹ گیا تھا، سسرالی رشتوں کا کیا پاس کرتی۔ لیکن اس دن وہ نہایت خوش مندی سے سب کی باتیں سنتی رہی۔ اور مسکراتی رہی۔ چلتے وقت وہ امجد کی بہن سے بغل گیر ہوئی اور سرگوشی کے لہجے میں بولی۔

"تمہارے بھائی کی نشانی ہیں۔ تم کو ہی خیال رکھنا ہے۔"

وہاں سے واپس ہونے کے بعد ایک ہفتے تک وہ سویرے اٹھتی رہی۔ لباس بھی صاف ستھرا رکھا۔ بالوں کو بھی نہیں الجھنے دیا۔ جب بھی دروازے پر دستک ہوتی تو وہ بچوں سے کہتی۔

"دیکھو شاید تمہاری پھوپی آئی ہیں۔"

ایک دن جب کمرے میں ریڈیو بج رہا تھا، بیٹے اپنے کمرے میں بیٹھے پڑھ رہے تھے، بڑی بیٹی اسکول گئی ہوئی تھی، اس سے چھوٹی کھانا پکانے میں مصروف تھی اور باقی دونوں لڑکیاں بھی کالج سے نہیں لوٹی تھیں کہ شیشہ ٹوٹنے کی آواز ریڈیو کی صدا پر چھا گئی۔ لڑکے اپنی کتابیں کھلی چھوڑ کر لپکے۔ بیٹی نے گھبرا کے چولھا بند کردیا۔ اور ماں کے کمرے کی طرف دوڑی۔ نجمہ بپھری بیٹھی تھی۔ اس نے سروتہ مار کے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تھا۔

"وہ آئی تھی پھوپی، تمہاری۔ مجھے منہ چڑا رہی تھی۔ میں نے مار کے بھگا دیا۔"

دونوں بیٹے قریب بیٹھ گئے اور سمجھانے لگے۔

"امی، آپ اتنے وہم کیوں کرتی ہیں۔ پھوپی اماں کھڑکی سے کیسے جھانک سکتی ہیں۔"

"ارے تم نہیں سمجھتے۔ دشمن ہے میری۔ اُس دن جو مٹھائی بھیجی تھی اس میں زہر ملا دیا تھا۔ اور بہانہ یہ کیا کہ لڑکا ڈاکٹر بن گیا ہے۔"

"امی، وہ مٹھائی تو ہم نے کھائی تھی۔ ہمیں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"خدا نہ کرے جو تمہیں کچھ ہو۔ تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ۔ پھر میں بھی مٹھائی بھیجوں گی سب کو۔ سب کو جلاؤں گی۔"

اس دن پہلی بار لڑکوں نے محسوس کیا کہ ماں کے ذہن پر صدمے کا اثر دل کے زخم کی طرح گہرا ہے۔ اسی لئے کبھی کبھی بہک جاتی ہیں۔ بڑی بیٹی نے اسکول کی ملازمت کے ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی تھی۔ جب وہ شام کو آتی تو نجمہ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی سرتاپا جائزہ لیتی۔ ایک ایک قدم گنتی۔ پھر مطمئن ہو کر بالکل بے تعلق ہوجاتی۔ مگر رات کے اندھیرے میں سرگوشی بھرے لہجے میں وہ ایک فقرہ ہمیشہ دُہراتی۔

"لڑکیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ کچھ ان کی بھی فکر کرو۔"

پھر وہ اپنے پلنگ سے اُترتی۔ دبے قدموں سب کمروں کا چکر لگاتی۔ سوئی ہوئی لڑکیوں کے پاس پل بھر کو ٹھہرتی اور اپنے کمرے میں آجاتی۔ جاگتی رہتی۔ امجد سے مخاطب ہو کے بڑبڑاتی رہتی۔

ایک دن گھر میں پہلا رشتہ آیا۔ رشتہ لے کر آنے والے وہ سندھی پڑوسی تھے جن کے وسیلے سے بیٹی کو اسکول میں ملازمت ملی تھی۔

اور چھوٹے بیٹے کو ۸ برس! سادا خطرہ اور جو اپنے گھر سے زیادہ خیال اس کے گھر کا رکھتے تھے اور جن کے ہاں کبھی کبھار آنے والوں کی پگڑیاں اور گھنی داڑھی مونچھیں دیکھ کر وہ سہم جاتی تھی۔ ان کا لڑکا کویت میں ملازمت کرتا تھا۔ اب چھٹی پر آیا ہوا تھا کہ والدین نے شادی کی بات چھیڑ دی۔ وہ لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ لڑکی کو آتے جاتے سیکڑوں مرتبہ دکھایا جا سکتا تھا۔ مگر وہ لوگ بھی اپنی روایات کے پابند تھے۔ اس لئے پہلے آکر نجمہ کو بتایا۔ نجمہ نے اپنے بیٹوں سے پوچھ کے ہامی بھرلی تو وہ شام کے وقت آ گئے مگر بڑی بیٹی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

"باجی اسکول کے بعد دو ٹیوشن بھی پڑھاتی ہیں۔ پھر بی ٹی سی کلاس اٹینڈ کرنے چلی جاتی ہیں۔ اسی لئے ذرا دیر ہو جاتی ہے۔ بس آتی ہی ہوں گی۔"

نجمہ کے دونوں بیٹے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نجمہ بھی وہاں سہمی سی بیٹھی تھی اور حسب معمول اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ جس سے بھی نظریں مل جاتیں، مسکرا دیتی۔ یا پھر کہنے والی کی بات کا آخری حصہ دہرا دیتی۔ اب بیٹے کی بات سن کر بھی اس نے کہا۔

بس آتی ہی ہوں گی۔

ہی سمے کال بیل گونجی تو ایک بیٹا دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھا اور اٹھتے ہی مہمانوں کی طرف دیکھ کے بولا۔

"شاید باجی آ گئیں۔"

نجمہ نے بھی گردن ہلا کے کہا: "آ گئیں۔"

دروازہ کھولتے وقت بھائی نے دبی آواز میں مہمانوں کی آمد اور انتظار کا مقصد بتا دیا۔ وہ سیدھی مہمان خانے میں آ گئی۔ خندہ پیشانی کے ساتھ سب سے ملی اور وہیں بیٹھ گئی۔ نجمہ کو مہمانوں کے درمیان بیٹھا دیکھ کے مسکرائی اور آہستہ سے کہا۔

"امی چائے بھی پلائی آپ نے یا باتیں ہی کرتی رہیں۔؟"

بیٹی کی بات سن کر نجمہ ہنسی مگر کچھ کہا نہیں۔ بیٹی نے پھر کہا۔

"امی ذرا فرزانہ سے کہیے چائے لے کر آئے۔"

نجمہ اٹھ کر گئی تو اس کی بیٹی نے مہمانوں سے مخاطب ہو کے کہا۔

"فرزانہ میری چھوٹی بہن ہے۔ بہت گھریلو لڑکی ہے۔ سارا گھر اسی نے سنبھال رکھا ہے۔ ابھی آتی ہے۔ آپ اُسے دیکھ لیجئے۔"

فرزانہ بھی اپنی بہن سے ہیٹی نہ تھی۔ ہفتہ عشرہ میں بات پکی ہو گئی۔ شہنائی بجی اور فرزانہ رخصت ہو گئی۔

ایک بیٹی کیا رخصت ہوئی کہ دروازے پر شہنائی کی آواز جم کے بیٹھ گئی۔ چار پانچ برس کے عرصے میں سب لڑکیاں اپنے گھر جا بسیں۔ اب نجمہ کی پریشانیاں ختم ہو جانی چاہیے تھیں۔ وہ چین کی نیند سوتی۔ مگر ہوا برعکس۔ دونوں بیٹوں نے بھی پڑھائی کے ساتھ ملازمت کر لی تھی۔ صبح کے گئے چراغ جلے لوٹتے۔ نجمہ سارا دن گم صم تنہا پڑی رہتی۔ بچوں کی موجودگی میں تو وہ بڑبڑاتی تھی اب اکیلے میں تو وہ خود سے اتنے اونچے لہجے میں باتیں کرنے لگی جیسے لڑ رہی ہو۔ اور باتیں بھی کیا، بس امجد کا ذکر۔ اگر در و دیوار کے زبان ہوتی تو وہ امجد کی ایک ایک بات یوں دہراتے جیسے سب کچھ ان ہی کے درمیان گزرا ہو۔

دونوں لڑکے صبح گھر سے نکلتے وقت دروازے کو باہر سے مقفل کر دیتے تھے۔ تالے کی چابیاں چار تھیں۔ ایک ایک کنجی تو وہ دونوں اپنے پاس رکھتے تھے۔ ایک پڑوس میں دے رکھی تھی اور چوتھی انہوں نے نجمہ کے پاس چھوڑ دی تھی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے نجمہ کو خیال آیا کہ چابی کہیں کھو گئی ہے۔ اس نے سرہانے دیکھا۔ نہیں ملی۔ اپنے پاندان میں تلاش کیا۔ نہیں پایا۔ اس پر تو گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ سارا بستر الٹ پلٹ کر ڈالا۔ الماریوں میں ڈھونڈا۔ کمرہ تلپٹ ہو گیا۔ آخر کنجی گئی کہاں۔ وہ اسٹور میں گھس گئی۔ ایک صندوق کھولا۔ اس میں

لڑکیوں کے پرانے کپڑے رکھے تھے۔ دوسرے کو کھولا۔ اس میں امجد کے کپڑے تھے۔ ان کپڑوں کو دیکھ کر وہ بھول گئی کہ چابی بھی تلاش کر رہی ہے۔ بہت احتیاط سے ایک ایک کرکے اس نے تمام کپڑوں کو نکالا۔ مدت سے صندوق میں بند رہنے کے باعث ان میں فنائل کی گولیوں کی بو بس گئی تھی۔ نجمہ نے ان سارے کپڑوں کو بالکنی میں بندھی الگنی پر ڈالا۔ دو ایک قمیصوں کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، ان میں نئے بٹن ٹانکے۔ اور دن بھر ان کپڑوں کے ساتھ وہ بھی دھوپ کھاتی رہی۔

شام کو بیٹے گھر آئے تو ان سے کہا "آج تمہارے ڈیڈی نے کچھ نہیں کرنے دیا۔ سارا دن اپنے کام میں الجھائے رکھا!"

بیٹوں نے الگنی پر لٹکے ہوئے کپڑوں کو دیکھا۔ مسکرائے اور نجمہ کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لے آئے۔

شب بیداری کی عادت تو پہلی ہی پکی تھی۔ اس رات بھی وہ آنکھیں پھاڑے چھت کو تکتی رہی اور بڑبڑاتی رہی۔ یہ خود کلامی نہیں تھی۔ وہ تو دھیمے دھیمے لہجے میں امجد سے حالات کا گلہ کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو اتنے جوش میں بولی کہ بیٹے برابر والے کمرے سے اٹھ کر آ گئے۔ جب وہ اس کے ہاتھ پاؤں دبا رہے تھے اور سونے کی تلقین کر رہے تھے تو وہ بلک بلک کے رونے لگی۔

اس کو روتا دیکھ کر بیٹوں نے سوچا کہ اگر ماں کے اس رونے میں آنسو بھی شریک ہوتے تو ان کا سارا دکھ بہہ جاتا۔ دن کا مشغلہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ امجد کے کپڑے سامنے رکھ کر وہ سارا سارا دن اپنی کھنڈر زندگی کے خرابوں میں کھوئی رہی۔ شام کے وقت اس وحشت میں ذرا کمی ہوتی دونوں بیٹے کام سے واپس آ جاتے تھے۔ کوئی نہ کوئی بیٹی بھی بھیس رالگا جاتی تھی۔ اور یہ احساس کہ گھر میں کوئی ہے اسے ڈھارس سی بندھا دیتا۔

شادی کے بعد بیٹیوں نے وطیرہ بنا لیا تھا کہ وہ اکثر شام کو اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ آ جاتی تھیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان کے شوہروں کو دیکھ کر نجمہ کی تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں اور ناخوشی کے آثار پھیل جاتے ہیں تو انہوں نے پابندی سے آنا کم کر دیا۔ ماں کی حالت دیکھتے ہوئے وہ آتی تو اب بھی تھیں مگر ذرا سی دیر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد اس کمرے میں چلی جاتیں جہاں ان کے شوہر بھائیوں سے گپ شپ میں مشغول ہوتے۔ وہاں کچھ دیر نجمہ کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت موضوع گفتگو ہوتی۔ علاج کے لئے مختلف ڈاکٹروں کے نام زیر بحث آتے۔ پھر بات کا رخ بدلتا۔ ہنسی ٹھٹھا ہوتا اور یوں گھنٹہ آدھا گھنٹہ گزارنے کے بعد وہ اپنے گھروں کو سدھار جاتیں۔

صبح سے شام تک کا وقت تو کٹ ہی جاتا تھا۔ مگر رات گزارے نہیں گزرتی تھی۔ بچھو کی طرح ڈنک مارتی ہی رہتی۔ اور نجمہ بستر پر ایسے کروٹیں بدلتی اور یوں پاؤں پٹختی جیسے تکلیف کی شدت نے بے چین کر رکھا ہو۔

لڑکوں نے اپنی بساط کے مطابق کئی ڈاکٹروں کو دکھایا تھا مگر ہر ڈاکٹر کے پاس ایک دوا تو لازمی تھی۔ اعصاب کو تسکین پہنچانے کی دوا۔ ان دواؤں کے استعمال سے نجمہ کا دماغ ہر وقت سویا سویا سا رہتا۔ جب کبھی ذہنی خلفشار کا غلبہ نہیں ہوتا اور وہ کوئی واضح بات سوچ رہی ہوتی تو ان دواؤں کے اثر کی وجہ سے اپنی سوچ کا اظہار کرتے کرتے بھول جاتی۔ جب بھول جاتی اور کوشش کرنے پر بھی بات کا سرا ہاتھ نہ آتا تو ساری بھولی ہوئی بات ماتھے پر شکنوں کی صورت نمودار ہو جاتی۔ آنکھیں کسی ایک چیز پر گڑ جاتیں اور پھر اس پر جھنجھلاہٹ کا دورہ پڑ جاتا۔ پاس رکھی ہوئی ہر چیز اٹھا کر پھینک دیتی۔ جو سامنے بیٹھا ہوتا اس پر برس پڑتی۔

صبح کام پر جانے سے پہلے، دونوں میں سے کوئی ایک بیٹا اسے دوا کھلانے کے لئے آتا۔ وہ دوا کھا کے دن بھر غنودگی کے عالم میں پڑی رہتی۔ لیکن کبھی کبھی وہ بڑی صفائی کے ساتھ گولی کو حلق میں اتارنے کے بجائے گریبان میں ڈال لیتی یا انگلیوں ہی میں اس طرح چھپا لیتی کہ ذرا شبہ نہ ہوتا۔ پھر لڑکوں کے جانے کے بعد وہ کمرہ در کمرہ کسی بد روح کی طرح پھرتی رہتی۔ یا کسی ایک ہی کام میں اس طرح مصروف ہو جاتی کہ کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا۔ پھر بیٹھے بیٹھے ترنگ اٹھتی تو امجد کے کپڑے نکال کر سامنے پھیلا لیتی۔ پھر ان کو احتیاط سے تہ کرتی۔ ان پر اس طرح ہاتھ پھیرتی جیسے کوئی پالتو بلی کو اپنی گود میں بٹھا کر سہلاتا ہے۔ کبھی اس طرح تھپکتی جیسے کسی بچے کو سلا رہی ہو۔ ایک مرتبہ جب امجد کے کپڑوں کو کھول کر اس نے

پلنگ پر پھیلا رکھا تھا اور اُس طرح ان کو دیکھ رہی تھی جیسے امجد ان میں تحلیل ہوگیا ہو۔ تب اچانک اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر مطمئن ہوکر اپنا سارا لباس اتار دیا۔ الماری میں لگے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ اور پھر امجد کے کپڑے پہنتے اور ہاتھ پھیلا کے آئینے سے ہم آغوش ہوجانے کی کوشش کرتی رہی۔

چھوٹے بیٹے کو تو وہ ابھی تک چھوٹا ہی سمجھتی تھی۔ اس کے ہاتھ سے دوا کھاتی تھی اور نہ کبھی اُس کا کہا کرتی تھی بلکہ چاہتی یہ تھی کہ اس کو اپنے اشاروں پر چلائے۔ قریب بیٹھا ہوتا تو اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیتی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہتی اور جب کبھی وہ اسی طرح لیٹے لیٹے سو جاتا تو اتنا ہی دھیان رکھتی جتنا سوتے ہوئے کسی بچے کا دھیان رکھا جاتا ہے۔ بڑے بیٹے سے وہ ڈرتی تھی۔ جو بات بھی وہ کہتا بلا چون وچرا مان لیتی سب کی سمجھ میں اُس کی ایک ہی وجہ آتی تھی کہ بڑا بیٹا صورت شکل، چال ڈھال، انداز و اطوار میں ہو بہو امجد تھا۔ اس کی آواز بھی امجد کی آواز سے اتنی ملتی تھی کہ جب وہ اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے کھانستا یا گنگناتا تو نجمہ ہونقوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگتی۔ سو رہی ہوتی تو اس کی آواز سُن کر چونک اٹھتی۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند کی دبیز تہیں سرکنے لگتیں اور اس چھٹتی ہوئی دھند کے پیچھے اُسے امجد کی صورت اُبھرتی ہوئی دکھائی دینے لگتی، اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ امجد کے سینے پر سر رکھ دے۔ اس کے گلے لگ جائے۔ پھر اپنی اس کیفیت کا اظہار، اپنی تنہائی کا ذکر، دل و دماغ پر چھائے ہوئے بوجھ کی بات امجد سے کرے۔ مگر اسی ساعت اُسے یاد آجاتا کہ امجد کے وجود سے قائم ہونے والا رشتہ تو ٹوٹ چکا ہے۔ پھر وہ ساری رات اپنے وجود میں بکھری ہوئی یادوں کی کرچیاں جمع کرکے امجد کی تصویر بنانے کی کوشش کرتی رہتی۔

وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔

دن تو سارے دنوں سے مختلف تھا ہی کہ آج اس کے بڑے بیٹے کی شادی ہوئی تھی۔ بہو آئی تھی۔ گھر میں بہت چہل پہل رہی۔ نجمہ بھی اپنے حواسوں کے ساتھ اس ہنگامے کے بیچ خاموش بیٹھی سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔ اس کو اپنی چاروں بیٹیاں رخصت کرتے وقت امجد کی اتنی یاد نہیں آئی تھی جتنی آج۔ ہر لحظہ اور ہر ساعت کے بعد ذہن کے سمندر میں ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کی طرح امجد کا ہیولا اُبھرتا اور ڈوبتا رہا۔ اس کے ذہن میں اور سینے میں طوفانی کیفیت اس وقت تک رہی جب تک سورج اپنی شعاعیں سمیٹ کر افق کے غار میں نہیں اتر گیا۔

مہمانوں کے رخصت ہوجانے کے بعد، دن بھر کی تھکی ماندی نجمہ کو کسی بیٹی نے جب سہارا دے کے اٹھایا اور اس کے کمرے میں لاکر چھوڑا تو وہ بے سُدھ ہوکر بستر پر ڈھے گئی۔ وہ کب تک سوتی رہی اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ جب امجد کی آواز کا سایہ سماعت کی دیواروں کی منڈیروں پر پڑا تو وہ اٹھی۔ سارے کمرے میں اتنا اندھیرا تھا کہ وہ سمجھی جیسے اٹھنے کے بعد بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولی ہیں۔ جب اندھیرے میں چھپی ہوئی روشنی دکھائی دینے لگی تب اُسے احساس ہوا کہ آج سڑک پر جلنے والا کارپوریشن کا بلب بھی آنکھیں موندے پڑا ہے۔

اس نے لیٹے لیٹے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ برآمدے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ جس سے برآمدے کے ساتھ ڈرائنگ روم بھی اندھیرے میں ڈوبنے سے بچ گیا تھا۔

چھوٹے سے برآمدے میں، فرش پر اس کی ایک بیٹی اپنے بچوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر نجمہ سمجھ گئی کہ ابھی گھر میں اتنے لوگ موجود ہیں کہ بیٹی کو برآمدے کے علاوہ کہیں جگہ نہیں ملی۔ اس نے اپنے کمرے کے بارے میں سوچا کہ وہ یہاں آکر سو سکتی تھی مگر ساتھ ہی اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کے کمرے میں تو سارے گھر کا سامان ٹھونسا گیا ہے، جب ہی تو ڈرائنگ روم میں لوگوں کے لیٹنے بیٹھنے کی جگہ بنی ہے۔ اور برابر والے کمرے کو حجلۂ عروسی بنایا گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی پھر امجد کی آواز کا سایہ لرزا۔ نظروں نے سائے کا پیچھا کیا تو برابر والے کمرے کے دروازے سے جا ٹکرائیں۔ اس دروازے پر ایک جگنو چپکا بیٹھا تھا۔ جگنو یہاں کہاں۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ غور سے دیکھا۔ وہ جگنو دروازے کے ایک چھوٹے سے روزن میں بیٹھا تھا۔ وہ اپنے پلنگ سے اُتری۔ اس نے چپل بھی نہیں پہنی۔ اور بہت احتیاط سے برآمدے میں سوئی ہوئی بیٹی اور اس کے بچوں کو

لڑکھڑاتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ اس نے باتھ روم کا بلب بھی روشن نہیں کیا۔ روشنی کی آواز بھی ان سوئے ہوئے لوگوں کے چہرے پر پانی کے قطروں کی طرح پڑ سکتی تھی۔ واپس آتے ہوئے اس نے پل بھر کو ڈرائنگ روم کے دروازے پر ٹھہر کر اندر کی طرف جھانکا تو ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے بچے سدھ بدھ سے بے خبر، نیند کے جھولے میں پڑی ہوئی لڑکیاں بالیاں، سب لوگ فرش پر یوں بکھرے ہوئے تھے کہ ان کے درمیان قدم رکھ کر نہیں گزرا جا سکتا تھا۔

تجسس احتیاط سے گئی تھی اتنے ہی محتاط انداز میں لوٹ آئی۔

وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ مگر دروازے پر چپکا ہوا روشنی کا نقطہ، سوئی کی نوک کی مانند اس کے وجود میں چبھنے لگا۔ دو چار محتاط کروٹیں لے کر وہ پھر اُٹھ بیٹھی ـــ اور ـــ روشنی کے ٹمٹماتے قطرے کو تکتی رہی۔

گھُپ اندھیرا امجد کو بھی کھلتا تھا۔

بھاگتی ہوئی اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ریل، جھٹکے کھاتے ہوئے بدن، سیاہ لباس پہنے ہوئے اُجالا، کمرے میں جلتی ہوئی موم بتی، اور موم بتی کی روشنی سے دیواروں پر بنے ہوئے بے ہنگم سائے، امجد کے ہاتھوں کا لمس، بچوں کا کلبلانا، امجد کا روشن مسکراتا ہوا خاموش چہرہ، مضبوط بازوؤں میں کسمساتا ہوا بدن ـــ

اس نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

رات کے سانپ نے اندھیرے کا من اُگل رکھا تھا۔

سینے کی سلاخیں توڑ کر آواز کا قیدی فرار ہونا چاہتا تھا۔ ماحول میں پھیلے ہوئے پُراسراریت کے محافظ چوکس ہو گئے۔ اس نے تلے اوپر دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لئے۔ یوں وہ آواز جو حلق سے باہر نکلتے ہی کراہ کی صورت میں بدل جاتی اس کی ہتھیلیوں سے سر ٹکرا کے پلٹ گئی اس کا سارا وجود جھنجھنا اٹھا۔

"امجد ـــ امجد ـــ کہاں ہو تم ـــ"

سنسناہٹ بدن میں چیخنے لگی۔

وہ پلنگ سے اُٹھ کر دبے قدموں روشنی کے نقطے کی جانب اس طرح بڑھی جیسے بچے کسی پھول پر بیٹھی تتلی کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ذرا سی جھکی اور، روشنی کے اس ننھے سے دائرے کو، ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ میں اُتار لیا ـــ

بیجنگ

اب کراچی سے ہفتہ میں تین پروازیں

جمعرات کو کراچی سے سیدھے بیجنگ

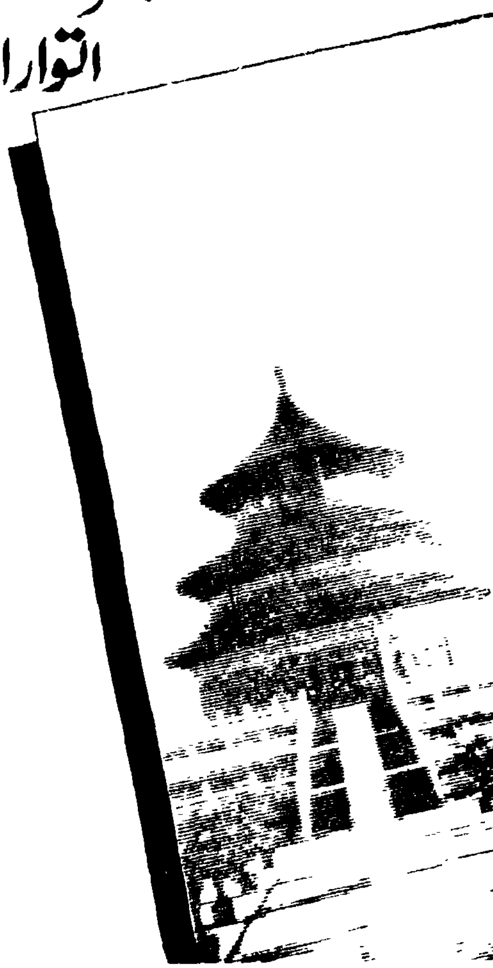
اتوار اور منگل کو براستہ اسلام آباد

۶ مئی ۱۹۸۰ء سے پی آئی اے نے بیجنگ کیلئے اپنی تیسری پرواز دوبارہ شروع کردی ہے۔ قراقرم کی بلند و بالا، خوبصورت اور پرشکوہ چوٹیوں پر سے گزرتی ہوئی تین آرام دہ پروازیں... ایک عظیم منزل کی طرف رواں دواں!

دن		منگل	جمعرات	اتوار
فلائٹ نمبر		۷۵۴	۷۵۰	۷۵۲
جہاز		بی ۷۰۷		
درجہ		ایف/وائی		
کراچی	روانگی	۰۵۲۰	۰۶۰۰	۰۴۰۰
اسلام آباد	آمد	۰۷۱۵		۰۵۵۵
اسلام آباد	روانگی	۰۸۲۰		۰۷۰۰
بیجنگ	آمد	۱۷۵۰	۱۶۵۰	۱۹۳۰

۶ مئی ۱۹۸۰ء سے نافذ العمل — تمام اوقات مقامی ہیں۔

مزید معلومات کے لئے قریبی پی آئی اے بکنگ آفس یا اپنے ٹریول ایجنٹ سے رابطہ قائم کیجئے۔



پی آئی اے PIA

پاکستان انٹرنیشنل

باکمال لوگ - لاجواب پرواز



ستیش بترا

پہچان کا کرب

بھلا سا نام تھا ان کا سکندر رنجیت۔ لیکن انہیں اس نام سے پہچانا ہی کس نے تھا! والدین نے شاید اس بات کی تمنا کی ہوگی کہ اس کا نام بھی سکندرِ اعظم کی طرح ہی ممتاز، رعب دار اور خوش نصیب ہوگا، اس کی قسمت بھی اتنی ہی بلند اور عظمت دلانے والی ہوگی۔ وہ بھی فاتح اعظم کہلائے گا۔ لوگوں کے دلوں اور قسمتوں پر راج کرے گا۔

فاتح تو وہ بھی تھے۔ لوگوں کے دلوں دماغوں پر ان کا بھی راج تھا۔ ان کی لکھی ہوئی تقریروں پر لاکھوں تالیاں بجی تھیں۔ ان کے چنے جملوں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے لیکن ہمیشہ ہی نام کسی دوسرے کا ہوتا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ ان کی تحریر پر ہوتی لیکن ہار پہنائے جانے والی گردنیں کسی اور کی ہوتیں، کوئی اور چہرہ ہی مسکراتے ہوئے، سر جھکائے، نمرتا سے ہاتھ جوڑے سامعین سے داد پاتا۔ ہزاروں کی تعداد میں تعریف اور مبارک باد سے بھرپور خط جو انہیں ملنے چاہیئے تھے وہ کسی اور کا ہی نصیب ہوتے۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی تھی یا نہ جانے قادرِ مطلق سے یہ غلطی انجانے میں یا دانستہ طور پر ہوئی تھی۔ کسی جیوتشی نے ایک بچے کی پیدائش پر پیشین گوئی کی تھی کہ بڑا ہونے پر اس کے چاروں طرف موٹریں گھوما کریں گی۔ تقدیر نے اسے چوراہے کا ٹریفک سپاہی بنا دیا۔ اس کے چاروں طرف موٹریں گھومنے لگیں۔ پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی۔ سکندر رنجیت کو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے والدین کی قیاس آرائیاں بھی بالکل اسی طرح اُن کے بارے میں سچ ثابت ہو رہی ہوں۔

سکندر رنجیت نے اپنے سرپرست سیاسی نیتا کی تقریر لکھتے ہوئے اپنے تازہ تحریر شدہ جملوں کو ایک بار پھر پڑھا۔ انہیں زیرِ لب دوہرایا۔ وہ اطمینان سے مسکرا دیے۔ انہیں یقین تھا کہ اس مقام پر ان جملوں کا سواگت تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ہوگا۔ جملے کچھ اس طرح سے تھے:

"قوموں کا مقدر صرف الفاظ سے نہیں بدلا جاتا۔ اس کے لئے مصمم ارادہ، محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے عملی تعاون، کچھ کرنے اور مرنے کی ضرورت ہے۔۔۔ اور ہم اس دیش کے باسی جب ارادہ کر لیتے ہیں تو قدم پیچھے ہٹانا نہیں جانتے!"

اور پھر انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے لاکھوں کا ٹھاٹھیں مارتا مجمع دکھائی دیا۔ اور پھر انہیں اپنے کانوں میں تالیوں کا بے پناہ شور سنائی دیا۔ ایسی تالیاں کسی CHEER لیڈر کی ابتدا کرنے والی تالیوں کی محتاج نہ ہوں گی بلکہ مجمع کے دلوں کو جوش اور ولولوں سے

پھر تو انہیں خود بخود تالیاں بجانے پر مجبور کر دیں گی۔ ایک اطمینان بھری مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔ چہرہ فخر سے تمتما اٹھا — اور پھر اچانک ان کا اپنا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اُس وقت خود کہاں ہوں گے، اسٹیج پر نہیں بلکہ ہجوم میں، اپنی ہی لکھی ہوئی تحریر پر ہجوم کے ساتھ تالیاں بجانے پر مجبور... ! وہ سیاسی نیتا مسکراتے ہوئے، فخریہ نگاہوں سے ہجوم کا مسحور کُن جائزہ لے گا اور پھر ان کی لکھی ہوئی تقریر پر فخر کا سا احساس ادا کرنے میں جُٹ جائے گا !

انہوں نے سر کو جھنجھوڑا جیسے وہ یہ منظر اپنے دماغ سے جھٹک دینا چاہتے ہوں۔ انہیں کوفت ہو رہی تھی اس سیاسی نیتا کی اداکاری پر جو پرائے دل کو اپنا بنا کر لوگوں کے دل لوٹ رہا ہو۔ دراصل یہ حق تو ان کا ہونا چاہیئے تھا۔ کیا ان میں اتنا حوصلہ تھا، طاقت تھی کہ وہ خود اسٹیج پر آکر اپنے بھاشنوں کو خود لوگوں تک پہنچا سکیں ؟ اتنے میں پاس رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے بے دلی سے ٹیلی فون کا چونگا اٹھا لیا۔ اور اس میں میکانکی طور پر 'ہیلو' کا لفظ پھونک دیا۔

"کون، سکندر بخت جی ؟" دوسری طرف سے سیاسی نیتا کے پی۔ اے۔ مکل جی کی آواز آرہی تھی۔ "بھئی وہ اگلے ہفتے والی نمائش کا بھاشن آپ نے لکھ لیا ہے ؟"

"اسی پر کام ہو رہا ہے مکل جی ! اس بھاشن کے لئے لائبریری سے کئی کتابیں دیکھنا ضروری تھا۔ آپ اطمینان رکھئے۔ دو تین روز میں مسودہ پہنچ جائے گا !"

"ہاں بھئی، ذرا جلدی ہی بھجوا دو۔ تم تو جانتے ہی ہو ہمارے نیتا جی اپنی تقریروں کی ادائیگی پر کتنی محنت کرتے ہیں — اور پھر یہ بھاشن تو بہت ہی اہم ہے !"

ٹیلی فون بند ہو گیا۔

کتنی محنت کرتے ہیں نیتا جی اپنے بھاشنوں پر ! اونہہ... وہ مسکرا دیئے۔ اور یہ محنت کرانے کی طاقت کس میں تھی۔ ان کے سہانے جادو بھرے ڈرامائی الفاظ میں ! فنِ خطابت میں ! ان کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ بھاشن دینے والا تو صرف اداکار تھا۔ کھوکھلا، بے جان بھاشا بادہ سے عاری اس کی حیثیت تو ایک سجی دھجی کٹھ پتلی کی سی تھی جسے ان کے الفاظ کی ڈور ہی حرکت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

شروع شروع میں وہ جب کبھی نیتا جی کے لئے تقریر تیار کر کے لے جاتے تو وہ نہ صرف اُسے پڑھنے کے لئے ہی کہتے بلکہ اس انداز میں پڑھنے کے لئے کہتے جیسے اُسے جنتا کے سامنے پڑھا جانا چاہیئے تھا۔ آواز کا زیر و بم، ہاتھوں اور چہرے کی حرکات و سکنات کو وہ بڑے غور سے دیکھتے اور پھر وہ انہیں تقریر کرتے وقت اپنی شخصیت میں ڈھال لیتے۔ اب تو وہ اس فن کے ماہر ہو چکے تھے۔

تقریر نگاری میں نیتا جی کی ایک جدت ضرور تھی۔ تقریر کرتے وقت ان کا ایک CHEER لیڈر ضرور ہوتا جو تقریر کے اہم مقامات پر تالیاں بجا کر لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دیتا۔ جب اس کی تالیوں میں لوگوں کی تالیوں کی گونج شامل ہو جاتی تو ایک سماں ہی بندھ جاتا۔ ان تالیوں کا شور نیتا جی کی نشہ آور حوصلہ افزائی کرتا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے تقریر کرنے لگتے۔ اس ضرورت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے سکندر بخت تقریروں میں صحیح مقامات پر وقفوں کی گنجائش پیدا کر دیتے۔

اصل خالق تو وہ تھے ان تقریروں کے — وہ ! لیکن یہ کون جانتا تھا ! انہیں اپنی تقریروں کے عوض بہت معقول معاوضہ ملتا تھا۔ زندگی کی تمام آسائشیں انہیں مہیا تھیں — ایک باشعور محبت کرنے والی بیوی، پیارے پیارے بچے، چھوٹا سا مگر خوش نما مکان۔ اسکوٹر۔ وہ چاہتے تو کوئی سیکنڈ ہینڈ کار بھی خرید سکتے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی میں ایک خلا تھا، ایک کبھی نہ ختم ہونے والی خلش، ایک ذہنی ناآسودگی ! زندگی میں وہ ایک ایسے صحافی تھے جن کی کوئی پہچان نہ تھی۔ اس طرح کی تقریریں لکھنے کے لئے صرف ایک

پابندی تھی — گمنام رہنے کی۔ کچھ ساتھی جانتے بھی تھے کہ وہ سیاسی تقریریں لکھتے ہیں لیکن وہ کبھی بھی ان کی زبان سے اس کی تائید یا تردید نہ سن سکے۔ سب سے بڑی حیرت کی بات یہ تھی کہ کبھی کبھار وہ متضاد پارٹیوں کے نیتاؤں کے لئے بھی لکھتے تھے۔ ان کے سرپرست نیتا ان سے پوچھ بھی نہ سکتے تھے کہ وہ کن کن کے لئے لکھتے تھے۔ ایسے پیشے میں اس قسم کے سوالات کا کوئی گزر نہ تھا۔ گمنامی کا یہی پہلو ان کے لئے باعث تسکین تھا۔

جب کبھی ایک شدید خواہش کہ ان کی بھی پہچان بن، سر اٹھاتی تو وہ بے بس ہو جاتے۔ اس کا صرف ایک طریقہ ان کی سمجھ میں آتا کہ وہ خود بھی ایک سیاسی نیتا بن جائیں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ خود کسی سیاسی پلیٹ فارم سے تقریریں کرنا شروع کریں تاکہ وہ اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کا سکہ منوا سکیں۔ انہوں نے مکل جی سے ایک بار ذکر کیا تھا کہ وہ انہیں کسی سیاسی میٹنگ میں بولنے کا موقع دلوا دیں۔ مکل جی کا کہنا تھا کہ انہیں کسی ایسی میٹنگ میں ہی شامل ہونا چاہئے تھا جہاں نیتا جی خود تقریر نہ کر رہے ہوں۔ سکندر بخت خود بھی یہی چاہتے تھے لیکن بھی پہلے تو کئی بار ٹالتے رہے لیکن پھر سکندر بخت کے پیہم اصرار پر انہوں نے ایک موقع دلوا ہی دیا۔

رام لیلا میدان، ناحیین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب نامور سیاسی نیتا تقریر کر چکے تھے کچھ باقی رہ گئے تھے۔ ان میں سکندر بخت بھی تھے۔ ان کا تعارف ایک نئے ابھرتے نیتا کے طور پر کروایا گیا۔ تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سب طرف گھوم کر مجمع کے سامنے ہاتھ جوڑے اور پھر مسکراتے ہوئے نہایت شستہ الفاظ میں اپنی تقریر شروع کی۔

یہ تقریر انہوں نے بڑی محنت سے لکھی تھی۔ یقینی طور پر انہوں نے کئی کتابیں پڑھ کر بڑے غور و فکر سے اپنے مواد کو سجایا تھا۔ انہوں نے فن خطابت کے تمام حربے اس تقریر میں استعمال کئے تھے۔ چنے تلے جملے، جوش دلانے والے الفاظ اور شعر، دل چسپی پیدا کرنے کے لئے کچھ مذاق اور لطیفے، سلیس زبان اور محاورے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ تقریر دوسروں کے لئے لکھی گئی تقریروں سے کہیں بہتر تھی۔ وہ ان وقفوں پر بھی دانستہ رکے جہاں تالیاں بجنے کے امکانات رہتے ہیں۔ لیکن مجمع کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کہیں بھی تالیوں کی گڑگڑاہٹ نے ان کا سواگت نہیں کیا۔ کوئی ان کے مذاق پر مسکرایا تک نہیں۔ تقریر دل چسپی سے ضرور سنی گئی لیکن اس کا وہ سواگت نہیں ہوا جو ان کی لکھی تقریروں کا ہوا کرتا تھا۔ تقریر میں وہی خوبیاں تھیں لیکن مقرر کا چہرہ دوسرا ضرور تھا۔ تقریر ختم ہونے کے بعد رسمی تالیاں ضرور بجائی گئیں۔ اسٹیج پر بیٹھے دوسرے ساتھیوں نے اُسے دبے لفظوں سے سراہا اور یہ امید بھی ظاہر کی کہ وہ آئندہ سالوں میں مزید ترقی کریں گے۔

سکندر بخت کا سالوں سال کا ابھرتا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ ان کا وہی ذہن، وہی قلم تھا لیکن کہیں کوئی فرق ضرور رہ گیا تھا۔ گمنامی سے پہچان کے سفر تک شاید کچھ منزلیں ایسی بھی تھیں جو ابھی تک ان کی دسترس سے باہر تھیں۔ وہ بالکل مرجھا گئے۔ سکندر کی تقدیر اور سکندر بخت کے درمیان ابھی بھی بہت فاصلے حائل تھے۔


"کیا آج
آپ نے دانت
میکلینس
کیے؟"
"ہر روز
دو بار"
FLUORIDE + CALCIUM G.P
macleans
macleans
میکلینس
کیلشیئم اور فلورائیڈ کے ساتھ۔
دُنیا بھر میں دانتوں کی مکمل ترین حفاظت!
8 3 87
ASIATIC



سلیم اختر

احمق کٹھ پتلی

اور پھر چلتے چلتے وہ ایک ایسے جنگل میں آ پہنچا جہاں کی فضا میں رنگوں کی چہکاریاں اور جھونکوں کے دامن خوشبو سے بھرے تھے۔ آسمان نیلا تھا مگر اس کی نیلاہٹ چمک کا کچھ اور ہی انداز لئے تھی۔ گھاس سبز تھی مگر اس کی ہریالی اپنے اندر الگ بہار لئے تھے۔ سرکشیدہ درختوں کے سڈول تنوں میں عجب زیبائش اور گرمی سی تھی۔ کومل پتوں سے سجی شاخیں یوں پھیلیں گویا بازوؤں میں لینے کو تیار ہوں ——

وہ کسی درخت کی مانند ٹھٹھکا کھڑا رہ گیا !

یہ کیا جنگل تھا ؟ یہ کیسی فضا تھی ؟ یہ کیسی باس تھی ؟

اس نے درخت کے کومل تنے پر ہاتھ پھیرا تو اسے تن کی طرح دھڑکتا پایا۔ اسے اپنے پھیلے ہاتھوں کے نیچے درخت کی رگوں میں خون کی گردش محسوس ہو رہی تھی۔ درخت جیسے اس کے لمس سے لرز رہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک درخت کے تنے سے لپٹا ہوا کی سرگوشیاں سنتا رہا۔ اور تب اسے احساس ہو گیا کہ اس کی راہ سفر ختم ہو گئی اور یہ جنگل اور یہ درخت اس کی منزل ہے۔

اس نے ایک ایک کر کے اوزار سنبھالے اور درخت کاٹنا شروع کیا وہ اس احتیاط سے کام کر رہا تھا گویا اپنا جسم کاٹ رہا ہو۔

اب جب کہ وہ منزل تک پہنچ چکا تھا اور اپنے مقصد کی تکمیل میں محو تھا تو اس کی بے چینی اور اضطراب بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب صرف کام کا انہماک تھا۔

اس کے مشاق ہاتھ اور نازک اوزار لکڑی کے سڈول ٹکڑے الٹ پلٹ رہے تھے۔ پہلے سر بنا، پھر گردن، پھر بازو، دھڑ اور ٹانگیں — اور جسم تیار تھا۔ تب اس نے نہایت محنت سے موٹی موٹی آنکھیں، ابھری ناک اور بھرے بھرے ہونٹ بنائے۔

دن ختم ہونے کو آیا۔ شام کے سائے پھیلتے گئے۔ رات کے آرام سے پہلے پنچھی آخری مرتبہ بول رہے تھے۔ پروائی میں گھل کر جنگل کی باس گویا لوری دے رہی تھی۔ مگر وہ چاہتے ہوئے بھی سونے سے قاصر تھا۔ وہ چاند کی روشنی میں رات بھر کام میں مگن رہا۔ اس نے کیکر کے کوئلے کی سیاہی کو گوند میں گھول کر اس کی بھنورا سی آنکھیں بنائیں۔ اس نے مکئی کے بھٹے سے سنہری بال لئے اور انہیں اس کے سر پہ سونے کے تاج کی مانند سجا دیا۔ اس نے گلاب سے سرخی لے کر اس کے ہونٹوں پہ لالی سجا دی

چاند رات بھر یہ منظر دیکھتا رہا اور وہ رات بھر کام کرتا رہا۔ اور جب سورج کی پہلی کرن سنہری بالوں پہ ناچی تو وہ کام ختم کر چکا تھا۔ مگر مسلسل کام کی تھکن کی بجائے وہ عجب سرشاری کے عالم میں تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا —— اس کا شاہکار مکمل تھا۔

وہ ایسی کٹھ پتلی بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا جو سچ مچ کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا گویا وہ انگڑائی لے کر اور بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر اپنے بکھرے ہوئے سنہری بال سمیٹ کر گردن کے پیچھے کرے گی۔ وہ اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ گویا اس سے پہلی مرتبہ ملا ہو۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ آواز سُن کر اچھل پڑا۔ کیا درخت بولا تھا یا ہوا؟ مگر نہیں، یہ وہ تھی۔ اُسے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ وہ اُسے منہ کھولے دیکھتا رہ گیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے پھر پوچھا۔

"تمہیں"

"مجھے ——؟"

"ہاں ہاں تمہیں"

"مگر کیوں؟ مجھے تو تم نے ہی بنایا ہے"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر . . . . ." اس نے خود کو اس کی سحر زدہ سی سیاہ آنکھوں کی گہرائی میں گم ہوتے پایا۔ اور فقرہ ادھورا رہ گیا۔

وہ آہستگی سے بولی۔ "تم نے مجھے کیوں بنایا؟"

"میرے ذہن میں تمہاری تصویر تھی۔ اور یہ تصویر ایسی مکمل تھی کہ میں تمہیں ہر وقت ساتھ پاتا۔ اپنے قریب محسوس کرتا۔ حتیٰ کہ میں کام کاج کے قابل بھی نہ رہا۔ اور تب میں نے ارادہ کرلیا کہ میں تمہیں بناؤں گا اور تم ایسی مکمل ہوگی کہ دنیا دیکھے گی"

"کیا میں مکمل ہوں؟"

"ہاں! تم ہر لحاظ سے مکمل ہو"

وہ کچھ دیر خاموش رہی گویا اس کی بات کا مطلب سمجھ رہی ہو۔ پھر بولی۔

"مگر میں ہوں کون؟"

وہ ہنسا۔ "بھئی! تم ایک کٹھ پتلی ہو"

"کٹھ پتلی؟" اس نے غیر یقینی لہجہ میں دُہرایا۔

"ہاں ہاں! کٹھ پتلی"

"مگر یہ کٹھ پتلی کیا ہوتی ہے؟"

"اب میں تمہیں یہ سب کیسے سمجھاؤں؟ دیکھو! اسے یوں سمجھو۔ تمہیں میں نے اس درخت کی لکڑی سے بنایا ہے۔ میں نے بنایا ہے۔ میں نے! —— سمجھ گئی؟"

"ہاں، اتنا تو سمجھ گئی۔ مگر اب جب کہ میں بن گئی ہوں تو میرا بنے گا کیا؟"

بنے گا کیا: ارے بھئی، تم ناچو گی"

"ناچوں گی مگر کیوں ——؟"

"بھئی، تم کٹھ پتلی جو ہو اور میں نے تمہیں بنایا جو ہے"

وہ کچھ دیر تک پھر خاموش رہی۔ گویا اس نئی اطلاع پر غور کر رہی ہو۔ پھر بولی۔

"اگر میں ناچنا نہ چاہوں، تو؟"

"مگر اس میں تمہاری مرضی کو کوئی دخل نہیں۔"

"کیوں، ناچنا تو میں نے ہے، ہے نا؟"

"مگر تمہاری ڈور تو میرے ہاتھ میں ہوگی، اس لئے جس طرح میں ڈور ہلاؤں گا تم اس طرح ناچو گی۔ ناچو گی کیا۔ ناچنے پر مجبور ہو گی
یہ سن کر جیسے وہ سناٹے میں آگئی۔ "تو یہ بات ہے؟"

"ہاں یہ بات ہے۔"

"مگر ایسا کیوں؟"

"ایسا اس لئے کہ ہم کٹھ پتلی نچانے والے ہیں۔ یہ ہمارا پیشہ ہے۔ تمہیں نہ نچائیں تو روٹی کہاں سے کھائیں؟"

"تو ہم صرف روٹی کمانے کا ذریعہ ہیں؟"

"بالکل!"

"ان سنہری بالوں اور ان سیاہ آنکھوں کے باوجود؟"

"ان سنہری بالوں اور کالی آنکھوں کی وجہ سے تو اور بھی زیادہ لوگ تماشا دیکھنے آئیں گے۔"

"مگر میں کٹھ پتلی بن کر ناچنا نہیں چاہتی! اپنی مرضی سے اور اپنی خوشی سے ناچنا اور بات ہے مگر ڈور سے بندھ کر ناچنا مجھے پسند نہیں ــــ میرے لئے کچھ اور سوچو!"

"یہ تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں!"

وہ خاموشی سے سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر بولا: "ایک صورت ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ تمہاری صورت بھی بہت اچھی ہے۔ اس لئے میں تمہیں اپنی بیوی بنا سکتا ہوں۔"

"بیوی!" وہ بولی: "یہ ایک اجنبی لفظ ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟"

"بیوی ــــ بیوی ــــ بس بیوی بیوی ہوتی ہے۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"دیکھو بھئی، عورت اور مرد کیونکہ اکٹھے نہیں رہ سکتے اس لئے وہ خاوند اور بیوی بن کر رہتے ہیں۔"

"اوہ!"

"ہاں!"

"اور بیوی بن کر مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"ڈور سے ناچنا تو نہیں پڑے گا؟"

"ہرگز نہیں۔ بیوی اور کٹھ پتلی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ مگر بیوی کس کام آتی ہے ؟"
"کسی کام نہیں آتی۔ بس خاوند اپنی بیویوں سے پیار کرتے ہیں"
"تم بھی پیار کرو گے ؟"
"ہاں، کیوں نہیں۔ میں تمہیں اچھے اچھے کپڑے سلوا کر دوں گا۔ میں تمہارے لئے سونے اور چاندی کے گہنے لاؤں گا۔ میں تمہیں اچھے سے گھر میں رکھوں گا"
"اور تم ـــ تم اس گھر میں نہیں رہو گے ؟"
"میں بھی وہیں رہوں گا۔ میں سارے دن کے کام کاج، محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد شام کو گھر ہی میں تو آؤں گا"
"اچھا ! اور پھر ؟"
"پھر کچھ بھی نہیں۔ بس تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ گھر کو اچھی طرح سے صاف ستھرا رکھو"
"وہ کیوں ؟"
"بھئی تم بیوی جو ٹھہریں"
"اچھا ! اور کیا کیا کرنا ہوگا ؟"
"کچھ نہیں۔ بس کھانا پکا کر گرم رکھنا تاکہ جب میں تھکا ہارا گھر آؤں تو مجھے گرم گرم کھانا ملے"
"وہ کیوں ؟"
"بھئی تم بیوی جو ٹھہریں"
"اچھا ! اور کیا کیا کرنا ہوگا ؟"
"کچھ نہیں، بس کبھی کبھی ـــ میرا مطلب ہے کہ بعض راتوں کو . . . . ."
"وہ کیوں ؟"
"بھئی تم بیوی جو ٹھہریں"
"اچھا ! اور کیا کیا کرنا ہوگا ؟"
"کچھ نہیں۔ بس جب بچے پیدا ہوں گے تو ان کی دیکھ بھال اور پرورش . . . . ."
"اور . . . . ؟"
"پھر اور بچے . . . ."
"اور ؟"
"اور شاید پھر اور بچے . . . ."
"کب تک ؟"
"عمر بھر !"
وہ ایک دم چیخ کر بولی : "میں بیوی نہیں بنتی۔ میں بیوی نہیں بنتی"
"مگر کیوں ؟"

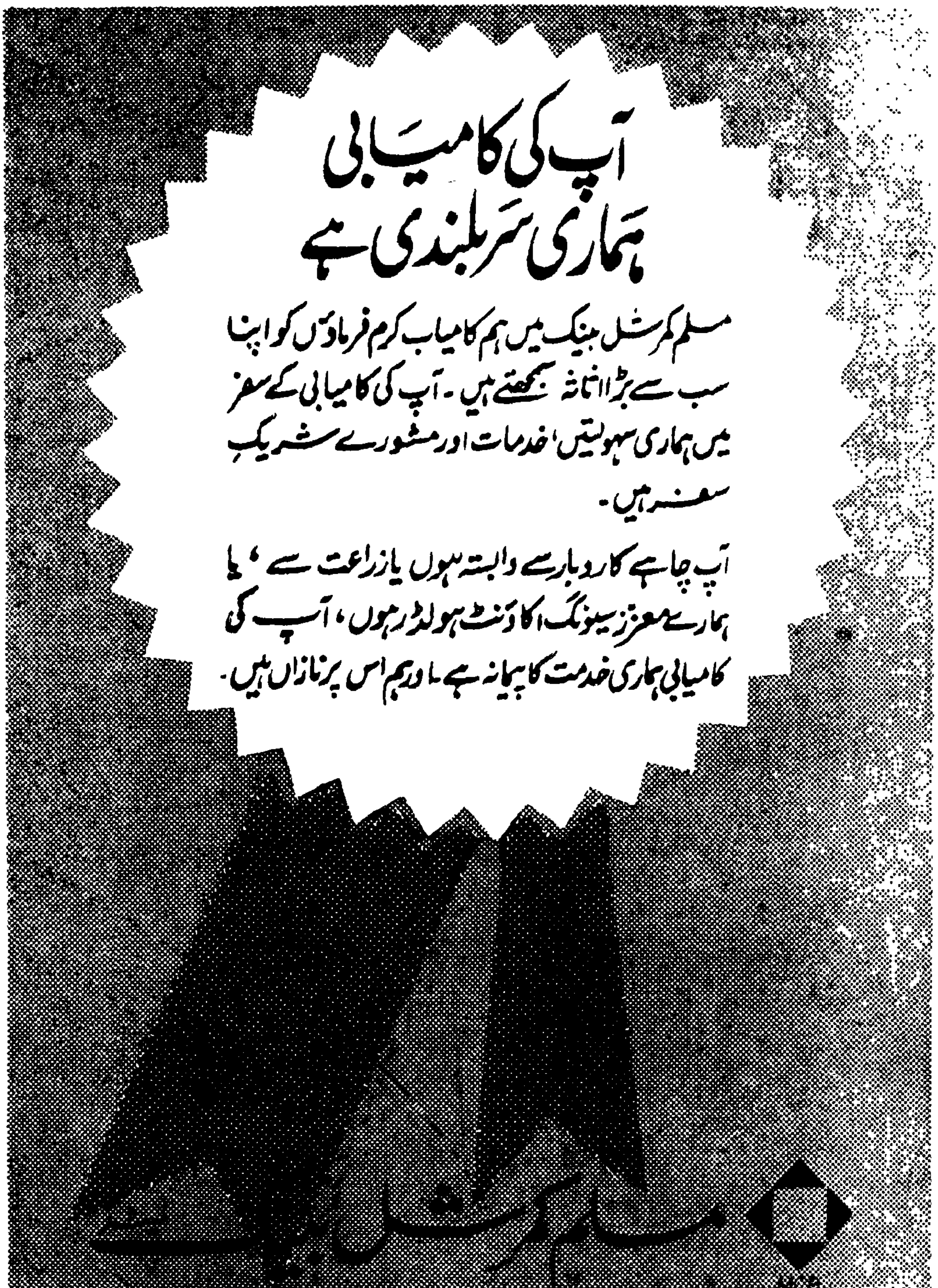
"یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔"

اب وہ بھی غصہ میں بولا۔ "احمق کٹھ پتلی۔ تو شاید جانتی نہیں کہ اپنی بیوی بنا کر میں تمہیں کتنی بڑی عزت دے رہا ہوں۔"

"نہیں! مجھے اپنی زندگی اور آزادی کی قیمت دے کر عزت کا یہ سودا منظور نہیں ہے۔"

وہ اب غصہ کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ "تمہیں پتہ نہیں تم کس سے بات کر رہی ہو؟ مت بھولو کہ میں نے تمہیں بنایا ہے۔"

کٹھ پتلی نے کچھ کہنے کو منہ کھولا، مگر کاٹھ کا منہ نہ کھل سکا۔ اس نے پلکیں جھپکا کر آنکھوں میں آئے آنسو بہانا چاہے مگر کاٹھ کی آنکھوں میں آنسو کہاں؟


آپ کی کامیابی
ہماری سربلندی ہے
مسلم کمرشل بینک میں ہم کامیاب کرم فرماؤں کو اپنا سب سے بڑا اثاثہ سمجھتے ہیں۔ آپ کی کامیابی کے سفر میں ہماری سہولتیں، خدمات اور مشورے شریک سفر ہیں۔
آپ چاہے کاروبار سے وابستہ ہوں یا زراعت سے، یا ہمارے معزز سیونگ اکاؤنٹ ہولڈر رہوں، آپ کی کامیابی ہماری خدمت کا پیمانہ ہے۔ اور ہم اس پر نازاں ہیں۔
مسلم کمرشل بینک
MCB



مشرف احمد

گمشدگی

رات کی تاریکی میں گھر کے سامنے اُگے ہوئے درخت کے پتّوں سے پرے مجھے مسجد کا ساری رات روشن رہنے والا مینار نظر آتا رہتا ہے۔ جب بھی میں گھر کے اس حصے میں آکر کھڑا ہوتا ہوں، مسجد کے مینار سے نظر آنے والی سبز روشنی کا احساس مجھے ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے۔ تاریکی میں یہ سبز روشنی ایک بڑے سے سیاہ فریم میں جڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

میں مسجد کے قریب ہی رہتا ہوں۔ اتنا قریب کہ جب گھر میں ہوں تو اذان کی آوازیں اور دوسرے اعلان بہت واضح انداز میں سنتا ہوں اور حسب توفیق نماز پڑھنے بھی چلا جاتا ہوں۔

مسجد سے نشر ہونے والے اعلانات میں کبھی کبھی اور بعض دنوں میں جلدی جلدی گم شدہ بچوں کے بارے میں بھی اعلانات ہوتے رہتے ہیں۔ میں بھی یہ اعلان سنتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی خوف کی ایک لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ اس وقت میں سوچتا ہوں کہ کاش میرا گھر مسجد سے اتنے فاصلے پر ہوتا کہ میں ایسے اعلانات کو کبھی نہ سن سکتا۔ میں تو مسجد سے دور چلے جانے کے بارے میں سوچتا ہوں مگر میری خوش قسمتی پر مطمئن ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ تو مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر ہی رہتے ہیں، پابندی سے آیا کیجئے۔ کم سے کم اہل محلہ کی خیریت سے تو آگاہ ہوتے رہا کریں گے۔ اور اس لمحے مجھے وہ سبز روشنی یاد آتی ہے جس کا دائرہ اور سیاہ فریم آپس میں ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی ایک خاموش کشمکش میں مصروف نظر آتے ہیں۔

آج بھی عشا کی نماز ختم ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے، اتنی دیر کہ جب کسی نمازی کے آنے کی امید نہیں رہتی اور اندرونی حصے کے تمام دروازے بند کئے جا چکے ہیں۔ مینار سے پھیلتی ہوئی قائم و دائم سبز روشنی درخت کے پتوں سے چھن چھن کر مجھے نظر آرہی ہے۔ اور کسی قسم کا اعلان کرنے سے پہلے لاؤڈ اسپیکر کو درست کرنے اور آواز دور دور تک پہنچانے کے لئے ابتدائی کوششوں کے نتیجے میں جو کھڑکھڑاہٹ سی پیدا ہوتی ہے وہ مجھے صاف سنائی دے رہی ہے۔ یہ آواز جو کسی اعلان کا پیش خیمہ ہے اور اس وقت عشا کی نماز ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے، اعلان کی یہ تیاری اپنے اندر ایک ایسی دہشت رکھتی ہے کہ میں نے گو ابھی حال نہیں سنا ہے مگر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ میں گھر میں کہیں بھی بیٹھا ہوں اعلان کرنے کی یہ ابتدائی کوشش بھی مجھ تک پہنچ جاتی ہے۔

ایک اور خبر ..... میں روشنی کی طرف دیکھتا ہوں اور مجھے سیاہ فریم اپنے درمیان جڑی روشن تصویر کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے اور میں سوچتا ہوں ــــ

"خدا کرے وہ کسی منحوس خبر کا اعلان نہ کریں۔ تاکہ سب کچھ اپنی اپنی جگہ پر قائم رہے اور میں رات کو سو سکوں۔ اس گھبراہٹ اور اضطراب کے لمحے میں میں دعا مانگتا ہوں کہ خدا کرے اس وقت وہ کسی کے انتقال کی خبر نشر کرنے والے ہوں اور اگر وہ ایسا اعلان کر دیں گے تو میرے اضطراب و بے چینی میں اسی وقت کمی آجائے گی اور میں مرنے والے کے لواحقین سے دل ہی دل میں اظہارِ ہمدردی کرنے کے بعد خدا کا شکر کروں گا کہ میں ایک بُری خبر سننے سے بچ گیا ہوں۔"

لیکن اگر یہ اعلان گم شدگی کا ہوا تو میں خود کو اسی لمحے سے گہری تاریکی کے درمیان پاؤں گا۔ ابھی ابھی وہ ابتدائی کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی ہے اور میں اپنے سارے اندیشوں، واہموں اور خوف کے ساتھ اسے سننے میں مصروف ہو گیا ہوں۔

"حضرات، ایک اعلان سنئے! ایک بچّی۔۔۔۔" وہ نام بھی بتا رہے ہیں۔ مگر میں نام پر غور نہیں کرتا۔ کیوں کہ مجھے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ اس بچّی یا بچے کا جو نام بھی تھا، اب ختم ہو چکا ہے اور صرف ایک ہی نام باقی رہ گیا ہے "گم شدگی۔۔۔" پھر اعلان کرنے والا بہت سی تفصیلات بتاتا ہے جو اُسے بتانے والے نے اس امید پر بتائی ہوں گی کہ ان میں سے کوئی نشانی تو کھو جانے والے کو پا لینے کا سبب بنے گی۔ بچے ہم سے کتنے قریب ہوتے ہیں، ہم ان کے چہروں کے خدوخال، رنگت، ان کے کپڑوں کے رنگ اور ان کے جوتوں کے تسمے کس انداز میں باندھے گئے تھے اور یہ کہ جدائی سے پہلے اس نے آخری لمحوں میں کیا باتیں کی تھیں، یہ سب کچھ یاد رکھتے اور بتا سکتے ہیں اور پھر یہ یاد ساری زندگی پر محیط ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تاریکی نے پھر روشنی پر یلغار کی ہے اور آج ایک اور پودا اپنی جڑ سے اکھڑ گیا ہے اور خوف مجھے آگھیرتا ہے۔ بچے اگر راستہ بھول جاتے ہوں تو پھر ان کا ملنا، چاہے وہ ہزاروں میل دور ہی کیوں نہ نکل گئے ہوں، کوئی دشوار نہیں ہوتا۔ مگر راستے کے اندھیرے جنھیں ہڑپ کر لیتے ہوں وہ دوبارہ کہاں ملتے ہیں؟

وہ تو کئی بار اعلان کر کے خاموش ہو گئے ہیں۔ اور اب ایک مغموم گھرانے کا خیال مجھے آگھیرتا ہے۔ درختوں سے چھن چھن کر نظر آنے والی مینار کی روشنی اب مجھ تک نہیں پہنچ پا رہی ہے۔ بس چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔

اس تاریکی میں مجھے اس گھر کی تصویر اور زیادہ واضح اور روشن نظر آ رہی ہے۔ گھر میں پھیلی ہوئی اُداسی، غم سے نڈھال ماں اور سہمے ہوئے اور جانے والے کو یاد کرتے ہوئے بچے بڑے سب لوگ۔ اور ایک شخص دلاسا دیتا ہوا "اللہ بہتر کرے گا۔ مسجد سے اعلان تو کرا دیا ہے۔" اور ماں کی رُندھی ہوئی آواز جو پھر بار بار اپنے دل کی تسلی کے لئے یہ سوال کرتی ہے "تم نے یہ تو اعلان کرا دیا تھا کہ اس نے کپڑے کون سے رنگ کے پہنے ہوئے ہیں تاکہ اُسے تلاش کرنے اور پہچاننے میں آسانی ہو۔"

چند لمحوں کے وقفے سے بار بار دُہرائے جانے والا یہ اعلان اتنا بلند آہنگ اور زُود اثر تھا کہ اس نے آسمان و زمین کو ایک بچے کی گم شدگی کے سوگ میں مبتلا کر دیا ہے۔

گلیوں اور محلّوں میں رات کا سناٹا اور گہرا ہو گیا ہے اور مجھے وہ بچے اور بڑے یاد آ رہے ہیں جن کے اعضا مسخ ہیں اور جو اپنے وجود سے گم شدگی کی ایک بڑی سی تصویر بنائے شہر کی سڑکوں اور چورستوں پر پڑے رہتے ہیں۔

اس بڑی تصویر کے ایک جزو کو میں روز دفتر سے آتے جاتے اپنی بس کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ یہ نہیں کہ اب اس بڑی تصویر کا ایک حصہ وہاں سے چلا گیا ہے بلکہ وہ اب بھی وہاں موجود ہے۔ بڑی سی تصویر کا وہ ایک حصہ۔

اس طویل راستے کے ایک موڑ پر بس والا بہت دیر تک سواریوں کے انتظار میں بس کو ٹھہرائے رکھتا ہے۔ یہاں مسافر بھی بہت ہوتے ہیں مگر ان کے علاوہ دو بچیاں بھی یہاں ہیں جو بس کے ٹھہرتے ہی کھڑکیوں کے پاس آ جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک بچّی ہاتھ پاؤں سے تندرست

اور آنکھوں والی ہے۔ جب کہ دوسری بچی نابینا ہے۔ ٹھہریئے! وہ صرف نابینا ہی نہیں ہے، تیزاب سے اس کا سارا چہرہ اور آدھا سر بری طرح جلا ہوا ہے۔ ابتدا میں جب وہ مجھے وہاں نظر آئیں تو میں آتے جاتے ان کو ضرور دیکھا کرتا تھا۔ ان کے انداز میں ایک لگی بندھی کیفیت تھی۔ دونوں سڑک کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوئی ہوتیں اور بس رکتے ہی اندھی بچی کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں والی بچی اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی لاتی۔ اس بچی کے پاؤں ننگے اور مٹی میں اَٹے ہوئے ہونے کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ کبھی جوتوں سے آشنا تھے۔ ذرا سا غور سے دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دونوں بچیوں میں آپس میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔

ابتدا میں میں اسے دیکھا کرتا تھا اور لرز لرز جاتا تھا۔ میرا جی کبھی اس بچی کو خیرات دینے کو نہ چاہا۔ بلکہ میں تو اسے ٹافیاں دینا چاہتا تھا۔ اس کے جلے ہوئے ماتھے پر جو سر کے بال جل جانے کی وجہ سے آدھے سر تک پھیلا ہوا تھا کوئی خوبصورت ربن باندھنا چاہتا تھا۔ اے کاش۔ میں یہ سب کچھ کر سکتا!

روزانہ آتے جاتے میں بہت دنوں تک طرح طرح کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ میرے ذہن میں کئی نام آئے جن کو میں اس کے سلسلے میں خط لکھنا چاہتا تھا مگر پھر سوچتا کہ وہ تو اتنا مصروف ہیں کہ شاید اُن کے پاس میرا خط پڑھنے کا وقت ہی نہ ہو!

ہر طرف سے مایوس ہو کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھ سمیت سب لوگ اپنی اپنی جگہ گم ہیں اور سڑکوں کو بھی ایک پُراسرار خاموشی نے گھیر رکھا ہے۔ پھر میں نے اس مقام تک پہنچنے سے پہلے اپنی آنکھیں بند کر لینے کی عادت اپنالی۔ اور یوں اس راستے سے آنے جانے کے باوجود میں اس دل دوز منظر کو دیکھنے سے بچ جاتا ہوں۔

مسجد سے نشر ہونے والے اس اعلان کے ساتھ ہی چیزیں اپنی معنویت بدلتی جا رہی ہیں۔ آسمان پر جگر جگر کرتے تارے اور مینار کی روشنی سب کچھ تاریکی میں تبدیل ہو چکی ہے اور پتوں کی آواز مجھے نوحے اور گریہ وزاری میں بدلتی محسوس ہو رہی ہے۔

رات کے اس سمے جب ہر طرف خاموشی ہے اور گھروں کے بیرونی حصوں میں لگے ہوئے برقی قمقمے بھی تاریکی میں تبدیل ہو چکے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ کائنات آدمی کی گم شدگی کو سب سے زیادہ محسوس کرتی ہے۔

ساری رات جاگتے ہوئے گزر گئی ہے۔ میں ایک موہوم سی خواہش کے ساتھ جاگتا رہا ہوں کہ شاید وہ بچی کی واپسی کا بھی اعلان کر دیں گے اور سب چیزیں اپنی پہلی حالت پر آجائیں گی اور روشنی پھیل جائے گی۔ پھر مجھے راستے، بس اسٹاپ، وہ اندھی لڑکی یاد آتی ہے اور یہ سب مل کر اس اعلان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ روشنی اسی طرح تاریکی کے حصار میں ہے۔

ساری رات کا جاگا ہوا میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر وقت مقرر ہو تو میں راستے سے گزرتے ہوئے اپنی آنکھیں تو بند کرتا ہی ہوں، لاؤڈ اسپیکر کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ہی اپنے کان بھی بند کر لیا کروں۔

مگر گم شدگی کے اعلان کا کوئی وقت بھی تو مقرر نہیں ہے۔



اب پُرسکون سمندروں میں رواں دواں
.... ہر چند کہ یہ مرحلہ آسان نہ تھا

اظہارِ تشکر

ہم حکومت، حصے داروں، سمندری راستے سے درآمد و برآمد کرنے والوں، تاجر حضرات
اور خاص طور سے عام لوگوں کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ ان کی حوصلہ افزائی، معاملہ فہمی اور حمایت
ہمیں حاصل رہی، اسی کی بنیاد پر یہ قومی پرچم بردار جہاز راں ادارہ
عالمی جہاز رانی کے کاروبار میں ایسی مسلسل مندی کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی
اس اہم موقع پر ہم اپنے اس عزم کو
دہراتے ہیں کہ ہماری تمام تر خدمات قوم کی خدمت کے لئے وقف رہیں گی۔

PNSC

پاکستان نیشنل
شپنگ کارپوریشن
قومی پرچم بردار جہاز راں ادارہ

PID Islamabad

PARAGON



رشید امجد

اونگھتا منظر

صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو کھلی کھڑکی سے منظر اسی طرح اونگھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سیمنٹ کی بوسیدہ دیوار پر جھکا ہوا درخت، جس کی بوڑھی شاخیں بند دریچے کو چھو رہی ہیں۔ یہ دریچہ ہمیشہ بند رہتا ہے، جانے کب سے اسی طرح بند ہے۔

وہ روزانہ دیر تک بستر پر لیٹا اُسے دیکھتا رہتا ہے۔ شیو کرتے، دانت مانجھتے، منہ دھوتے اس کی نظریں بار بار اُدھر جاتی ہیں لیکن دریچے میں کوئی آہٹ، کوئی رنگ دکھائی نہیں دیتا۔ دن بھر دفتر کے شور، فائلوں کی لپک جھپک میں دریچہ ذہن کے کسی اندرونی گوشے میں چھپا رہتا ہے۔ لیکن شام ہوتے ہی جب وہ اپنے کمرے میں آکر کھڑکی کھولتا ہے تو دریچہ مسکرا کر آنکھ مارتا ہے۔ اس آنکھ مارنے اور مسکرانے میں ایک عجیب محبوبانہ شکایت اور لگاؤ ہے کہ وہ بغیر پوچھے اپنے دن بھر کی ساری مصروفیت کی ایک ایک تفصیل سُنانے لگتا ہے اور پھر دفعتاً جب اُسے احساس ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی بولتا چلا جا رہا ہے تو کھسیانا سا ہو کر آرام کرسی میں دراز ہو جاتا ہے۔ نرم ریشمی اندھیرا آہستہ آہستہ چاروں طرف پھیلنے لگتا ہے۔ مدھم موسیقی کی سُروں میں دریچہ آہستہ آہستہ کھسکتا اس کی کھڑکی کے قریب آجاتا ہے۔ وہ ایک کر اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے احساس ہوتا ہے کہ ان کے درمیان تو ریت کا ایک جلتا سمندر حائل ہے۔ وہ اس جلتے سمندر کے دونوں کناروں پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ لیکن کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اس جلتے سمندر میں اُتر [illegible]۔ دھیرے دھیرے پھیلتا اندھیرا انہیں اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا پتھر ہوتا جاتا ہے۔

[illegible] دیر بعد جب اس کا ملازم کھانے کے لئے بلاتا ہے تو وہ آہستگی سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب آتا ہے اور اندھیرے میں گھور گھور کر بند دریچے کو دیکھتا ہے۔ کھانا کھانے، کچھ دیر پڑھنے اور پھر سونے کے درمیانی وقفوں میں بار بار اس کی نظریں دریچے کے بند کواڑوں [illegible] سے ٹکراتی ہیں اور اس وقت تک جب نیند اپنی سرمئی ٹھنڈی انگلیوں سے اس کے پپوٹوں کو سہلا رہی ہوتی ہے۔ دریچہ اس کی آنکھوں کی کیمرے میں جھلملاتا رہتا ہے۔

گہری نیند میں اُسے اپنے نام کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بوجھل آنکھوں سے وہ کھلے دریچے میں اسے کھڑا دیکھتا ہے، دونوں ہاتھ پھیلائے وہ اسے اپنی طرف بلاتی ہے۔ کھڑکی سے نکل کر ہوا میں چلتا وہ اس کے ساتھ دریچے میں داخل ہوتا ہے۔

سبز لہلہاتے کھیتوں میں بانسری کی آواز ٹھنڈی پھوار کی طرح اس کے جسم کو سہلاتی ہے۔

وہ کہتا ہے: "تم مل جاتی ہو تو وقت رُک جاتا ہے"

وہ ہنستی ہے ـــــ "وقت تو کسی کے لئے نہیں رُکتا۔ بس ہم ہی کہیں سُستانے لگتے ہیں۔"
وہ سر ہلاتا ہے ـــــ "شاید سُستانے کے یہ چند لمحے ہی زندگی کی خوشبو ہیں۔"
"اور خوشبو اجنبیت کو تعلق میں بدل دیتی ہے۔" پھر وہ اچانک اُداس ہو جاتی ہے ـــــ "فاصلہ تعلق کو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے۔"
وہ چند لمحے چپ رہتا ہے، پھر کہتا ہے۔ "مجبوریاں ہم پر حکومت کرتی ہیں اور بے بس ہونا بھی کتنا بڑا دکھ ہے۔"
وہ کچھ نہیں بولتی۔
وہ کہتا ہے ـــــ "ہم میں سے ہر ایک، ایک دائرے میں، بند ہے اور دائرے کی حدوں تک ہی آگے پیچھے جا سکتا ہے۔ شاید یہی مقدر ہے۔"
وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ہے ـــــ "اپنے اپنے دائروں میں ہم جہاں تک ایک دوسرے کے قریب آ سکتے تھے آ گئے ہیں۔ اور اب پیچھے ہٹنا ہمارا مقدر ہے ـــــ تو کب جا رہے ہو؟"
"شاید پرسوں۔"
"شاید کیوں؟"
"شاید اس لئے کہ پرسوں صبح میں چلا جاؤں گا اور کوئی یہیں رہ جائے گا یا شاید کوئی چلا جائے گا اور میں یہیں ـــــ"
اس کی سرمئی آنکھوں میں بادل تیرتے ہیں۔
"میں روز رات کو دیا جلاؤں گی اس دریچے کے سامنے اور تم جہاں کہیں بھی ہو گے میری آواز سنو گے۔"
وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے ـــــ "میں جہاں بھی ہوں گا، وہاں صرف میرا جسم ہو گا۔ لیکن میں ـــــ میں ہمیشہ اس دریچے کے پاس، اس جلتے دیئے کے سامنے ـــــ"
اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوب جاتی ہے۔ پھر ہچکیاں پھیلتے پھیلتے چیخوں میں بدلنے لگتی ہیں۔
ملازم دوڑتا ہوا آتا ہے اور اُسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھتا ہے۔
"کیا بات ہے صاب ـــــ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"
وہ گم سم آنکھیں پھیلائے اُسے دیکھتا رہتا ہے۔
ملازم دوڑ کر میز کی دراز کھولتا ہے اور شیشی میں سے دو گولیاں نکال، جگ میں سے پانی انڈیلتے ہوئے اس کی طرف بڑھاتا ہے ـــــ "لیجئے، ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ اب جب بھی دورہ پڑے یہ گولیاں لے لیجئے۔"
وہ بغیر کچھ کہے گولیاں کھا لیتا ہے۔
صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو کھلی کھڑکی سے منظر اسی طرح اونگھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سیمنٹ کی بوسیدہ دیوار پر جھکا ہوا درخت جس کی بوڑھی شاخیں بند دریچے کو چھو رہی ہیں۔
یہ دریچہ کب کھلے گا؟



احمد یوسف

ہُوا یہ کہ اِک دِن

وُہ رکشے سے اُترا تو اس کی جیب خاصی گرم تھی۔ یوں کہ یہ مہینے کی دوسری تیسری تاریخ تھی۔ جب کبھی دفتر کے بابو رکشے سے گھر لوٹتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابھی مہینے کا پہلا ہفتہ ختم نہیں ہوا ہے کیوں کہ اس کے بعد تو سرکاری بسیں اوران کا انتظار ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

رکشے والے سے دو روپے طے ہوئے تھے۔ اپنی گلی کے موڑ پہ پہنچ کر اس نے رکشا رکوایا۔ اور اوپر کی جیب سے دو روپے نکال کر رکشے والے کی طرف بڑھائے۔ رکشے والے نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لیا۔ لیکن جانے کس طرح وہ اس کے ہاتھ سے گر کر زمین پر آرہا۔ تب ہی ان دونوں نے دیکھا کہ وہ دو کا چھوٹا نوٹ بیس کا ایک بڑا نوٹ بن چکا تھا۔ دفتر کے بابو نے جھٹ بڑھ کر وہ بیس کا نوٹ اٹھا لیا۔ اور بڑی پھرتی سے اُسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور پھر ایک دُوسرا دو کا نوٹ جیب سے نکال کر رکشے والے کو دینے لگا۔

اس پر رکشے والے سے اس کا تنازعہ شروع ہوگیا۔ رکشے والا کہتا تھا کہ وہ بیس کا نوٹ اس کا ہے کیوں کہ وہ اس کے ہاتھ سے گرا تھا۔ لیکن بابو کہتا تھا کہ چونکہ مزدوری دو روپے طے پائی تھی اس لئے رکشے والا صرف دو روپے کا حقدار ہے جو وہ اُسے دے رہا ہے۔

آہستہ آہستہ لہجہ تیز ہوتا گیا۔ پھر نوبت تو تو میں میں کی آگئی۔ رکشے والا بولا۔

"بابو جی بیس کا نوٹ میرا ہے۔ آپ کی نیت خراب ہوگئی ہے۔"

دفتر کا بابو کہہ رہا تھا: "بے ایمان، تم — تم سے دو روپے طے ہوئے تھے وہ میں دے رہا ہوں۔ دو طے کر کے بیس لینا چاہتے ہو۔"

تب ہی وہاں کچھ لوگ اکٹھے ہوگئے۔ اور بھیڑ سی لگ گئی۔

چند صائب الرائے لوگوں نے دونوں فریق کے بیان سننے کے بعد اپنے طور پر کچھ فیصلہ بھی دینا چاہا۔ بھیڑ میں بیشتر لوگ ایسے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ دھاندلیوں کے اس جہان میں وہ گھر سے نکل کر سب سے پہلے وہ جس دھاندلی باز سے متعارف ہوتے ہیں وہ رکشہ والا ہوتا ہے۔ یوں کہ اگر اس کا رُخ پچھم کی طرف ہے تو وہ کسی بھی قیمت پر پورب، اتر اور دکھن کی جانب جانے کا روادار نہ ہوگا۔ اور اگر پورب کی

ہمت کھڑا ہے تو پھر پچھم، اُتر اور دکھن کی سواریاں لینا اس کے لئے حرام قرار پائے گا۔
پھر چلچلاتی دھوپ، تیز بارش اور سرد راتوں میں روپے کی جگہ دو روپے اور دو روپے کی جگہ چار روپے مانگے گا۔ اس کے علاوہ میلوں ٹھیلوں، اور تہوار کے موقع پر مزدوری دوگنی اور تگنی کر دے گا۔
جب عام لوگوں کے لئے رکشے سے دفتر جانا ہی قیامت ٹھہرا تو پھر بابوؤں کی دھاندلی ان کی نظر میں کس طرح آ سکتی ہے۔
اب ایسا بلند پایہ ظالم ان کے سامنے ہو تو فیصلہ یقینی اس کے خلاف میں دیا جائے گا۔
"بڑے چور ہوتے ہیں یہ لوگ"
"خود ہی کہہ رہا ہے۔ دو روپے طے ہوئے تھے۔ تو پھر دو روپے لینے سے انکار کیوں کر رہا ہے؟"
"ارے ان لوگوں کی بدنیتی کا حال کچھ نہ پوچھو"
"اوسط درجے کے لوگوں کا تو انہوں نے خانہ خراب کر دیا ہے"
رکشے والے کی آواز اتنی ساری آوازوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی۔ تب ہی وہاں کچھ ایسے لوگ آ گئے جو عین کے جلوس کی شان رکشے والے بنا کرتے تھے۔
"نوٹ آپ کا نہیں، رکشے والے کا تھا جو اس کے ہاتھ سے گر کر دو سے بیس ہو گیا۔ وہ نوٹ اُسے دے دیں"
ایک گروہ ان لوگوں کا بھی آ گیا جو یہ کہتے تھے کہ مزدور کا پسینہ سوکھنے سے پہلے اُسے اس کی مزدوری دے دو۔
"یہ شور شرابہ کیوں؟"
ان تازہ وارد ہمدردوں کے سبب رکشے والے کی ڈوبتی آواز کو سہارا ملا۔
"بابو جی وہ دو کا نوٹ میرا تھا جو زمین پر گر کر بیس بن گیا"
لیکن بابو کہہ رہا تھا۔ "اگر تمہیں دینے کے عمل میں دو کا نوٹ زمین پر گر کر بیس کا نوٹ بن گیا تو یہ میری قسمت کا ہے۔ یوں بھی تم صرف دو کے حق دار ہو"
اب بھی مکتبۂ فکر کے لوگ جو وہاں یکجا تھے معاملے کی تہ تک پہنچ چکے تھے۔
"مزدوری دو روپے طے ہوئی تھی۔ اس سے نہ رکشے والا انکار کرتا ہے اور نہ بابو انکار کرتا ہے"
"بابو نے دو روپے دیئے تھے۔ اس سے بھی کسی فریق کو انکار نہیں ہے"
"اور اب بھی سبھوں کے سامنے بابو رکشے والے کو دو روپے دے رہا ہے"
"لیکن وہ بیس کا نوٹ جو دو سے بیس بن گیا؟ — وہ بابو کی جیب میں ہے ———"
بس یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر ان کی عقل سپر ڈال دیتی تھی۔
"کس کے حق میں فیصلہ کیا جائے؟"
مزدوروں کے حقوق کی نگہبانی کرنے والوں کی عقل بھی گم تھی کیونکہ ان کے سامنے بابو دو روپے کا نوٹ لئے کھڑا تھا۔
لیکن رکشے والا اس بیس کے نوٹ کی بات کر رہا تھا جو لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔
اب بھیڑ واضح طور پر کئی حصوں میں بٹ گئی تھی۔
"تم دو روپے لے لو"

"آپ اسے بیس روپے دے دیں۔"

"نہیں، اتنی جلدی کسی فیصلے پر نہ پہنچئے۔"

تب ہی بھیڑ میں سے کسی نے کہا کہ معاملہ دفترِ شہریار کے سپرد کر دینا چاہیے کہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہما شما کی فہم سے بالاتر ہے۔

پھر کتنی ہی آوازیں اسی ایک آواز کی ہم نوا بن گئیں۔

لیکن اسی گھڑی ایک اور طرف سے کسی نے کہا۔

"لوگوں کے حافظے کمزور ہو چکے ہیں۔ آخر وہ پنیر والا واقعہ کیوں بھول گئے کہ کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ترازو والے نے پوری پنیر چٹ کر ڈالی تھی۔"

بتانے والے پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسنے لگے۔

"کیا واقعہ یاد دلایا ہے ۔۔۔ واہ ۔۔۔ واہ ۔۔۔ واہ ۔۔۔"

"وہاں پہنچ کر تو نہ دو رہے گا نہ بیس۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" یہ سوالیہ نشان سبھوں کے آگے تھا۔

رکشے والا اور بابو بھی اب بحث کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ انہیں یک گونہ اطمینان سا ہو گیا ہے کہ انہوں نے معاملہ عوامی عدالت کو سونپ دیا ہے۔

کچھ دیر بھیڑ کے درمیان مکھیاں سی بھنکتی رہیں۔ جیسے کھیل کا درمیانی وقفہ ہوا ہو اور لوگ یا تو اطمینان کی سانس لے رہے ہوں یا غور و فکر میں ڈوبے ہوں۔ کہیں ایک کونے میں دو افراد آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے قدرے زور سے کہا

"بالکل ٹھیک خیال ہے تمہارا۔"

ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔ "کون سا خیال بھائی؟"

"جناب، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ جو ویران کوچے میں ایک بزرگ رہتے ہیں، ہم کیوں نہ ان سے رجوع کریں۔"

سبھوں نے بیک آواز کہا۔ "کیا ترکیب سوجھی ہے میاں، جیتے رہو۔"

تب سبھی لوگ کشاں کشاں اس ویران کوچے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

نحیف و نزار سے ایک بزرگ تخت پر بیٹھے مطالعے میں منہمک تھے۔ ننگے سر افراد کی بھیڑ میں تنہا ان کے سر پہ ٹوپی تھی اور پاس ہی جائے نماز بچھی تھی۔

تسلیم و بندگی کے بعد بھیڑ نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

بزرگ نے پوچھا۔ "میرے فیصلے آپ لوگ مانیں گے؟"

سبھوں نے ایک ساتھ کہا۔ "ہمیں آپ پر کامل اعتماد ہے۔ آپ کا ہر فیصلہ ہمیں قبول ہوگا۔"

بیشتر لوگوں کو اس بات کا تجسس تھا کہ آخر وہ اس عجیب و غریب معاملے کو کس طرح سلجھاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب کے سب وہاں سے چلے آئے تھے حالاں کہ شام ڈھل چکی تھی اور گھروں کے چراغ کب کے جل چکے تھے۔

تب بزرگ نے رکشے والے اور بابو سے دریافت کیا۔

"آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟"

ان لوگوں نے بھی وہی کہا جو سب کہہ رہے تھے۔ "بالکل مانیں گے جناب۔"

"تو اب مقدمہ پیش کیجئے۔" پہلے انہوں نے رکشے والے سے فرمائش کی۔

وہ بولا۔ "میری مزدوری دو روپے طے ہوئی تھی۔ بابو نے مجھے دو روپے کا نوٹ دیا۔ جو میرے ہاتھ میں آکر زمین پر گر گیا اور دو سے بیس ہو گئے۔ اس پر بابو نے اسے جھٹ اٹھا لیا۔ اور اسے جیب میں رکھ کر انہوں نے مجھے دوسرا دو کا نوٹ دینا چاہا۔ اس پر میں نے کہا کہ وہ نوٹ میرے ہاتھ میں آکر زمین پر گرا ہے اور بیس کے نوٹ میں بدل گیا ہے۔ اس طرح وہ بیس کا نوٹ میرا ہے۔"

پھر انہوں نے بابو سے دریافت کیا۔

بابو نے کہا۔ "میں نے اس کی طے شدہ مزدوری جو دو روپے ہوئی تھی اسے دیا تو وہ نوٹ اس کے ہاتھ سے گر کر زمین پر آرہا اور بیس کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا یوں کہ اس کی مزدوری صرف دو روپے ہوئی تھی۔ اب میں اسے دو کا دوسرا نوٹ دے رہا ہوں، لیکن اس کی نیت بدل گئی اور یہ مجھ سے بیس والا نوٹ مانگتا ہے۔ درآں حالے کہ اس کی مزدوری صرف دو روپے تھی جس کا یہ بھی اقرار کرتا ہے۔"

بزرگ نے باری باری دونوں سے تین تین بار ان کے بیانات سنے۔ پھر وہاں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کیوں کہ بزرگ مراقبے میں چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا اور ان سے یوں مخاطب ہوئے۔

"بھئی میں نے آپ دونوں کے بیانات تین تین بار سنے محض اس لئے کہ شاید پہلے بیان سے دوسرے میں کوئی فرق آجائے اور دوسرے سے تیسرا کسی قدر مختلف ہو لیکن بحمد اللہ کہ ہر بار آپ لوگوں نے ایک ہی بیان دیا۔"

- رکشے والے کی مزدوری کے دو روپے ہوئے تھے، یہ آپ دونوں مانتے ہیں۔
- بابو نے رکشے والے کو دو روپے دیئے تھے، یہ آپ دونوں کہتے ہیں۔
- دو کا نوٹ رکشے والے کے ہاتھ میں آکر زمین پر گر گیا اور بیس کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا۔ اسے آپ دونوں تسلیم کرتے ہیں۔

"اب یہیں سے جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ بابو کا یہ کہنا ہے کہ چوں کہ مزدوری دو روپے طے ہوئی تھی اس لئے رکشے والا بیس کا حقدار نہیں ہو سکتا۔"

"رکشے والا کہتا ہے کہ چوں کہ وہ دو روپے کا نوٹ جو اسے مزدوری میں دیا گیا تھا اس کے ہاتھ میں آکر زمین پر گرا اور بیس کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا، اس لئے وہ اس کا ہے۔"

"بابو کی نیت میں اگر کھوٹ ہوتا تو وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے غلطی سے بیس کا نوٹ دے دیا تھا اور جب وہ زمین پر گر گیا تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے وہ نوٹ جیب میں رکھ کر رکشے والے کو دو کا نوٹ دینا چاہا لیکن اب وہ بیس کے نوٹ پر اپنا دعویٰ کرتا ہے۔"

"لیکن ایسی بات نہیں ہوئی۔ دونوں یہ کہتے ہیں کہ دو کا نوٹ بیس کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا ہے۔"

"یہاں دیکھنا یہ ہے کہ . . . ." انہوں نے بابو کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مزدوری کے دو روپے دیئے، رکشے والے سے آپ کا معاملہ ختم ہوا۔"

"اب اگر وہ نوٹ اس کے ہاتھ میں آکر زمین پر گر گیا اور بیس کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا تو وہ ہر حال میں اس کا ہے۔"

"بالفرض محال وہ دو کا نوٹ رکشے والے کی جیب میں پہنچ کر بیس کے نوٹ میں تبدیل ہو جاتا تو آپ کیا کر لیتے؟"

"اس عالم میں تو آپ کو اس تبدیلی کی خبر بھی نہیں ہوتی۔"

"پریشانی یوں ہوئی کہ آپ نوٹ کی تبدیلی سے واقف ہو گئے۔"

اس پر بابو نے بیس کا نوٹ جیب سے نکال کر رکشے والے کے حوالے کر دیا۔

بزرگ نے خلقت سے دریافت کیا۔

"غالباً آپ لوگ اس فیصلے سے مطمئن ہو گئے۔"

لیکن کسی نے اس فیصلہ پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ سب سر جھکائے دھیرے دھیرے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل کھڑے ہوئے۔



قابلِ اعتبار نام
سوزوکی
SUZUKI
ہر طرح سے بچت ہر لحاظ سے کفایت
SS 80 FX سوزوکی
کفایت
بوجھ اٹھائے، چلتی جائے
ST 308R سوزوکی پک اپ
آمدورفت کے مسائل کا کفایت حل
ST 308 VTR سوزوکی
SUZUKI SWIFT
کامیاب لوگ۔ کامیاب کار
1000 cc
جہاں چاہیئے لے جایئے
SJ 410 4WD سوزوکی
سوزوکی۔ پاکستان کے ہر مقام پر اسے قابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ یہ دلکش انداز میں آرام پہنچانے کے لئے مشہور ہے۔ اس کی مخصوص ساخت اسے کفایت کی انتہا بنا دیتی ہے۔ سوزوکی سے شناسائی سوزوکی پر اعتماد کرنا سکھاتی ہے۔
ہماری فیکٹری میں جدید اضافوں نے ساری گاڑیوں کا معیار مزید بہتر بنا دیا ہے۔
ملک بھر میں حاصل پرزہ جات اور بعد از فروخت سروس کی سہولت موجود۔
پاک سوزوکی موٹر کمپنی لمیٹڈ
202726-29
OVER 2LAC SUZUKI VEHICLES ON ROADS.



نجم الحسن رضوی

سبزہ اور سنگ زاد

مُراد نے دیکھا اس کے بازوؤں، گردن اور پشت پر ہرے ہرے پتّے اُگ آئے تھے اور ایک گھنا پیڑ اس کے اندر اپنی سبز چھتری پھیلا رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب پیڑ بن گیا تھا۔

مُراد کے پیڑ بننے سے پہلے کے واقعات بھی بہت اہم ہیں جن کا جاننا ضروری ہے مثلاً سنگ زاد سے اس کی ملاقات اس قصے میں تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ اس گھر کا چوتھا فرد تھا۔ ایک دن جب سمندر بڑے غصے کے بعد پسپا ہو رہا تھا، مُراد نے سنگ زاد کو گیلے ساحل پر سنگ ریزوں اور سیپیوں کے بیچ میں اپنی ذات میں مست پایا۔ سمندر کی لہریں بار بار اس پر کمند پھینک رہی تھیں مگر اس نے اتنے کس کے ریت کا سینہ تھام رکھا تھا کہ ہر موج ناکام واپس گئی اور سنگ زاد وہیں موجود رہا۔ جب مُراد نے غور سے دیکھا تو لگا جیسے کوئی آدمی زمین کو [illegible] تھام کر بیٹھا ہے۔ اس دن سنگ زاد پہلی بار اس گھر میں آیا۔ پریتی نے اُسے دیکھا تو حیران ہو کے بولی۔ "ارے، یہ تو پتھر ہے!"

مُراد نے جواب دیا۔ "اب یہ یہیں رہے گا۔ میں اسے تراشوں گا تاکہ اس کا آدمی نما وجود پوری طرح اُبھر آئے۔"

پریتی نے کہا۔ "چھوڑو، تم اسے میرے 'گرین ہاؤس' میں لے چلو، پھر دیکھو میں اسے کیسا سرسبز کرتی ہوں —!"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پریتی کے ہاتھوں کے لمس سے ریت میں سبزہ پھوٹتا تھا۔ اس کمرے کے باہر لمبی بالکنی میں اس کا معلّق باغیچہ ریت کے خاکستری سمندر میں کسی سبز جزیرے کی طرح اُبھرا ہوا تھا۔ گھنے پودے اور گملوں میں دہکتے پھولوں کے سائے پورے گھر کو خنک رکھتے۔ بوگن ویلیا کے سُرخ پھول لمبی ڈور پر دوڑتے ہوئے کمرے کے اندر چلے آتے۔ گل مُہر، ڈیلیا اور گلاب سر اٹھا اٹھا کے آنے والوں کو دیکھتے اور منی پلانٹ کی سُبک خرام بیلوں نے اپنی ننھی ننھی ہری زبانوں سے دیواروں کے سارے مٹیالے پن کو چوس لیا تھا۔ پریتی اُسے اپنا 'گرین ہاؤس' کہتی تھی۔ وہ کہتا۔ "اس دھوپ، شدید گرمی اور ریت کی یلغار میں یہ سرسبز و شاداب جزیرہ — یہ تو معجزہ ہے معجزہ —"
پریتی مسکرائی۔ "میں سبزے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ میری مجبوری ہے۔"

پریتی کی سرسبز ریاست کے باہر ایک تو وہ خود تھا، دوسرا شنکر، پریتی کا نصف بہتر۔ تینوں کا ایک اجنبی ملک میں ایک چھت کے نیچے جمع ہونا خود ایک انوکھا واقعہ تھا لیکن نظریۂ ضرورت کے تحت کیا ممکن نہیں۔ یہ پریتی اور شنکر کا گھر تھا اور مُراد ان کا مہمان، گھر گرہستی میں یکساں شراکت کی بنیاد پر۔ مُراد اور شنکر میں کوئی شے مشترک نہیں تھی سوائے گھر کے اور ان کا واحد رابطہ پریتی تھی۔ وہ کہتی "تم دونوں میں اور جو چیز مشترک ہے، خود پرستی۔ تم لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ تمہاری ذات کے باہر بھی ایک دنیا آباد ہے۔ شنکر گھر سے ایک بار

وقت تک گھر نہیں لوٹتا جب تک کہ اس کے دوبارہ کام پر جانے کا وقت نہیں ہو جاتا۔ اور تم اپنی کشتیوں کے کارخانے میں سورج کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھتے ہو۔ تمہیں پتہ ہے کل میں نے کتنی محنت سے تم لوگوں کے لئے رات کا کھانا تیار کیا تھا مگر حیف — بولو آخر میرا بھی کچھ مصرف ہے ؟" وہ کہتی۔" اور سنو، یہ جو تم اتنی بہت ساری کشتیوں پر کشتیاں بنائے چلے جا رہے ہو، یہ کس لئے، کسی ایک کشتی کو اپنے لئے بھی مخصوص کیا ہے تم نے ؟"

وہ ہنسا:" میں کشتیاں بیچنے کے لئے بناتا ہوں، واپس جانے کے لئے نہیں۔ میں تو اپنی ساری کشتیاں جلا چکا ہوں۔ تمہیں پتہ نہیں میں کہاں جاؤں گا۔ مگر شنکر کو تم گھر میں باندھ کے رکھو۔"

پریتی کیکٹس کے گملے کو میز پر رکھتے ہوئے کہتی:" شنکر کو بہت کام ہے، تم کو کیا پتہ !"

"ہاں" وہ کہتا:" جیسے تیل کمپنی کی ساری ذمّے داری اسی کے کندھوں پر تو ہے !"

وہ کہتی:" شنکر کے بارے میں کچھ مت کہو۔ وہ تمہاری طرح سب کشتیاں جلا کے یہاں نہیں آیا۔ وہ واپس جانے کے لئے ایک عظیم کشتی تیار کر رہا ہے، دن رات محنت کر کے !"

"سونے اور چاندی کی کشتی ؟" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

وہ ہنسی —" ہاں — اور میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ وہ اپنی سونے کی کشتی جلد سے جلد مکمل کر لے۔ میں بھی تو آخر اسی کے لئے چاندی کے پتوار بنا رہی ہوں۔ نہ جانے اس کی واپسی کا سفر کب شروع ہوگا !"

مگر شنکر کو واپسی کی جلدی نہیں تھی اور پریتی کے 'گرین ہاؤس' میں نوزائیدہ پودوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ہفتے میں ایک بار وہ اپنے باغیچے کے دروازے باہر والوں پر کھولتی اور یہ پودوں کی نذر کا دن ہوتا۔ لوگ خوشی خوشی اس کے کھلکھلاتے پھولوں والے پودے خریدتے۔ گملے ترتیب سے ایک قطار میں رکھے ہوتے اور ہر پودے پر کوئی نہ کوئی مسکراتا فقرہ سجا ہوتا۔

" اگر آپ کو تنہائی کا شوق ہے تو اسے ہرگز نہ لیں، یہ بولتا ہے۔"

" یہ پودا نہیں، بچہ ہے۔ اسے اپنی انگلی تھمائیں، یہ چلنے لگے گا !"

" پیڑ سے پیار کرو کیوں کہ پیار خود ایک پیڑ ہے جو روح کے آنگن میں اُگتا ہے۔"

ایک اخبار نویس نے کہا:" آپ نے اپنے نجی گل کدے میں اتنے پھول جمع کئے ہیں کہ لگتا ہے کہ صرف اسی کی وجہ سے باہر صرف صحرا باقی رہ گیا ہے !"

پریتی بولی:" صحرا باہر کہاں، وہ تو میرے اندر ہے۔ میرے پھول اور میرے پودے تو دعوت نامے ہیں جو میں بار بار صحرا کو بھیجتی ہوں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا — میری رُوح کا صحرائے اعظم !"

جب کسی پودے پر نیا شگوفہ چٹکتا اور نیا پھول مسکراتا، پریتی اس کے سامنے ایک شمع روشن کرتی اور گملے کے سامنے دو زانو ہو کے ہولے ہولے دُعائیں مانگتی۔ تو اُس دن اس نے کہا:" سنگ زاد کو مجھے دو۔ میں اسے سرسبز کر دوں گی !" اُس نے اس پر نرم مٹی کی ایک تہ جمائی اور اس میں بیج بو دیئے مگر یہ کافی پرانی بات ہے۔ بیچ میں کئی حادثے ہوئے۔

پریتی اور شنکر الگ الگ کمروں میں سوئے۔

ایک شام شنکر نے جیب سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ نکالا اور پریتی کی طرف پھینک کے کہا:" فارگاڈ سیک تمہیں جانا ہے تو فوراً پہلی فلائٹ پکڑو اور چلتی بنو۔ مگر جانے سے پہلے اپنے ان نونہالوں کو محلّے والوں میں بانٹتی جانا۔ میں بھلا انہیں کہاں سنبھالتا پھروں گا۔" اس نے پریتی

کے گملوں کی طرف اشارہ کیا۔

اور اس دن پرتیتی نے ایک بار پھر مُراد سے وہی پُرانا سوال دُہرایا۔ "تمہاری واپس جانے والی کشتی کب بنے گی ؟"

اُس نے کہا۔" میری کشتی ؟ مگر میں تو اپنی سب کشتیاں جلا چکا ہوں !"

پرتیتی بولی۔" وہ کس لئے ، تمہیں کون سا جبرالٹر فتح کرنا ہے ؟"

"یہ جبرالٹر تنہائی کا ہے ، اجنبیت کا ، بے وطنی کا۔ اس پر قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ واپس جانے کی سب امیدیں توڑ دی جائیں ــــ اور ــــ !"

پھر اس نے پرتی سے پوچھا۔" تم سچ مچ واپس جانا چاہتی ہو ؟"

"ہاں" وہ بولی۔" شنکر کو ساتھ لے کر۔ کیا تم سمجھتے ہو سونے چاندی کی بیڑیاں مجھے یہاں روک سکتی ہیں ، ہرگز نہیں۔ یہی تو المیہ ہے لوگ سونے کی چمک دیکھتے ہیں۔ اس مٹی کی کشش کو نہیں اہمیت دیتے جس میں پھول کھلتے ہیں۔ میں اس ایلڈرے ریڈو سے اپنی مٹی کی دنیا میں لوٹ جانا چاہتی ہوں۔ شنکر تمہاری طرح ہے۔ وہ ہر وقت سونے کے آسمان کی طرف تکتے رہنا چاہتا ہے۔ مٹی کا فرش اُسے قبول نہیں۔"

"تعجب ہے۔" وہ بولا۔" اور میں اس لئے گھر سے نکلا تھا کہ اُسے ہر وقت میرا مٹی میں لتھڑا رہنا پسند نہ تھا۔ میں کسان تھا اور میرا کسان ہونا اُسے پسند نہ تھا۔ وہ ایسا گھر چاہتی تھی جہاں شیشے کا فرش ہو اور دیواروں میں آئینے چُنے ہوں جس میں ہر طرف اسے اپنی ہی صُورت نظر آئے۔ وہ دن رات مجھے طعنے ہی دیتی تھی اور میرے نکھٹے پن کو کوستی تھی اور اپنے ننگے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے فریاد کرتی تھی۔ آخر ایک رات جب سب سو رہے تھے میں اپنے کپل وستو سے نکل کھڑا ہوا۔ یشودھرا گہری نیند میں تھی۔ میں چپ چاپ اُس کی دنیا سے نکل گیا، اُس اسم اعظم کی تلاش میں جس سے دُکھی دلوں کو راحت ملتی ہے۔ اس واقعے کو بہت دن ہو گئے اور اب ــــ میرا تین منزلہ پختہ مکان بن چکا ہے، کھیت پر پمپ چلتا ہے اور میری بیوی کے دونوں ہاتھ کھرے سونے کے ہیں۔"

"مگر اس پیڑ کا کیا بنا ؟"

"کون سا پیڑ ؟"

"وہ پیڑ جو ساری تپسیاؤں کا حاصل ہے اور جو فکر کی آخری سرحد پر واقع ہے۔ وہ گھنا پیڑ ــ !"

"میں ابھی اس پیڑ تک نہیں پہنچا۔" وہ بولا۔" ابھی میں سفر میں ہوں !"

پرتیتی نے کہا۔" دیکھو پھر ایک شگوفہ چٹک رہا ہے ، مجھے شمع جلانے دو ــــ !"

مُراد نے کہا۔" تمہاری یہ شمعیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ آخر ان کا کیا مطلب ہے ، ایک دن میں نے شنکر سے بھی پوچھا۔ وہ ہنس کے بولا یار اس کے سامنے نہ پوچھنا، وہ رو دے گی۔ یہ شمعیں نہیں ، اس کی ناآسودہ آرزوئیں ہیں۔"

پرتیتی اُداس ہو گئی۔" سچ تو کہا اس نے ، ہر پھول وہ بچہ ہے جس نے میری کوکھ کے باہر جنم لیا ہے۔ سنو میں ماں بننا چاہتی ہوں مگر شنکر کہتا ہے پھول گملوں میں اچھے لگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یہاں ہم ایک مقصد کے تحت آئے ہیں، ایک مشن، ایک ہدف لے کر۔ بچوں کو پالنے کے لئے تو عمر پڑی ہے۔"

میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔" ہمارے علاقے میں ایک مندر ہے ، ان بچوں کا جو پیدا نہیں ہوئے۔ ناکام مائیں وہاں اپنے نہ ہونے والے بچوں کے نام شمعیں جلاتی ہیں۔ میں بھی تو ــــ !" وہ نئے پودے پر جھک گئی۔

شنکر اس شام لوٹا ہی نہیں۔ اُس نے فون پر کہا۔" بہت کام ہے۔"

اور مُراد نے اُس رات پہلی بار سوتے وقت اس کھیت کے بارے میں سوچا جسے وہ برسوں پہلے اُس وقت چھوڑ کے آگیا تھا جب فصل تیار کھڑی تھی۔ اور یہ بہت دنوں کے بعد کا ذکر ہے جب اُسے پتہ چلا کہ اس کی بیوی نے ایک مُردہ بیٹے کو جنم دیا تھا۔

دوسری صبح پریتی نے سنگ زاد کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "تمہارا دوست تو بہت ضدّی نکلا۔ ابھی تک اس نے اپنے سینے کا ایک راز نہیں اُگلا۔" اس نے غور سے دیکھا، پتھر کا آدمی گھٹنوں کے بل جھکا ہوا دونوں ہاتھوں سے جیسے زمین کو ٹٹول رہا تھا۔ اس کی پیٹھ پر ہریالی کا نام و نشان نہ تھا۔

"وہ تھک گیا؟" مُراد نے پوچھا۔

"کیوں نہیں!" پریتی مسکرائی۔ "ہر اچھا شوہر اوور ٹائم کے بعد گھر واپس آتا ہے، سونے کے لئے — وہ اس وقت گھوڑے بیچ کے سو رہا ہے۔"

مُراد نے کہا۔ "آج مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ میری ایک نئی کشتی اپنے سفر پر روانہ ہو رہی ہے، اپنی منزل کی طرف —!"

پریتی نے کہا۔ "ہم سے اچھی تو یہ کشتیاں ہیں جو اپنی منزل کی پہچان تو رکھتی ہیں۔ ہمیں تو یہی خبر نہیں کہ کدھر جا رہے ہیں۔ وقت کے سمندر کی اندھی لہریں ہمیں انجانی سمتوں میں اُچھال رہی ہیں۔ کبھی کبھی میں خواب دیکھتی ہوں کہ جیسے میں ایک بڑی سی کشتی ہوں جس پر بہت بڑا لال پھولوں والا پیڑ چھایا ہوا ہے۔ اور کشتی سمندر کی ناہموار چھاتی پر سبزے کی ایک گہری لکیر کھینچتی آگے بڑھتی جاتی ہے — لیکن یہ تو خواب کی بات ہے۔"

مُراد نے پوچھا۔ "مگر تم ہر چیز کو نباتاتی نقطۂ نظر سے کیوں دیکھتی ہو — کشتی اور ہریالی، پانی، پھول اور پیڑ؟"

پریتی نے کہا۔ "افسوس، تم ابھی تک پیڑ تک نہیں پہنچے، تمہاری تو ساری تپسیا بے کار گئی!"

تو کیا آدمی کی ساری تپسیا کا حاصل پیڑ ہے؟ مُراد نے سوچا۔ "میں جامن کے پیڑ کے پاس روز تمہارا انتظار کرتی ہوں۔" آواز کا ایک بھولا بسرا ٹکڑا کسی خشک پتّے کی طرح اس کے سامنے آ کر گرا۔ اس نے سر کو جھٹکا، کون کس کا انتظار کرتا ہے، اور وہ پیڑ! وہ گھر سے نکلا تو اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کی پیٹھ پیڑ کی طرف رہے۔ پیڑ نے ان دونوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اسے واپس نہ پکار لے۔

"پیڑ کی آواز نہیں ہوتی۔" پریتی بولی، "مگر وہ خوشبوؤں کے سندیسے بھیجتا ہے۔ وہ بڑا مہربان ہے۔ وہ ہر وقت اپنی بے شمار بانہیں پھیلائے اس انتظار میں رہتا ہے کہ کوئی آئے اور وہ جھٹ اُسے سینے سے لگا لے۔ زمین چاہے جتنی سخت ہو، پیڑ اپنا سبز ہاتھ لہراتا باہر نکل آئے گا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ دھرتی کو بے اماں نہیں دیکھ سکتا۔ تم تو کسان ہو۔ تم سے زیادہ اس کی فطرت سے کون واقف ہوگا۔ مگر افسوس، تم شاید پیڑ کو محض لکڑی کا خوش نما کھمبا سمجھتے ہو؟"

اور اُس رات مُراد نے دیکھا کہ وہ ایک اُونچے کھمبے پر چڑھ رہا ہے، چڑھ رہا ہے اور چڑھ رہا ہے۔ اور اس کا آخری سرا نظر نہیں آتا۔ کھمبے کے نیچے دُور دور تک سناٹے ہیں۔ دور روشنیاں۔ وہ اس کی طرف رُخ کئے، پلکیں جھپکا رہی ہیں۔ اوپر تاریکی ہے اور سردی اور مُراد اپنی چھلی ہوئی کہنیوں اور خراش زدہ گھٹنوں اور زخمی انگلیوں کے سہارے اوپر چڑھ رہا ہے۔ وہ بار بار پھسلتا اور وہ جب پھسلتا ہے تو نیچے سے خوف زدہ چیخیں اُبھرتی ہیں۔

پھر ایک اور منظر — جلتی دھوپ کا صحرا، اور ایک بچّہ پناہ کے لئے دوڑتا پھرتا ہے۔ دُور دُور تک کوئی سایہ نہیں۔ کوئی سبزہ نہیں اور بچّہ — دوڑتے ہوئے، مُڑ مُڑ کے کسی کو پکارتا ہے، بچہ پھر پکارتا ہے، پھر پکارتا ہے —

پَریتی نے کہا: " لگتا ہے یہ تمہارے اندر کا خوف ہے جو اب باہر آرہا ہے۔ اتنے دن سے تم اس خوف کو اپنے اندر چھپائے ہوئے تھے۔ اب لگتا ہے کہ تنہائی تمہاری چھاتی چیر کے باہر آنا چاہتی ہے!"

مُراد نے کہا: "مگر اب میں آوازیں سننے لگا ہوں۔"

پریتی نے کہا: "یہ بھی اچھا شگون ہے، تم بیدار ہو رہے ہو۔"

مُراد بولا: "کل جب کشتی کو سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کے سپرد کیا جا رہا تھا تو میں نے دیکھا اس کے پہلوؤں میں گھاس اُگ آئی ہے اور ـــــ!"

پریتی خوش ہو کے بولی: "آہا، کشتی اور سبزہ یہی تو میرا خواب ہے!"

مُراد بولا: "تو یوں کہو، تمہارے اندر بھی ہریالی بانہیں پھیلا رہی ہے۔"

پریتی اُداسی سے مسکرائی: "میں تو خواب کی بات کر رہی ہوں۔ سچائی تو یہ ہے کہ سنگ زاد ابھی تک اپنے پتھریلے حصار سے باہر نہیں نکلا۔ ایک سبز پتی اس کی چھاتی سے نہیں پھوٹی۔ پتھر ـــ سبز ہو کے ہلکا ہو جاتا ہے ورنہ اٹھائے نہیں اٹھتا۔ تمہیں کیا پتہ میرے اُوپر کتنا بوجھ ہے۔"

مُراد نے کہا: "اور میں سوچتا ہوں کہ وہ بچہ کیسے پکارتا ہے؟"

پریتی نے کہا: "شاید وہ تم خود ہو۔ اور اپنے خول سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

مُراد ذرا دیر چپ رہا، پھر بولا: "نہیں، وہ میرا بچہ ہے!"

"ارے" پریتی نے مسرت سے کہا: "تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تمہارا کوئی بچہ بھی ہے۔"

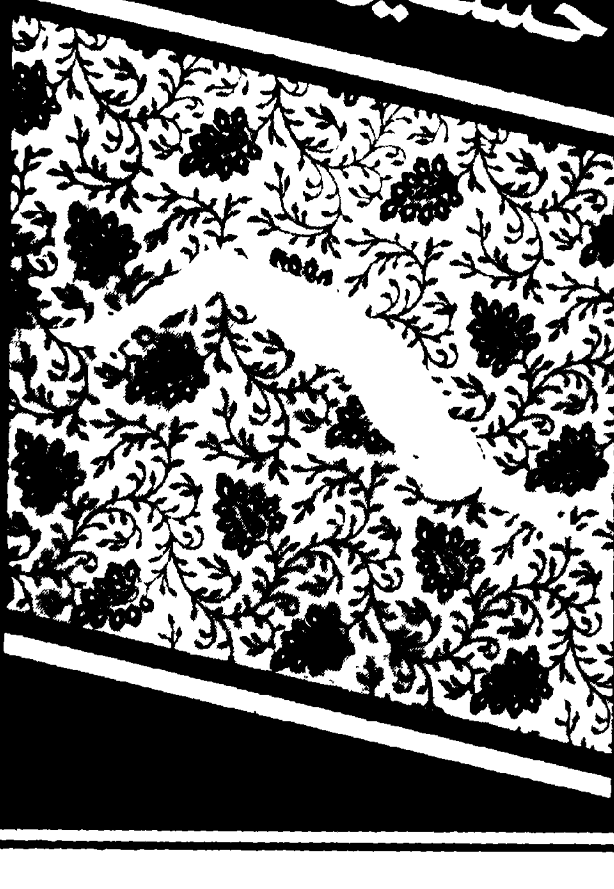
مُراد نے کہا: "یہ وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

اور یہ دوسرے دن کا واقعہ ہے کہ جب پریتی نے مُراد کا کمرہ کھولا تو اُسے سامنے والی دیوار پر ہرے مُوقلم سے ایک تناور پیڑ کی شبیہ بنی ہوئی نظر آئی۔ کمرہ خالی تھا۔ پریتی خوش خوش اپنے گرین ہاؤس میں گئی تو وہاں شاداب پودوں کے جھنڈ میں سنگ زاد نظر آیا۔ اُس کے سینے پر مایوسی کی سیاہ تختی نصب تھی۔ اور اس کے دونوں پتھریلے ہاتھ ہنوز کچھ ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ پریتی نے اُداسی سے کہا۔ "مجھے پتہ ہے تم کیا ڈھونڈتے ہو۔ تمہیں کوئی سرسبز نہیں کر سکتا۔ میں بھی نہیں!" اس ہفتے پریتی کی نرسری میں بازار اشجار نہیں سجا۔ لوگ حسبِ معمول پودے خریدنے آئے۔ گھر کے باہر ایک بورڈ آویزاں تھا، جس پر لکھا تھا: "سب پودے بک چکے ہیں۔"

شنکر کو اس تمام قصے کا پتہ نہیں چلا۔

ٹھنڈک اور آرام کا احساس
پرنٹیڈ، پلین لان، بلینڈیڈ
شرٹنگ، پوپلین، اور بیڈ لینن
کامیاب فیبرک موسم در موسم

معیار بہترین، انداز دلکش
ایک حسین امتزاج



محمد فاروق
ٹیکسٹائل ملز
لمیٹڈ

Advertising Corporati



حفیظ احسن

مسافر اور تلاشِ منزل

مسافر نے اپنی آنکھوں پر ہتھیلی کا سایہ کرتے ہوئے دُور بے آب و گیاہ پہاڑیوں کے اوپر چمکتے ہوئے سورج کو دیکھا۔ سورج کے آس پاس لرزتی کانپتی لہروں کا ہالہ بنا ہوا تھا۔ اس کی جسامت میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اور وہ دیکھ رہا تھا کہ سورج کے اندر دہکتے ہوئے الاؤ میں کئی کئی میل لمبی شعلوں کی زبانیں آکٹوپس کی تڑپتی ہوئی باہوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ اور ان کے درمیان سورج کا وجود آکٹوپس کی آنکھ کی طرح زمین کو گھور رہا تھا۔ ان طویل شعلوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے نیچے ان کے نیم تاریک ملگجے سائے تڑپ رہے تھے جیسے بیک وقت بے شمار ڈریگنوں کے منہ کے دہانے ان پہاڑیوں کو تڑپتی سلگتی بکتی آتشیں پچکاریوں سے بھسم کر دینے کے درپے ہوں۔ اس تیز روشنی میں مسافر کی آنکھوں کی پتلیاں تقریباً بند پلکوں کے وسطی نقطے سے خلا میں دو چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح اٹکی معلوم ہوتی تھیں۔ مسافر کو محسوس ہوا جیسے اس تیز روشنی میں اس کی بصارت کی چمک پتلیوں کی تابندگی کھو چکی ہے۔ یا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پھر یہ دو موتی کیا تھے۔ شاید یہ دو آنسو تھے جنہیں تپش کے دیو کے لان سے بھاگ نکلنے والے کسی برفاب جھونکے نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ شاید اسی لئے مسافر کو چند لمحوں کے لئے اپنے چہرے پر سکون پرور خنکی کا احساس ہوا تھا۔ جیسے کسی نے اس کے چہرے پر ٹھنڈک کی لیپ کر دی ہو۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں بند نہیں تھیں۔ کیوں کہ اسے اپنے پاس شہد کی مکھیوں یا بھڑوں کے خالی چھتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے جیسے آنکھ کو انگلی سے دبانے پر فضا میں چھوٹے چھوٹے مادّہ آرگن پستی سے بلندی کی طرف اور ایک سمت سے دوسری سمت تک پہنچتے اور پلٹتے یا گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے آس پاس دُور دُور تک لق و دق ویرانہ تھا۔ ریت اور مٹی کا پیوست زمین جنگل جیسے ہزاروں اژدہوں نے اپنے موٹے بھدے بوجھل جسموں سے روند کر مسخ کر دیا ہو، پامال کر دیا ہو، زمین تو چاہے کسی شکل میں ہو، اگر اس پر ظلم و زیادتی کے شگاف نہ ہوں، اس کی پست و بلند چڑھائیاں یا اُترائیاں، اس کے نشیب و فراز، اس کی گہرائیاں، اس کے سنسان میدان اور آباد قطع ہائے ہموار، زمین جو زندگی کی ماں ہے، اس کے وجود کا ہر حصہ، ہر عضو اپنے ہی حسن اور دل کشی کی کہانی سناتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ قطعۂ زمین تو وہ نہیں تھا جس کی عظیم وسعتوں میں وہ سفر کے لئے نکلا تھا۔ یہ تو کوئی حیات باختہ میدانِ ریگ و خاک تھا جس کی فضا میں ہوا کی ایک زندہ لہر بھی نہیں تھی۔ یکایک ایک ہولناک احساس نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی جلد کے مساموں کے اوپر خوابیدہ بالوں نے گڑی ہوئی صلیبوں کی طرح اپنے اجسام تان لئے، خوف نے جیسے جلد کے ہر روزن سے سہمی ہوئی آنکھوں کی طرح جھانکا اور اسے

ں ہوا کہ زمین کے جس ٹکڑے پر وہ کھڑا تھا وہ فضلے سے خالی تھا۔ تو کیا وہ کسی سراب زار میں نکل آیا ہے؟ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان
ی۔ اس کے اوپر بھوک اور پیاس کی پپڑیاں نہیں تھیں۔ اسے اپنا پیٹ بھی خوراک کے حبس سے بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تو پھر یہ کیا
؟ ایسا تو نہیں کہ بھوک، پیاس اور طلب کی انتہا نے اس کے ہر احساس اور ہر اشتہا کو موت کی نیند سلا دیا ہو! اور وہ سامنے پھیلی ہوئی
یاں اور ٹیلے سراب کے تصوراتی وجود کا حصہ ہوں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہاں اُسے چمن زاروں اور نخلستانوں کے جھومتے ہوئے سرسبز شہر
ئی دیتے۔ دریاؤں اور چشموں کے خوشی سے ناچتے جھومتے قافلے نظر پڑتے۔

لیکن یہاں تو ہر چیز موت کی خاموشی میں لپٹی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ سورج کے جسم سے نکلتی ہوئی شعلوں کی زبانیں بھی خاموش ہیں
ں کہ وہ اتنا دور دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ـــــــ وہ کتنا قریب ہے۔ اس کی تپش جلانے والی، جھلس کر خاک کر دینے والی روشنی
ے جسم میں سرایت کر رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں میرا وجود جل کر خاکستر ہو چکا ہے۔ میں ایک تودۂ خاک میں تبدیل ہو چکا ہوں۔ جبھی تو
ن لیوا تپش مجھے محسوس نہیں ہوتی۔ یا میں سورج کے آتشیں شہر سے جلاوطن کی گئی مخلوق کا ایک فرد ہوں۔ ہاں، شاید ایسا ہی ہے لیکن میرا
ٹھنڈا کیوں ہے۔ مجھے اپنے ہونٹوں پر حرارت آمیز سانس کی تھپکی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ میری آنکھوں میں بصارت کے یہ دو موتی
تک کیوں چمک رہے ہیں۔ میں پگھل کیوں نہیں گیا۔ نہیں نہیں۔ میں یقیناً اسی زمین کا باسی ہوں جس پر میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔
اب تک یاد ہے، اس وقت میں نے سوچا تھا کہ اپنی منزل کا یقین کر لوں۔ سفر کے لئے رختِ سفر بھی ضروری ہوتا ہے۔ لیکن بڑا عجیب سا
آیا تھا۔ اس دنیا کے لاکھوں کروڑوں انسان کون سے ایسے ہیں جو اپنی منزل کا یقین کر کے سرگرمِ سفر ہیں۔ ان کے پاس بھی رختِ سفر
۔ طعام و آرام کا اور نہ اعمال کا۔ سیاہ اوراق کی ایک مجلد کتاب ہے جو خدا معلوم ان کے دائیں ہاتھ میں ہے یا بائیں ہاتھ میں۔ ایک
م سا خیال رہزنوں کا بھی آیا تھا جس نے اس خیال کو پختہ کر دیا کہ بے رختِ سفر قرینِ مصلحت ہے۔ اعمال کی کتاب میں سے ایک روشن
یسے ہاتھ سے پڑھا گیا تو منزل کے نشان نظر آ جائیں گے۔ بھٹکنے کا خوف بھی تھا۔ یہاں پھر اسی بات نے دلاسا دیا کہ اس دور میں زندگی
راستے پر سب انسان ان ہی راستوں پر چل رہے ہیں جو کسی منزل کی طرف نہیں جاتے۔ یا شاید وہ راستوں پر چل ہی نہیں رہے۔ قر
ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ساکن سفر، یہ غیر متحرک چال، یہ خوابیدہ جنبش، نطق کا یہ بے آواز گنبد، ظلمتوں کی بارش برساتی ہوئی یہ
ن آنکھیں، محبت، انصاف، درد اور سوز سے، دھڑکن سے خالی یہ دل، تدبر، فہم و ادراک اور بصیرت سے تہی یہ دماغ اپنی بقا اور
ل کے کس قافلے کے مسافر ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوں۔ میرا دامن ان ہی کی طرح بوجھل لیکن وزن سے خالی ہے لیکن شاید ان
ور مجھ میں ایک فرق ضرور تھا۔ میرے ذہن میں ایک ایسی منزل کا تصور ضرور تھا جو روزِ ازل سے کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ وہ کسی
ت بڑی زورآور طاقت نے جو اس کائنات میں مرکزی اور فیصلہ کن حیثیت کی مالک ہے انسان کو عقل و دانش کی فضیلت بخشتے ہوئے
کی آنکھوں سے اوجھل کر دی تھی، وہ اس نے ابھی تک کہیں چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ شاید اس کے سنگِ سفر کے آخری تعویذ کے گرد و پیش
ہزاروں لاکھوں میلوں تک سوچوں کو اندھا کر دینے والا جنگل پھیلا ہوا ہے۔ اس گم شدہ منزل پر پہنچ کر انسان کو کیا ملے گا۔ شاید
اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ شاید وہ انسانیت کی تکمیل اور آدمیت کے انتہائی عروج و کمال کی منزل ہوگی۔

لیکن میں یہ کہاں پہنچ گیا ہوں۔ اس دنیا کی ہر چیز میرے راستے سے ہٹ گئی ہے۔ یا میں اس دنیا کے راستوں سے بہت
ر نکل گیا ہوں۔

اسے اپنے پیروں کے نیچے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ وہ سوچنے لگا " شاید میرے جسم کی تمام حرارت پیروں کے راستے زمین میں جذب
ہی ہے۔ میں سر تا پا زندگی کی حرارت سے محروم ہو چکا ہوں۔ لیکن میری سوچ کے سمندر میں تو ابھی طرح بلا کی گردش ہے۔ میں جیسے

پاؤڈر کے ایک ڈھیر میں دھنس گیا ہوں۔ کیا میری زمین پر خاک کے ایسے ذرے بھی ہیں؟ نہیں، شاید نہیں۔ یہ سیم و تھور سے آلودہ بیمار زمین کا کوئی ٹکڑا بھی نہیں۔ نہ یہ مخمل و کمخواب کا فرش ہے۔ نہ اس زمین پر برف کا چونا گرتا ہے۔ پھر یہ کیا ہے؟ پھر یہ کون سی زمین ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے اٹھا کر زمین سے کسی ایسے ستارے کی سرزمین پر لا پٹخا ہو جو کشش ثقل اور فضا سے خالی ہو۔ ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے وجود کا وزن اور توازن تو برقرار ہے اور میرے جسم پر حفاظتی خلائی لباس بھی نہیں ہے میرے سر پر مخصوص ٹوپی اور آنکھوں پر چشمہ بھی نہیں ہے۔ میں زمین پر لڑھکنے کی بجائے سیدھا کھڑا ہوں۔ میرے جسم کے ابھی تک پرخچے بھی نہیں اڑے . . . .

یکایک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ واقعی کسی ایسی دنیا میں پہنچ گیا ہے جہاں سے اس کا زندہ بچ کر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اس کے رونئیں رونئیں میں خوف اور دہشت کی کئی تازہ لہریں اُبھریں اور اسے یوں لگا جیسے غنودگی نے اس کے پورے نظامِ اعصاب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس نے دیکھا سورج کا چہرہ بھی سونے اور دھوئیں کے پردے کی طرح خاموش اور پُرسکون ہو گیا ہے۔ اس نے سامنے پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے نشیب میں پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلیں دیکھیں۔ ان کے کناروں پر برف کی طرح شور کی سفید کائی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے دور سے کوئی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر ہوا کے دوش پر آ کر معلق ہو جاتی ہے۔ کوئی طاقت آواز کو اس تک پہنچنے سے پہلے روک لیتی ہے۔ پھر ایک چیخ سی سنائی دیتی ہے، جیسے کسی نے آواز کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کا پورا وجود روئی کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ غنودگی کا جھونکا تو ابھی گزراں کے چہرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کوئی ہنڈولہ ہے جو اسے زمین سے اٹھا کر اس فریاد کناں معلق آواز تک لے جاتا ہے۔ وہ آواز کو اپنی سماعت کی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے لیکن حرکت کرتے ہوئے ہنڈولے کی نشستیں تیزی سے زمین کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔ پھر ہنڈولہ ٹھہر گیا اور اس کی سب سے اوپر والی نشست پر وہ آواز کے اتنا قریب پہنچ گیا جیسے وہ آواز اس کے اپنے منہ سے نکل رہی ہو۔ نیم خوابیدگی کے عالم میں اس نے سنا، کوئی کہہ رہا تھا "خوش آمدید دوست!" آواز کا والیوم اس کی سماعت کے درجے تک کم اور واضح ہو جاتا ہے۔ "تم اس وقت مریخ کی آغوش میں ہو۔ زمانۂ حال میں میری دھرتی پر قدم رکھنے والے تم پہلے انسان ہو۔ [illegible] میرے ہوئے تو لاکھوں برس گزر چکے ہیں۔ تم نے جدید ترین سائنس کی تاریخ میں یہ باتیں تو پڑھ ہی لی ہوں گی کہ کبھی یہاں بھی آباد تھا۔ میری دھرتی کے سینے پر سرسبز و شاداب باغ، کھیت، ندیوں اور دریاؤں کی فراوانی تھی۔ یہاں بھی مخلوقات کے ہجوم تھے۔ ہر طرف امن، محبت اور مسرت کے نغمے گونجتے تھے

زندگی پوری رعنائیوں کے ساتھ اپنے ارتقائی سفر پر پُرسکون ہم آہنگی کے ساتھ رواں دواں تھی۔ ہم نے ایسی ایسی ایجادات اختراع کیں جو ہماری مخلوق کو زندگی کی عظیم راحتوں سے ہمکنار کر رہی تھیں۔ ہماری کھیتیاں بہشت کی نعمتوں سے بھی بڑھ کر لذیذ پھلوں اور میووں کی نعمتیں اگلتی تھیں۔ ہر طرف ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں کے چشمے ابلتے اور دریا بہتے تھے۔ ہم نے اپنی مخلوق کے لئے ایسی ایسی گاڑیاں اور ہوائی کھٹولے ایجاد کئے جو پلک جھپکنے کی دیر میں میلوں کا سفر کرتے تھے۔ لباس و طعام میں ایسے ایسے خوشنما فیشن ایجاد کئے کہ ہماری دھرتی پر چلنے والا ہر فرد تمہارے قدیم زمانوں کے بادشاہوں کی طرح نظر آتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ہماری دنیا برباد ہو گئی۔ یوں سمجھو کہ تباہ کر دی گئی۔" اتنا کہہ کر آواز نے تامل کیا۔ اب اس کا لہجہ گلوگیر تھا۔ "تمہاری تاریخیں تو اس کے بعد کے واقعات پر خاموش ہیں لیکن ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اپنے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے میں تمہیں بتا دوں کہ ان دنوں تمہارا ستارہ سائنسی ترقی کے انتہائی عروج پر تھا۔ آج کے زمانے میں تو اس عہد کی نسبت ابھی اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اس دور میں تو اس نے ایسے ایسے ہلاکت خیز ہتھیار اور بم ایجاد کر لئے تھے جو شہر تو درکنار پورے پورے ملکوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دینے کے لئے کافی تھے۔ بیس تیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے اور اڑنے والے

طیارے اور میزائل ہر ملک میں عام تھے۔ آج کل کی نسبت اس زمانے میں تمہاری زمین پر سینکڑوں ممالک نہیں تھے۔ بس دس پندرہ بڑے بڑے ملک تھے جن کے رقبے ہزاروں لاکھوں میلوں پر محیط تھے۔ ہمارے سیارے کا حکمراں بہت نیک اور امن پسند تھا۔ ہمارا سیارہ ترقی و عروج کی اس منزل پر تو نہیں تھا جس کے لئے تمہاری زمین پوری کائنات میں مشہور تھی لیکن کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں تھا صرف ایک بات میں ہم تم سے پیچھے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہلاکت خیز ہتھیار اور بم بنائیں۔ ہمارے سیارے میں بھی دس پندرہ ملک تھے پورے سیارے کی آبادی چند کروڑ نفوس پر مشتمل تھی۔ ان دس پندرہ ملکوں کی ایک مشترکہ وفاقی حکومت تھی۔ صرف ایک حکمراں تھا۔ تدبر اور دانش و حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ جب تمہاری زمین کے ملکوں کے ساتھ ہمارے سفارتی تعلقات قائم ہوئے اور خیرسگالی کے طور پر وفود کا تبادلہ ہوا تو زمینی انسان کی آنکھیں ہماری ترقی اور خوش حالی دیکھ کر رشک و حسد سے خیرہ ہو گئیں۔ تاہم یہ معلوم کر کے ان کی حرص و ہوس کے جذبات کو تسکین ہوئی کہ ہم سامانِ تخریب و حرب پر یقین نہیں رکھتے۔ بس پھر کیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ زمین کا ہر ملک ہمارے سیارے کو اپنی کالونی بنانے پر تل گیا۔ ہر طرف سے ہمیں تباہ و برباد کرنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ اپنی حفاظت ہم کر نہیں سکتے تھے کیوں کہ ہماری سرشت میں لڑنے اور تخریب کے عناصر ہی نہیں تھے۔ ہماری تمام مخلوق اس نئی صورتِ حال سے سخت دہشت زدہ اور پریشان ہو گئی۔ زمین کے تمام ممالک بھی آپس میں دست و گریبان ہو گئے۔ ہر ملک نے اپنے طور پر ہمیں طرح طرح کے لالچ دیئے کہ ہم ان کی کالونی بن جائیں لیکن ہم اس کے لئے رضامند نہ تھے۔ آخر ایک بڑی طاقت نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر تم نے ہماری محکومیت قبول نہ کی تو تمہارے سیارے کے لئے چند درجن بم ہی کافی ہیں۔ صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے جاؤ گے۔ جب صورتِ حال اتنی سنگین ہو گئی تو ہم نے ایک دوسرے بڑے زمینی ملک سے امن اور باہمی دفاع کا معاہدہ کر لیا۔ پھر کیا تھا، زمین پر ہاہاکار مچ گئی۔ مجبوراً ہم نے اس ملک کو بموں اور میزائلوں کی تنصیب کے لئے اڈے فراہم کر دیئے۔ یہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے اتحادی ملک اور ایک دوسرے بہت بڑے ملک کے درمیان ہولناک جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں نہ صرف ہمارے تمام ممالک تباہ و برباد ہو گئے بلکہ زمین پر ہمارا اتحادی ملک بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ ہمارے سیارے پر جو چند ہزار نفوس زندہ بچے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر ختم ہو گئے۔ اس طرح ہمارے سیارے پر زندگی مکمل طور پر معدوم ہو گئی۔ اب ہمارے سیارے کی دھرتی، اس کی تہذیب و ثقافت، اس کی عمارتیں اور تباہ شدہ شہر لاکھوں برس سے گرتی ہوئی شہابی راکھ کے انباروں تلے دفن ہو چکے ہیں۔ لاکھوں برسوں کے بعد انسان نے ایک مرتبہ پھر ہماری دھرتی پر قدم رکھے ہیں۔ ہمارے سیارے پر اس کے دو تین بڑے ملکوں کے مصنوعی سیارے اترتے رہتے ہیں۔ مدار میں گردش بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہ یہاں زمین کا ماحول قائم کر کے اسے آباد کرنا چاہتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ ایک مرتبہ پھر ہم آباد ہوں گے۔ زمینی انسان ہمارا ایک پرانا قرض چکا رہا ہے۔"

آواز خاموش ہوئی تو مسافر بولا: "لیکن تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس کے بعد ہماری زمین پر کیا بیتی؟ اس پر زندگی کیسے معدوم ہو گئی اور اتنی عظیم تہذیب اور ترقی یافتہ تمدن کا خاتمہ کیسے ہوا؟"

"ہوا یوں کہ اس کے بعد زمین پر انسان نے اتنی ترقی کر لی کہ ہلاکت خیز ہتھیاروں اور تباہ کن دھماکہ خیز بموں سے ایسی ایسی ہولناک جنگیں لڑی گئیں کہ اس صدی کی زمین پر لڑی جانے والی دو عظیم جنگیں ان کے سامنے کھلونوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔ ان جنگوں میں زمین کی اسّی نوّے فی صد آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔ شہروں کے شہر حتیٰ کہ ملک تک صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ بموں کے ذخیرے الیکٹرانک ٹیکنک سے تہ خانوں میں ہی قیامت خیز دھماکوں سے تباہ کر دیئے جاتے۔ اس کے ساتھ شہر کے شہر بھی تباہی و بربادی کے گھاٹ اتر جاتے۔ زمانۂ امن میں ہی ہوائی جہاز اور طیارے اپنے اپنے حربی مراکز سے بیٹھے بیٹھے منٹوں سیکنڈوں میں بھک سے اڑا دیئے جاتے۔ زمین پر انسان کی فطرت نے

حیوانیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ وہ آپس میں ایٹمی اور کیمیائی ہلاکت خیز ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس طرح لڑے کہ پوری زمین کی فضا زہر آلود ہوگئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں زمین پر زندگی کے آثار معدوم ہوگئے۔ پھر زمین پر ایک برفانی دور آیا جس نے انسانی بربریت کو لباسِ تدفین پہنا دیا گیا۔ آج کا انسان اپنی دفن شدہ بربریت کی تاریخ کو ایک مرتبہ پھر بڑی تیزی سے دہرانے کی فکر میں ہے۔" آواز خاموش ہوگئی۔ مسافر کا سینہ یہ ہولناک داستان سن کر فگار ہوگیا۔

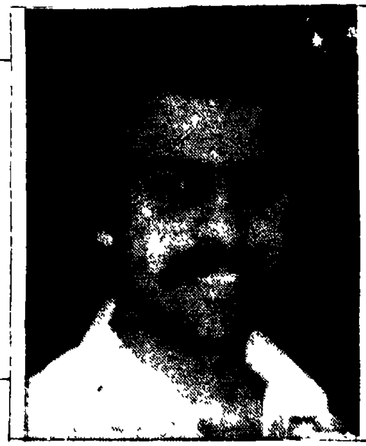
"لیکن دوست! مریخی مخلوق تو معدوم ہوچکی۔ اب انسان اگر تمہارے سیارے کو آباد کرے گا تو اس پر زمینی انسان ہی ہوگا یہ تو تمہارے سینے پر مونگ دلنے والی بات ہوگی۔ کیا تم واقعی اس ممکنہ نئی زندگی کے تصور سے خوش ہو؟"

آواز نے ایک ٹھنڈی سانس بھری: "ہاں، کیوں نہیں۔ ذرا سوچو تو ہماری زمین، ہمارے ماحول، ہمارے خلا، ہمارے کہساروں دریاؤں کو آبادی اور زندگی کی نئی دھڑکن ملی تو عین ممکن ہے ہماری دھرتی پر ارتقا کی رکی ہوئی گھڑی ایک مرتبہ پھر چل پڑے جو زندہ عناصر کی موت سے ناکارہ ہوگئی تھی۔ اور پھر سچ پوچھو تو مجھے ایک خوشی یہ بھی ہے کہ اس سیارے پر انسان جیسی ظالم اور جابر مخلوق آباد ہوئی تو کوئی وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ یہ ستارہ زمین پر تباہ کن حملہ کر کے اپنی تباہی و بربادی کا انتقام لے سکتا ہے۔"

"اچھا، تو یہ بات ہے۔ لیکن میرے دوست! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آج کے انسانوں میں اکثریت ایسے انسانوں کی ہے جو نہ صرف اپنے سیارے کو بلکہ پوری کائنات کو امن، محبت، شرافت اور انسانیت کے عظیم ترین اصولوں سے مسخر کر کے اسے ایک عظیم الشان بہشت میں بدل دینے کا تہیہ اور عزمِ راسخ کئے ہوئے ہیں کہ میرے سیارے، تیرے سیارے اور کائنات کے ہر اس سیارے کی مخلوق جو زندہ و موجود ہے انسان کے اس عظیم الشان کارنامے پر تا قیامت فخر کرے گی۔"

مسافر کو آواز کی طرف سے اپنی اس بات کا کوئی جواب نہ ملا۔ شاید آواز غائب ہوچکی تھی۔ مسافر نے اپنے جسم میں حرارت کی ایک نئی برقی رَو دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے پھیلی ہوئی پہاڑیوں کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں پہاڑیوں کے بجائے سرسبز و شاداب درختوں، پھولوں اور گھاس کے قطعوں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں مہکتے ہوئے چمن زار اور نخلستان تھے۔ اور اس سے پرے سبز گیاہ ٹیلوں اور پہاڑیوں کے بجائے اونچے درختوں، سبزے، پھولوں اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور فلک بوس بلند و بالا پہاڑ نظر آرہے تھے۔ اس کے قدم اب بیمار اور نیم بنجر زمین پر نہیں بلکہ ایک ایسی شاہراہ پر تھے جو سیدھی ان حسین مرغزاروں کے بیچ میں سے ہو کر گزرتی تھی جس سے آگے کچھ دور شاید اس حسین منزل کا آخری سنگِ سفر نصب تھا جس کی آدرشی تلاش میں وہ گھر سے نکلا تھا۔


ANOTHER QUALITY PRODUCT
FROM UNION
UNION
JACK N JILL
TOFFEES
REAL CHEWY CANDY
UNION The Biggest name in wholesome taste
Midas Khi



طارق محمود

کمیونیکیشن گیپ

"کون ــ ؟" ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ نیند سے چونکا اور ریسیور کو ہاتھ میں تھام لیا۔

"فور تھری زیرو فور" چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد ایک نسوانی آواز اس کے کان کے پردوں سے ٹکرائی۔

"کون۔ !"

"آپ کون ہیں۔ میں، میں ہوں اور آپ !" اس سے لمحے بھر کے لئے کوئی جواب نہ بن پایا۔" اور آپ اپنا تعارف کرائیں گی۔ کون ہے، کس سے بات کرنا ہے؟"

"میں کون ہوسکتی ہوں !" خاتون کے لہجے میں کتنی غیر یقینیت تھی۔

"فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"میری مدد؟" وہ بلکے سے کھل کھلا کر ہنسی۔" بس فون تھام کر مجھ سے باتیں کرتے جائیے گا، رات گئے ــ"

"رات گئے۔ !"

"تو کیا ہوا؟" وہ بھری آواز میں ہنسنے لگی۔"میں بھی تو رات گئے آپ سے باتیں کررہی ہوں۔"

"اچھا آپ کو کیسے خیال آیا مجھے فون کرنے کا !" اس کے دل میں گفتگو بڑھانے کی دلچسپی پیدا ہوئی۔

"بس یوں ہی نیند نہیں آرہی تھی۔ بستر پر کروٹیں لے رہی تھی۔ جی میں آیا فون ہی گھمادوں۔" وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔

"آپ کہیں خواب میں تو نہیں ؟" اس نے بظاہر اسے چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

"خواب میں تو نہیں۔ خواب آلود کیفیت میں ہوں۔" وہ دبی ہنسی ہنسنے لگی۔

"کب سے ؟" اس نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"آپ سے ہم کلام ہوتے ہی۔"

"ذرہ نوازی۔ یہ بتائیے میرا نمبر آپ کو کہاں سے مل گیا۔"

"آپ کا نمبر۔ میرے مقدر میں تھا۔"

"یو مسٹ بی جوکنگ ــ"

"بس ڈائل گھمایا آپ مل گئے۔ کیا آپ کو بھی کسی کے فون کا انتظار تھا۔"
"مجھے بھلا کس نے فون کرنا تھا۔" اس نے خاتون کی ہمدردی چاہی۔
"سنئے، آپ کی آواز بڑی پرکشش ہے۔" وہ ملائمت سے بولی۔
"ارے یہی بات تو میں آپ کے بارے میں کہنا چاہتا تھا۔ اسے کہتے ہیں حُسنِ اتفاق۔"
بستر پر شاید چرچراہٹ ہو رہی تھی اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک ہاتھ سے کچھ سہلا رہی ہے۔
"گھر میں کون ہے۔"
"میں اس وقت اکیلی ہوں۔"
"اکیلی!"
"ہاں، بس چھوٹو ہے۔ میرا بیٹا پہلو میں سویا ہوا ہے۔" گویا وہ شادی شدہ تھی۔
"آپ ـــ!"
"ہاں، میں شادی شدہ ہوں۔ آپ یہی پوچھنا چاہتے تھے ناں۔"
"جی آپ سمجھ گئیں۔"
"آپ کے گھر میں کون کون ہے؟"
"میں تو اکیلا ہی ہوں۔ بس میری بچی ہے جو اس وقت سو رہی ہے۔"
"آپ ـ!"
"میں شادی شدہ ہوں۔"
"بیگم کہاں ہے۔"
"اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر۔"
"کیا مطلب!"
"خیر چھوڑیئے اس بات کو!"
"ویسے کہاں ہے آپ کی بیوی؟"
"وہ تو کئی دنوں سے میکے گئی ہوئی ہے۔ بچی میرے پاس چھوڑ گئی ہے۔ اسکول چلی جاتی ہے۔"
"میکہ کہاں ہے؟"
"اسی شہر میں۔"
"اوہو میں سمجھی! تو کھانے پکانے کا کیا کرتے ہیں۔"
"خانساماں ہے۔ آپ کیوں متفکر ہیں۔" وہ ہلکی ہنسی ہنسا۔
"میں یوں ہی پوچھ رہی تھی۔"
"آپ کے میاں؟"
"وہ گھر پر نہیں ہیں۔"

"رات گئے !"
"کپاس کی بوآئی کا موسم ہے ناں۔ گزشتہ کئی راتوں سے باہر ہیں۔ فارم پر ہی رہتے ہیں۔"
"کپاس کی بوائی۔ آپ کو یقین ہے رات گئے وہ کپاس کی بوائی میں مصروف ہوں گے۔"
"مرد کی کسی بات کا یقین تو نہیں کیا جاسکتا۔ گھر سے تو یہی کہہ کر گئے ہیں سنڈیاں مارنے جارہا ہوں۔ ویسے مجھے کچھ کچھ خبر ہے۔"
"کیا۔ ؟"
"بس یہی کپاس کی بوائی کے علاوہ اور بھی ہنگامہ آرائی ہوتی رہتی ہے۔"
"ہنگامہ آرائی !"
"خیر چھوڑیے۔ راتیں جب نہیں کٹ پاتیں تو کبھی کبھار ڈائل گھمانے لگتی ہوں۔ اچھا آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"
"آپ نے پوچھا ہی کب !"
"چلیں اب پوچھ لیتی ہوں۔"
"پوچھیے !"
وہ دونوں ہنسنے لگے۔
"آپ کیا کرتے ہیں ؟"
"آپ سے باتیں۔ ہا ہا ہا ——"
"میرا مطلب ہے کام۔"
"بس چھوٹا سا بزنس ایگزیکیوٹو ہوں۔"
"چھوٹا سا اور بزنس ایگزیکیوٹو۔"
"کیوں حیرت ہوئی ہے آپ کو۔"
"بزنس ایگزیکیوٹو تو چھوٹا نہیں ہوتا۔"
"بس یونہی سمجھ لیں۔"
"سنئے !"
"جی !"
"آپ سے باتیں کرنے میں بڑا لطف آرہا ہے۔"
"ایسی بھی کیا بات ہے۔"
"آپ مجھے بہت ڈیسنٹ لگتے ہیں۔ ورنہ فون پر کسی سے بات کی اور وہ ساتھ ہی بے صبرا ہو کر کہتا ہے، بی بی مطلب کی بات کریں۔"
"مطلب کی بات !"
"خیر چھوڑیے، اس وقت اپنی باتیں کریں۔"
"اچھا، ایک بات بتائیے۔ آپ کے اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات کیسے ہیں ؟"

"بس جیسے ہونے چاہئیں، گھر بار چلانے کے لئے۔"
"آپ اپنی بیوی کو بہت چاہتے ہیں؟"
"اوہو، بہت مشکل سوال کر دیا آپ نے۔"
"مشکل سوال؟"
"مشکل اس لئے کہ اس پہلو کے بارے میں تو آج تک سوچا ہی نہیں۔"
"کوئی شکایت رہتی ہے اس سے؟"
"بظاہر تو نہیں۔ بس ذرا سا کمیونیکیشن گیپ بڑھتا جا رہا ہے۔"
"کب سے؟"
"آپ سے باتیں کرتے اس گیپ کا زیادہ شدت سے احساس ہو رہا ہے۔"
"اوہو! ہاؤ سوئیٹ!"
"کیا ہم ایک دوسرے کی مدد کر پاسکیں گے۔"
"یہی بات تو میں سوچ رہا ہوں۔ لگتا ہے آپ کا بھی کچھ ایسا ہی پرابلم ہے۔" وہ خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ "اچھا سنئے۔"
"جی!"
"ایک بات پوچھوں؟"
"ہاں ہاں، پوچھئے۔"
"برا تو نہیں منائیں گے۔"
"آپ کی بات کا؟"
"شکریہ۔" وہ کچھ توقف کے بعد بات شروع کرتی ہے۔ "کیا میں کبھی کبھار فون کر لیا کروں۔"
"ہاں، ہاں!"
"اگر آپ کی بیوی نے اٹھا لیا تو۔"
"تو کہہ دیں، سوری رانگ نمبر۔ اور آپ نے اپنا نمبر نہیں بتایا۔"
"وہ بھی بتا دوں گی۔"
"اور نام —"
"وہ بھی۔"
"اور میں آپ سے ملنا بھی چاہوں گا۔"
"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔"
"ملنے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ آپ کی باتوں نے ویسے بھی بڑا خوشگوار تاثر چھوڑا ہے۔ کچھ بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔"
"آپ ضرور ملنا چاہتے ہیں؟"
"ہاں —!" اچانک اسے گھنٹی بجنے کی آواز آتی ہے۔ اس خاتون کے گھر پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ "اچھا، خدا حافظ۔"

بتاتا ہے۔
"نہیں، نہیں! آپ فون نہ بند کریں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ گھر میں کوئی نہیں۔ میں دیکھتی ہوں کون اس وقت دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔"

"آپ آواز دے کر پوچھ لیں، دروازہ نہ کھولیں۔" وہ دھڑکتے دل سے کہتا ہے۔

"ہاں، میں صحن میں جا کر دیکھتی ہوں۔ آپ فون نہ بند کیجئے گا۔"

"نہیں کرتا۔"

"وعدہ!"

"وعدہ!"

وہ ساعتوں کے بعد ریسیور اٹھاتی ہے۔ "ہیلو!"

"ہیلو! کون تھا؟"

"یوں ہی کوئی فضول شخص رات گئے کسی کے گھر کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ میں تو ڈر گئی۔"

"ڈرنے والی کون سی بات۔" اب اس کے دل کی دھڑکن بھی نارمل ہوتی جا رہی ہے۔

"سنیئے!"

"جی!"

"میں نے کہا ناں میں آپ کو صرف دیکھنا چاہوں گا۔"

"بس!"

"ہاں، فی الحال۔" وہ فون پر مسکراہٹیں بکھیرتا ہے۔

"تو کیسے دیکھ پائیں گے۔"

"یوں کیجئے گا۔ کل شام تک سینٹر پر آجائیے گا۔"

"لیکن وہاں تو بہت رش ہوتا ہے۔ میں آپ کو کیسے پہچان پاؤں گی۔"

"میں نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ہوں گا۔"

"نیلے رنگ کا سوٹ!"

"ہاں! اور میری گھنی سیاہ مونچھیں ہیں۔"

"اور آپ کی آنکھیں کیسی ہیں؟"

"وہ تو دیکھنے پر!" وہ جھینپ سا جاتا ہے۔ "وہاں بیگوئین سیریز کے پاس کھڑا ہوں گا۔ اور آپ کو کیسے پہچانوں گا۔"

"میں نے سیاہ گاگلز پہن رکھی ہوں گی اور میرے شانوں پر براؤن سٹول ہو گا۔"

"گاگلز اور سٹول تو آج کل فیشن بن چکا ہے۔ اور شام گئے تو وہاں بہت سے حسین چہرے آ دھمکتے ہیں۔"

"اچھا یوں سہی، چھوٹو میرے ساتھ ہو گا۔ ریمبو اسٹائل کی شرٹ میں ملبوس ہو گا۔"

"او ہو۔ آپ کا بیٹا ریمبو اسٹائل ہے۔"

"آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں" وہ ہنستی ہے "بڑا کریزی ہے۔ گھر میں ایڈ و یچرز کے ڈھیر لگائے رکھتا ہے۔"

"چھوٹا سا بچہ اور کامک ——"

"بس، جنون کا بھلا عمر سے کیا تعلق۔"

"آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" وہ اس کی بات سنتے ہی ہنسنے لگتی ہے۔

رات ڈھلنے کو ہے۔ آخری لمحوں پر دونوں طرف سے شب بخیر ، "شب بخیر" کی آواز اُبھرتی ہے۔ وہ ریسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے۔ وہ ڈھیر سا کلون چھڑک کر بک سینٹر کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس وقت ایک عجیب سے مہماتی جذبے سے معمور ہے۔ کیا بات کہے گا، کہاں لے کر جائے گا۔ وہ اپنے بچے کے ساتھ ہوگی کہیں ریستوران میں چلے جائیں گے۔ بچے کو کون آئس کریم سے بہلا لیں گے۔ آج تو پہلی ملاقات ہے۔ بس یوں ہی دیکھ لیا جائے۔ ہیلو ہیلو ہو جائے۔ وہ کوئی واضح فیصلہ نہیں کر پایا۔

بُک سینٹر کے اندر بہت گہما گہمی ہے۔ لوگ کتابوں کے ریکوں کے ساتھ جتے ہوئے ہیں۔ کاؤنٹر پر بھی لوگوں کا ہجوم ہے۔ پھر وہ نظریں دوڑاتا ہے۔ ایک خاتون کچھ ہی فاصلے پر ایک بچے کی انگلی تھامے کھڑی ہے۔ کتابوں کو خالی نظروں سے گھور رہی ہے۔ بچے نے ریمبو اسٹائل ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ اس کی نظریں بچے سے ہٹ کر اس خوب رُو خاتون کی طرف مرکوز ہونے لگتی ہیں۔ دونوں چوری چوری ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ زیرِلب مسکرا رہے ہیں۔ بچہ ماں کی انگلی چھڑا کر بھاگتا ہے۔ "کہیں نہ جاؤ!" وہ چلّا کر کہتی ہے۔ وہ بچہ بدستور بھاگ رہا ہے۔ بچے کی آنکھوں میں عجب چمک ہے۔ "ابّو آپ یہاں کیا کر رہے ہیں"۔ بچہ اس کا بازو تھام لیتا ہے۔ "بیٹے تمہارے لئے کامک خریدنے آیا ہوں۔" اس کی آواز حلق میں اٹک جاتی ہے۔ "عجیب بات ہے۔ امّی میرے لئے کامک لینے آئی ہوئی ہیں۔"

وہ نظریں گھما کر باری باری حیرت سے دونوں کی طرف دیکھتا ہے۔



طاہرہ بلوچ

سوچوں کا جزیرہ

رات کی سیاہی کائنات پر محیط تھی۔ خاموشی کی چادر چاروں طرف پھیلی تھی۔ کبھی کبھی کسی جھینگر کی کوئی تیز سی آواز یا کسی کتے کے بھونکنے کی آواز چند ساعتوں کے لئے خاموشی کی چادر میں سلوٹیں ڈال دیتی۔ اور پھر رات کا سحر چادر کو اپنے ہاتھوں سے دوبارہ پھیلا دیتا۔ ابتدائی گرمیوں کی یہ رات نہ جانے کیوں پُراسرار سی لگ رہی تھی۔ کمرے میں کچھ گھٹن سی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ پردہ اٹھاکر باہر جھانکا۔ سیاہی کا سمندر چاروں اور طغیانی پر تھا۔ چاند اپنے بادبان سمیٹے کسی ناخدا کا منتظر تھا۔ لیکن ستاروں کے ننھے منے بجرے اپنی ناتمام روشنی سمیٹے اس سمندر میں ہچکولے کھا رہے تھے۔ وہ دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ یوں ہی بے مقصد — بے فائدہ —— اور شاید بلاوجہ —— کچھ دیر بعد کھڑکی کا پردہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شاید دیر تک اُسے تھامے رہنے سے اس کے ہاتھ سُن ہوگئے تھے بالکل زندگی کی طرح جو اس کے جسم کو تھامے تھامے سُن ہو چکی تھی۔ وہ ایک جد و جہد اور حرکت چاہتی تھی جو اس کی زندگی کو دوبارہ زندگی عطا کردے۔

سُن کا احساس زیادہ ہوا تو وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ برآمدے کے ستون سے عشق پیچاں کی بیل نہایت پیار سے لپٹی تھی۔ گلاب کے پودوں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ خوشبو کا احساس اُسے رنگوں سے روشناس کرانے لگا۔ یہ تیز خوشبو سرخ گلاب کے پودوں سے آرہی تھی۔ کچھ ہلکی ہلکی خوشبو سفید اور گلابی رنگ کے گلاب کے پھولوں کا تعارف کرا رہی تھی۔ اور ان سب سے الگ تھلگ ایک اور خوشبو ہوا کے دوش پر سوار اس تک آپہنچی، تھکی تھکی —— مضمحل سی۔ وہ جان گئی۔ یہ زرد گلاب کی خوشبو ہے۔ نہ جانے اس گلاب کے مقدر میں اللہ تعالیٰ نے اُداسی کا اتنا گہرا رنگ کیوں بھر دیا ہے؟ مگر —— یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ پھول باقی تمام پھولوں سے زیادہ حساس ہو۔ اور یہی احساس سوچ میں ڈھل کر اُسے اُداس بنا دیتا ہو۔ اور پھر اس کی سوچ کو ہوا کا جھونکا بکھیر دیتا ہے —— چاروں طرف —— اپنی اس سوچ پر وہ کچھ حیرت زدہ سی ہوگئی۔ —— یہ کیا —— ؟ کیا میں بھی اس زرد گلاب کی مانند ہوں؟ اپنی سوچ کے پنجرے میں مقید —— اُداسی کا رنگ لئے —— تھکی تھکی خوشبو لئے۔ مگر فرق صرف اتنا ہے —— کہ اس کی سوچ کی خوشبو ہوا کے دوش پر سفر کر کے لوگوں تک نہیں پہنچ سکتی۔

وہ برآمدے میں وہیں ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اور مسکرا کر عشق پیچاں کی بیل کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو —— معاف کرنا میں تمہاری تنہائی میں مخل ہو رہی ہوں —— مگر بے فکر رہو، [illegible]
[illegible]

اور اس کی دُودھیا روشنی میں عشق پیچاں کی کلیاں سمٹی سمٹی اور شرمائی شرمائی سی نظر آنے لگیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کلی توڑی اور اپنی پیشانی پہ مارنے لگی۔ کلیوں کی چٹخ سنائی دینے لگی۔ اسے اپنی یہ بچکانہ حرکت اچھی لگی۔ اس طرح پٹاخے بجانے سے بچپن میں پیشانی پر گلابی سا نشان اُبھر آتا تھا۔ اور شاید آج بھی وہ وہی نشان دوبارہ اُبھارنا چاہتی تھی۔ وہ دیر تک یوں ہی کلیاں توڑتی رہی اور ان کے نشان پیشانی پر بناتی رہی ——

دُور کہیں سے ایک تیز چیخ فضا میں تیر گئی —— شاید دو بلیاں آپس میں لڑ رہی تھیں۔ اس کے خیالات کا دھارا ایک دم مڑ گیا۔ وہ آج اتنی بے چین کیوں تھی۔ مگر کوئی اس کا مددگار نہ تھا جو اس کی مدد کر سکتا۔ وہ ایک دائرے میں گھوم رہی تھی — سوچوں کے دائرے میں — جو کبھی سمٹ کر اس کے ذہن پر قابو پالیتا اور کبھی پھیل کر اس کے پورے وجود کا گھیراؤ کر لیتا۔ وہ چھٹکارا پانا چاہتی تھی اس دائرے سے —— مگر کیسے ؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ کاش اس کے پاس کوئی ایسا تیز دھار آلہ ہوتا، جس سے وہ اس دائرے کو درمیان میں سے کاٹ دیتی۔ اور یوں دائرے کے وجود کو ختم کر دیتی۔ مگر پھر اس نے سوچا اگر یہ اس کے بس میں ہوتا تو شاید تب بھی وہ ایسا نہ کر سکتی۔ سوچیں ہی تو اس کی ساتھی تھیں —— یہی اس کا رابطہ ماضی سے جوڑے ہوئے تھیں اور شاید یہی مستقبل کے تانے بانے بُننے میں اس کی مددگار تھیں۔

ہوا کے تیز جھونکے نے درختوں کے پتوں میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ عشق پیچاں کی بیل سے چند مرجھائے ہوئے پھول ٹوٹ کر اس پر آگرے — کچھ اس کے دامن میں —— اور کچھ اس کے بالوں میں اٹک گئے۔ اسی لمحے اس کی یادوں کے کچھ ستون بھی اپنی جگہ سے اکھڑ کر ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ سوچ کے پردے سے ٹکرائے۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں سے اس نے دیکھا۔ کچھ نقوش اُبھرے جو آہستہ آہستہ واضح ہونے لگے اور پھر ایک مجسم روپ دھار کر اُس کے سامنے آبیٹھے۔ دُھندلے دُھندلے نقوش اب واضح ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے چہرے کا رُخ موڑ لیا۔ شاید وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی —— مگر یہ کیا ؟ وہی شکل پھر اس کے سامنے تھی — اس کی آنکھوں میں حرکت ہوئی جیسے کہہ رہی ہوں، کیوں — مجھ سے یہ گریز کیسی ؟ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا لیا۔ آنکھیں کھولیں۔ چاند کی دودھیا روشنی میں اس نے دیکھا — وہ اس کے سامنے تھا، چاندنی میں نہایا ہوا۔ اس کے ہونٹوں میں ہلکا سا ارتعاش ہوا، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو —— نہیں، نہیں۔ تم کچھ مت کہو۔ میں تو ابھی تمہارے ایک سوالیہ جملے میں گرفتار ہوں۔ ابھی تو اس کا جواب مجھے نہیں مل رہا۔ تم کیا جانو تمہارے سوال نے مجھے کس طرح میری رُوح تک لرزا دیا تھا۔ کتنی دیر تک تو میں اپنے آپ کو سنبھالتی رہی۔ اور جب سنبھلی تو میں خود سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ یہ سوال تمہارے ذہن میں کیوں آیا! جانے کس خدشے نے تمہیں ایسا سوال کرنے پر مجبور کیا ؟ میرے دوست — ! سوچوں سے چھٹکارا پانا خاصا مشکل ہے — بے حد مشکل — یہ کیا ؟ تمہارے لبوں پر مسکراہٹ کی لکیر پھیل گئی —— میں سمجھ گئی۔ تم مجھے میری وہ بات یاد دلا رہے ہو کہ انسان کو ان باتوں کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہیئے جو کہ پوری ہی نہ ہو سکیں —— مگر، تم میری بات تو سنو۔ یہاں بیٹھ جاؤ، میرے قریب، میں تمہیں بتاتی ہوں —— سنو —۔

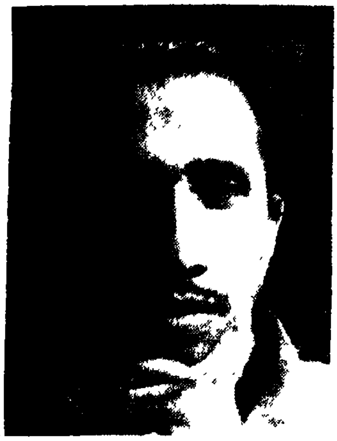
سوچیں تو انسان کی زندگی میں بہت گہرا اثر رکھتی ہیں۔ یہ ہمارے ذہن سے ہزار پا کی طرح چمٹی ہوئی ہیں۔ ان کی ہم ایک آدھ ٹانگ کاٹ بھی دیں تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ ہر کٹی ہوئی ٹانگ کی جگہ ایک نئی ٹانگ فوراً نکل آتی ہے۔ دیکھو تم ہنسو نہیں —— پہلے میری پوری بات تو سُن لو —— کیا کہا، میری نرالی منطق تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ؟ مگر تم غور سے سنو — میں تمہیں سمجھانے کی پوری پوری کوشش کروں گی —— یہ کہہ کر وہ کچھ آگے کی طرف جھک کر بیٹھ گئی۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے، ہتھیلیوں کے پیالے میں اپنا چہرہ لیے، وہ سامنے غور سے دیکھنے لگی جیسے اس کے چہرے پر غور سے یہ دیکھ رہی ہو کہ وہ اس کی باتوں سے کتنا متاثر ہو رہا ہے یا کتنی دلچسپی لے رہا ہے۔

جب کچھ اطمینان ہوا تو وہ بولی ـــــ

"آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں اپنے سوچوں کے جزیرے کی سیر کرادوں ـــ ہاں ہاں ـــ آؤ میرے ساتھ ـــ لاؤ میں تمہارا ہاتھ تھام لوں۔ دیکھو دبے قدموں چلنا ورنہ اس جزیرے کا طلسم ٹوٹ کر بکھر جائے گا ـــ اور ہاں، کوئی سوال بھی نہ کرنا کہ یہ سوچوں کا جزیرہ ہے ـــ ہر طرح کے سوال و جواب کی قید سے آزاد ـــ یہ ـــ یہ چشموں کی گنگناہٹ سنی تم نے ـــ پرندوں کی چہچہاہٹ بھی یقیناً تم سن رہے ہوگے ـــ اور یہ فرحت بخش ہوا کے جھونکے، ٹھنڈے ٹھنڈے کتنے سکون بخش ہیں ـــ اوں ہوں ـــ تم اپنی آنکھیں نہ موندو ـــ ورنہ نیند آجائے گی تمہیں ـــ اور میرا مقصد ادھورا رہ جائے گا۔ میں جانتی ہوں ـــ یہ مسحور کن خوشبو بہت سحر انگیز ہے ـــ مگر تم اپنے آپ کو اس سحر سے آزاد رکھو۔ لو یہاں بیٹھ جاؤ ـــ اور اب سامنے دیکھو ـــ تم اور میں ـــ اس جزیرے کے حکمراں ـــ خراماں خراماں پھولوں کی روش پر چہل قدمی کر رہے ہیں ـــ دنیا کے ہر غم ـــ ہر دکھ ـــ ہر فکر سے آزاد ـــ ہماری ہنسی اور ہمارے قہقہے ـــ فضاؤں میں جلترنگ بکھیرتے رہتے ہیں ـــ غور سے دیکھو ـــ یہ ـــ یہ تم اس ہلکی سی صدا پر چونک کیوں اٹھے؟ ـــ اوہ، اجنبی ہو نہ تم ـــ میں بتاتی ہوں ـــ یہ ایک ننھی سی کلی چٹک کر پھول بنی ہے ـــ یہ کسی خوشی سے چٹکنے کی آواز تھی ـــ ارے تم تو بالکل کھو گئے اس جزیرے میں ـــ آؤ واپس لوٹ چلیں ـــ اگر زیادہ دیر یہاں رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ تم حقیقی دنیا میں اسے تلاش کرتے پھرو گے ـــ اور جب اس جزیرے کا سراغ نہ ملے گا ـــ تو میرے دوست، تمہیں واسطہ پڑے گا اضطراب سے ـــ بے چینی سے ـــ اور ـــ بے سکونی سے ـــ میں نہیں چاہتی کہ خدانخواستہ تم ان حالات سے دوچار ہو ـــ ان کے لئے تو میں ہی کافی ہوں ـــ اب اٹھو نا ـــ بہت دیر ہو چکی ہے ـــ میں جانتی ہوں یہاں سے واپس جانے کو جی نہیں چاہتا ـــ مگر حقیقت سے انکار بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ آؤ ہم پھر اپنی حقیقی دنیا میں لوٹ چلیں۔"

اس کے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے ـــ جیسے وہ ایک طویل فاصلہ طے کر کے لوٹی ہو۔ چاند پھر اپنا سفر ختم کر کے دوبارہ اپنا بادبان لپیٹنے میں مصروف تھا ـــ اور وہ شبیہ اپنے چہرے پر استفہامیہ انداز لئے اس کے سامنے موجود تھی۔ چند گہری گہری سانسیں لینے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی ـــ "تم جاننا چاہتے ہو کہ میں جو سوچوں کی قائل نہیں ـــ میں جو یہ کہتی ہوں ـــ کہ ایسی سوچوں سے کیا حاصل جو انجام کو نہ پہنچ سکیں ـــ یہ سب کیا ہے۔ مگر میرے دوست، یہ بھی تو سوچو ـــ میں جو اس دنیا کے گورکھ دھندوں میں گرفتار ہوں، کیا مجھے سکون و آرام ـــ مسرت و خوشی ـــ کی ضرورت نہیں؟ اگر ہے تو یقین جانو ـــ یہ جزیرہ میں نے اسی لئے دریافت کیا ہے ـــ کیا کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو؟ تو ـــ تو میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی ـــ کاش ایسا ہو ـــ کاش یہ جزیرہ حقیقت کا رنگ لئے آجائے ـــ اور پھر تم اور میں ـــ میں اور تم ـــ اس کے باسی ہوں ـــ تم جا رہے ہو ـــ جاؤ ـــ مگر میرے اس جزیرے کی یادیں تمہیں ضرور اس کی تلاش پر مجبور کریں گی۔ یقین کرو، اس تلاش میں میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گی ـــ اور جب یہ تلاش مکمل ہو جائے گی ـــ تو ـــ تو ـــ اوں ہوں ـــ اب اتنا سوچنا بھی اچھا نہیں ـــ اچھا جاؤ خدا حافظ ـــ ہو سکے تو کل ضرور آنا ـــ"

اس نے دیکھا وہ مجسم روپ دھندلانے لگا۔ نقوش غیر واضح اور مبہم ہونے لگے، اور پھر ـــ وہ چونک اٹھی۔ ہوا میں خاصی خنکی آگئی تھی ـــ آسمان سے ستاروں کے بجرے اور چاند کی بادبانی کشتی اپنا سفر طے کر کے جا چکے تھے۔ گھاس پر شبنم کے قطرے تھے اور اس کی پلکوں پر ننھے ننھے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ اس نے انہیں چھوا نہیں البتہ عشق پیچاں کی بیل سے معذرت طلب کی اور اسے دکھ پہنچانے کی معافی بھی مانگی کیونکہ اس وقت اس کے قدموں میں عشق پیچاں کی بن کھلی کلیوں کا ڈھیر لگ چکا تھا اور پیشانی پر گلابی دھبا خاصا نمایاں تھا۔



علی تنہا

پکار

"یار میں نے ہل زمین میں دھنسا کر چھوڑ دیا۔ بیل ہٹر بٹر سامنے رکھیں میں تو ساری چوکڑی ہی بھول گیا۔ رُوح فنا ہو کے رہ گئی۔"

"کمال ہے۔ ٹلی راہ کاٹ سے ہوں تو دن کھوٹا ہو۔ لیکن یہ لومڑی کا ماجرا تو عجیب ہے۔"

"ہاں فقیر محمد، یہی تو ہے۔ میں نے چودہ برس، سالہا ہیں اُسے راہ کاٹتے، لومڑی کے پیچھے تکتے دیکھا ہے۔ کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ اب بیل رُکے ہیں تو میرے دل میں کھٹکا سا پیدا ہوئی۔ دل ہی دل میں بولوں، اے میاں عبدالرزاق یہ کیا الفڑا ہے میرے ساتھ۔ بیل تو رکتے نہیں بلاوجہ۔ پھر صبح کا تارا میرے ماتھے پہ چمک رہا ہو۔"

فقیر محمد نے حیران ہوتے ہوئے شیشم کے ٹھنٹھ پہ سونٹی مار کر پوچھا۔

"لومڑی چالاک بہت ہے میاں عبدالرزاق۔ جس سال باراتیوں کی بس الٹی ہے تھی پر ان کے کھڈ میں یاد آیا تمہیں؟"

"ہاں ہاں۔"

"تو جناب، میں نے لومڑی کو دیکھا تھا گھبرائی ہوئی یہاں تہاں پھرتی تھی۔"

"سچ کہتے ہو؟"

"ہاں بھئی، بالکل سچ لیکن ایک بات ہے۔ اگر لومڑی اپنے کوگم ہو جائے تو کیا شگون نکلتا ہے؟ پتہ ہے!۔۔۔ ہاں بھٹ سے نکل کر جانے کا مطلب ہے وہ جگہ ویران ہونی ہے۔"

"تو پھر سُن لو کہ میرے کیارے میں مدت سے دو بھٹ ہیں۔ لومڑی سال کے سال وہاں آتی ہے لیکن مجال ہے میرا ناخن برابر بھی نقصان ہوا ہو۔"

"نقصان اور لومڑی نہ کرے۔ میں کیسے مان لوں۔ مجھے تو شک ہے تم پر۔"

"نہیں یار۔ شک کی کیا بات ہے اس میں۔ پہلے اس دن کا ماجرا تو سُن لو پورا۔ میں نے جتے ہوئے بیل کھولے۔ دیکھا تو ایک بیل کی اگلی کھری سے خون جاری ہے۔ سر اٹھایا تو نتھنوں سے بھی نیلا خون بہا جاتا ہے۔ پریشان کہ اے خیر الرازقین اس کے سُموں سے تو میرا نان نفقہ بندھا ہے۔ اسے لہو کیسے لگ گیا۔ مشکل سے دس قدم چلا ہو گا کہ زمین پر دھڑام سے ڈھیر ہو گیا۔"

میں نے بجھے لہجے میں کہا۔ "یار جتنا برے کے مرنے سے نپٹ بیٹھ نہیں جاؤ۔ ہل کی ہتھی پکڑ لو۔" اب یوں لیسا لمبا لیٹ جانا تمہاری ہتک ہے

ایمان سے!

"میری ہتک؟ یعنی میری ہتک . . . . ؟"

"ہاں ہاں یار، تمہاری ہتک ہے۔ نری ہتک ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ ملا کے مخالف سمتوں میں چپ چاپ ٹہل گئے۔ اپنے جنون میں برسیم کے کھیت کی طرف سیدھا نکلتا گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ کنوئیں کی پرانی ڈھتی ہوئی منڈیر پر کتے لوٹ رہے تھے۔ میاں رسول جان کے زمانے میں بھاری کوہان والا اونٹ رہٹ کھینچتا تھا یہاں۔ اور سردیوں میں اُونی ٹوپی پہن کے رسول جان گادی پر بیٹھا ماہیا الاپتا۔ اس کے کانوں میں چاندی کے دو بڑے بکے ہمیشہ چکر ہی میں رہتے۔ جھریوں بھری پیشانی پر پسینہ کیوں چمکتا تھا نالہ میں پانی کی طرح؟ شاید اس کی کوئی وجہ بھی ہو۔ اس نے گردن موڑ کے ایک نظر ویران رہٹ کی طرف دیکھا اس طرح برابر دیکھے جانے سے یکایک برسیم کے عین درمیان میں سے سنبل کا درخت اٹھنا شروع ہوا۔ سرخا سرخ، پھولوں سے لدا ہوا۔ اس نے ہانپ کر آنکھیں ملیں پھر لولائی آواز میں کہنے لگا۔

"خدا کی پھٹکار تم پر۔ یہ تم ہو کرم داد۔ میں تو تمہاری سرخ جرسی اور اس پھندنے والی سرخ ٹوپی سے صاف دھوکا کھا گیا۔"

"کیوں، دھوکا کیوں کھا گئے؟"

"خیر رہنے دو اسے۔ مگر یہ تم برسیم میں چھپ کر کیا رہے تھے؟ کہیں نیت میں گڑ واہٹ تو نہیں آگئی تمہاری؟"

سرخ جرسی پہنے پھٹے حالوں میں اس کی قامت عجیب مسخرگی میں لپٹی تھی۔ گریبان میں اڑسی ورانتی نے پرانی جرسی کا حلیہ برباد کر رکھا تھا۔ اوپر سے ہاتھوں میں سن کی رسی سانپ کی طرح جھولتی رہی۔ کرم داد نے برسیم میں غوطہ کھا کر برآمد ہونے میں دیر نہ لگائی۔ وہ کرم داد کی ان الٹ پھیریوں سے واقف تھا۔ اس لئے اس سے منہ لگانے سے باز رہنے کو چل پڑا۔ مگر عبث اس نے میاں عبدالرزاق کو آواز دی۔

"سنو، دو اور لکے کبوتر میرے ہاتھ لگے ہیں۔"

میاں عبدالرزاق نے اسے اُکھنا دیا۔ "ہاں اب میری چھتری کی باری ہوگی۔ چلو میرا پنڈ ا چھٹ رہے گا کبوتروں سے . . ."

"نا، نا۔ یہ بات نہیں۔ میں یاروں کے گھر سیندھ لگاؤں تو حضرت غوث پاک میرے ہاتھوں میں کیڑے ڈال دے۔ سنو میں برسیم میں آپی بیٹھا تھوڑی گیا تھا، وہ تو پاؤں میرا رپٹ گیا تھا، لومڑی کم بخت کے بھٹ میں۔"

"لومڑی کے بھٹ میں؟" اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"ہاں یار۔ ایک تو سؤر بہت اجاڑتے ہیں فصل۔ اور اب یہ اور عذاب آن لگا ہے لومڑیوں کا۔" میاں عبدالرزاق نے اس لم ڈھینگ کرموں کو درانتی سے خلال کرتے روکا۔

"یار ایسا محسوس ہوتا ہے لومڑی اب کے بھی کھیتوں میں آگئی ہے۔ اس نے تو۔ میرا مطلب ہے، کوئی کھیت بخشا نہیں۔"

"مرن جوگی ہتھے بھی چڑھتی نہیں۔ خیر۔ میں تو کسی کے جھانسے میں آنے والا نہیں۔ مگر یہ لومڑی ہے نا، یہ بلم بازوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے سمجھے۔ میرے چاچا یہی بتاتے تھے کہ اس کی کینہ توزی سے پرکھ دکھائی چاہیئے۔ نہیں تو اس کے شر سے مٹی بھی کان چھولے۔"

کرم داد کی گھسی ہوئی چرخے کی سی آواز سے دھیان ہٹا کر اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔

"کبوتروں کی ٹکڑی ہے کیا؟"

"نہیں یار، کبوتر اس دوپہر میں کہاں؟ سرما کی دوپہر میں اُسے سفید موتیوں کی طرح نیلے آسمان کی چادر میں ٹکے ہوئے دو کبوتر بیچ بیچ نظر آگئے۔

"یار کرم داد، ادھر آنا۔ کبوتر تو مجھے دکھلائی پڑ ہی گئے۔ میں نے تو ۔ ۔ ۔" اس نے برہنہ چمکیلی دھوپ میں آنکھیں گاڑ دیں۔

"ادھر دیکھو شمال میں۔ دو کبوتر۔ نظر آئے نہیں؟"

وہ آسمان میں دیکھتے دیکھتے تھک گیا۔ "یار مجھے تو آسمان کی نیلاہٹ کے سوا کچھ نہیں دکھتا۔"

میاں عبدالرزاق نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"اب میری شہادت کی انگلی کے بالکل اوپر نظریں ٹکا کر دیکھنا۔"

کرموں نے میاں عبدالرزاق کے آسمان کی طرف اٹھے ہاتھ کی سیدھ میں کبوتر دیکھ کر تالی بجائی۔

"ہاں، اب کبوتر نظر آگیا۔ لیکن دو نہیں ہیں۔ صرف ایک ہے۔"

"چلو ایک ہی۔ نظر تو آگیا نا!"

"ہاں یار، بالکل آسمان سے ٹوکنا کے رہ گیا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو بتاؤں۔ یہ کبوتر باہر کا ہے۔ صبح کا اُڑا شام کو مشکل سے ہی چھتری پر آئے۔"

"ہاں یار، کبوتر جگرے والا ہے۔ مگر کرم داد، یہ تم مجھے گھرکیاں کیوں دے رہے ہو؟"

"میں گھرک رہا ہوں۔ کیا ہوا ہے تمہیں جی۔" دونوں نے حیرت کے عالم میں سر گھمائے۔ ان کے سوا کوئی ہوتا تو بولتا۔ دھوپ میں ناچتی ترمریاں تھیں اور پھیلے ہوئے شفاف نیلے آسمان میں ٹنگا ہوا کبوتر۔

"تو پھر یہ آواز کس کی تھی؟"

"آوازیں تو ایسی یہاں آتی رہتی ہیں۔ یہ کیوں! ہے نا میاں جی۔ گرمیوں میں تو یہاں کھڑے رونے کی آوازیں سن لیں۔ ابھی کوئی فریاد کر رہا ہے اور ابھی کسی نے دل دہلا دینے والے قہقہے برسانے شروع کئے۔ یہاں بڑا بھاری فساد رہتا ہے بھوتوں کا۔"

"ایک فساد بھوتوں کا ہے۔ ایک لومڑی کا۔ لیکن اب کون کس سے کہے لومڑی کیا ہے اور بھوت کون ہیں۔ جب چاہیں یہ کھیت اجاڑ لیں نہیں تو آوازیں دے دے کے ہی باؤلا کر چھوڑیں۔"

کرم داد نے ہاتھی دانت کی کنگھی نکال کے پٹوں میں اڑسالی۔ اس کے مضبوط جبڑوں میں انگوٹھا ہر وقت رہتا یا پانچ برس کے بچے کی لاپروائی میں ڈوبا ہوا۔ اس کے کپڑوں سے بارود کی بو آتی تھی۔ بدن کیا تھا اس کا، بارود کی بھری ہوئی کپی تھا۔

"تو یار یہ آواز دینے والا ہو کون؟"

اس نے دونوں ہاتھ سر پہ باندھ کر دیدے گھمائے۔

"کیا معلوم۔ اگر یہ بھوت نہیں تو بھوتنی کی آواز تو ہے ہی۔ بندہ بشر تو یہاں تیسرا ہے نہیں۔"

میاں عبدالرزاق نے ہاتھ کمر پہ دھر کے آسمان کی اُور سر اُٹھایا۔

"یار یہ کبوتر اور کتنی دیر رہے گا اوپر؟"

"میاں جی کبوتر کا کیا ٹھیک۔ دَم کی بات ہے ساری۔ مجھے اگر آپ قیاس کرنے دیں تو ممکن ہے میں ڈھنگ کی کوئی بات کہہ سکوں۔"

"شش شش کرم داد۔ سُن دوبارہ کوئی پکار رہا ہے مجھے۔"

کرم داد نے تیر کی طرح سیدھے میاں عبدالرزاق کو رونے اور ڈھینے کی حالت میں دیکھ کر تسلی دی۔

"دیکھو میاں جی۔ یہاں کے جن ہیں بہت چلتر باز۔ جب جی چاہے ان کا کچھ سے کچھ کر گزریں۔ لیکن مجھے کہنے دیں تو یہ ہیں بہت مزیدار

لوگ۔ اپنی سنتے ہیں، اپنی کہتے ہیں۔ کوئی ان کی سنی پر یقین کرے تو اور بات ہے۔ بہرحال ان کی پھبتیوں سے گھبرانا سخت نامردی ہے۔ مجھے تو ان کے کاموں پر رشک آتا ہے۔ جب جی چاہا آوازدے کے الٹی گنگا بہا دی۔ کرم داد نے دیکھا میاں اس کی باتوں سے بے نیاز کھیت کے دوسرے سرے پر پہنچ کے مڑ مڑ اسے دیکھ رہا ہے۔ "دیکھو میاں، تمہارے اندر اگر بھوت قید ہو گئے تو!" لیکن وہ اس کی چھپٹھائی چیخ سے پہلے ہی زمین میں ظاہر اکھڑا، اپنے آپ کو سنبھالنے میں مصروف تھا۔ کرم داد نے برسیم کی ساتھ والی کیاری سے مولی اکھاڑ کر اسے مرغی کی ٹانگ سمجھ کے چپڑ چپڑ کھانا شروع کیا۔ اور ملحدانہ خوش مزاجی کے ساتھ دنیا کی تمام سوکھی سڑی باتوں کو مولی کی طرح اپنے اندر اتار لیا۔ وہ اپنے مفلس اور قلاش بدن کو زمین پر نہایت سکون کے ساتھ چھوڑ سیٹی بجا بجا کر برسیم کاٹنے پر پل پڑا اور اس دو بدو لڑائی میں موت کی خاموشی اپنے اوپر طاری کر کے برسیم کی طرح اپنا آپ کاٹتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا گیا، بہادر جنگجو کی طرح اس نے ایک بار بھی مڑ کے نہیں دیکھا۔

"کیوں دیکھتا؟" میاں عبدالرزاق نے ہاتھ کے رعشے سے گھبرا کر سوال کیا۔

"ہاں وہ آدمی کی کھال میں پورے کا پورا جن تھا۔"

"کیا کہا؟ جن؟ تو گویا اس روز آوازدے کر کرموں حرام خور نے ہی مجھے جن کر چھوڑا تھا۔ میرے تو اندر باہر مدتوں سوکھا ہی رہا۔۔۔"

"ہاں۔ ان دنوں ایسا ہی لگتا تھا۔ جس کو دیکھو ایک اور دنیا کے دکھ میں دبلا ہو رہا ہے اور آپ یہ کس کا منہ دیکھ کے گھر سے نکلتے تھے اُن دنوں؟"

اس نے پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ شیر افضل کے ستھرے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے پھولے ہوئے سرخی مائل گندمی گال بارش میں نہائے ہوئے ہرے درخت کی طرح چمکیلے تھے۔ پہلے تو یہ آدمی خاصا نکھٹو تھا لیکن اب اس کی باتوں سے ذہانت کی بُو آ رہی تھی۔ کندھے سے لٹکے ہوئے تھیلے کو کندھا اُچکا کے اس نے اوپر کھینچا۔

"بات یہ ہے میاں عبدالرزاق۔ میں تو گھاس پر بیٹھا اطمینان سے کبوتر دیکھ رہا تھا۔ ایک تو آدمی اکیلا ہو اور ہر شے ٹک سک سے درست ملے تو میرے اندر ضرور اُسے خراب کرنے کی علت سر اٹھاتی ہے۔ ہاں، میں مزے سے کبوتر کی لوٹیں گن رہا تھا کہ لومڑی کی آہٹ پا کے میں چونک اٹھا۔ بدطینت کی بچی میری ہی طرف پُو قدمے آ رہی تھی۔"

"لومڑی تم نے کہیں میری چیلا تو نہیں بنا لی؟"

"لو اور سنو۔ بھائی قسم رسول پاکؐ کی۔ مجھے جھوٹ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے ہاتھ میں کُلہاڑی تھی۔ چاہا بھی اس کے سر پر دے ماروں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جست لگا کے ڈربے کے اوپر کھڑی مرغی پر جھپٹا مارا۔ اس کے بعد تو گھر کی ایک ایک مرغی اور بطّا بتر ہو گیا، لومڑی ہڑپ کرتی گئی۔"

"تمہاری ڈھوک میں تو دُم کٹا کتا بھی تھا۔ تھا نہیں؟ پھر!"

اس نے منحنی سی ناک پر سے مکھی اڑا کر جواب دیا۔

"تھا کیوں نہیں۔ اب بھی ہے۔ مگر اس کا صرف ایک کام ہے۔ دن رات سوتے رہنا۔ ہاں کہیں بلی کبوتروں کی چھتری کے پاس آئی ہے تو نہایت ناگواری سے انگڑائی لے کر دیدے گھماتا ہے۔ ایسے کتے کی دُم تو کیا، سر بھی کٹ جائے تو پروا نہیں۔"

میاں عبدالرزاق نے دیکھا وہ مستور مستور کے پینے والوں کی طرح بولتا ہی جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ سب لوگ لومڑی سے ڈرتے ہوں۔ یا اس کی ٹوہ لینے اتنی مدت سے لومڑی کا ذکر لئے بیٹھے ہیں۔ شیر افضل کی آنکھوں سے صاف دلی دھوپ سی سرما کی طرح تیکھی پھیلا رہی ہے۔ اس لئے اس نے بھویں سکیڑ کے پوچھا۔

"تو پھر وہ لومڑی گئی کہاں ؟"

"اس نے جانا کہاں ہے ۔" شیر افضل نے ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "لومڑی تو کہیں جائے، ہیر پھیر کے آ ہی جاتی ہے دوبارہ . . . ."

وہ میاں کو دیکھ کے چپ سادھ گیا۔ یا تو اس کے اندر پھپھوندی لگ رہی تھی یا اسے آسمان میں پھر سے کبوتر نظر آ گیا تھا۔ آسمان دونوں کے بے زمین کی طرح غیر یقینی اور چٹانوں میں سے ایک دم ظاہر ہوتے دیے بھیڑیے کی مثال تو تھا ہی مگر اب کبوتر کے ہونے سے آسمان احسان مندی سے کچھ دیر کے لئے مطلق مہربان لگنے لگا۔ لیکن یہ مہربان جب تمنا نی کرنے پڑتا ہے تو بے چاری زمین کا زلزلہ تو دس سالہ بچے کے دھکے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے ایسے مہربانوں سے ڈرنا چاہیئے۔ اتنے بڑے آسمان کو دیکھنا ہی کافی ہے۔ کیا معلوم کب اولے برسانا شروع کر دے۔

اس نے بات کاٹ کر شیر افضل کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس میں کیا ہے ؟"

"دوائیاں ہیں کیڑے مار اور پیارہ پرانے نعل ہیں۔ نعل تم جانو، جمع کرنا میرا مشغلہ ہے برسوں کا۔"

بھتا کے اس نے زمین پر پاؤں مارا۔ "مشغلہ کیا خوب کہا ہے۔ یہ تو دروازوں پر ٹھوکو گے۔ نہیں ہے کیا ؟ ہائیں۔ بولو اب زبان نہیں کھولتے ۔"

شیر افضل کی آنکھوں میں نمی آ گئی ۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں ان واہیات میں یقین نہیں رکھتا۔ ناحق تم بہتان نہیں باندھو۔ میرا ایک ایک پٹ دیکھ لو اندر باہر سے۔ میں تو آدمی جس ڈھب کا ہوں اس سے تم انجان نہیں ہو۔"

"ہاں انجان تو نہیں ہوں۔" اس نے استفہامیہ پوچھ سے شیر افضل کو چھوڑ کر اندھا دھند آسمان کی پہنائیوں میں کبوتر کھوجنا شروع کیا۔ مگر اس وقت بدلی کی نیم پاگل دھمی کبوتر کے سفید نقطے پر چھا گئی۔ یہاں سے وہاں تک۔ وہ پچھتاوے کی حالت میں، ویران سارے میں کھڑے کا کھڑا لومڑی کے بارے میں سوچا کیا۔ یہ لومڑی آخر اس کے پیچھے ہی کیوں پڑ گئی ہے۔ یہ ہے کیا شے۔ کوئی سمجھ کی بات کرنا چاہیئے۔ عقل تو میری الٹی ہے ہی۔ مگر یہ دھوپ بھی الٹی ہو کر کیوں ڈھلک رہی ہے۔ کہیں ٹکتی ہی نہیں۔ ماتھے پر سے پسینہ پونچھ کے ایک لمحے کو اس کے جی میں آئی اس لومڑی اور کبوتر کے جنجال سے جان منبق میں کیوں کرے۔ جائے اور سیدھا نیا بیل خرید لائے۔ دیر سویر ہل تو چلانا ہی ہے۔

"ہل کیوں چلایا جائے۔ اگر لومڑی نے پھر بھٹ بنا ڈالے تو ؟ یہ لومڑی پھر کہاں سے آن ٹپکی۔ خدایا میرے پاؤں تلے زمین باقی رہی ہے کیا۔ میں کہاں تک اس حالت میں رہوں۔" وہ چلا چلا کے شیر افضل سے کہنے لگا۔

"شیر افضل، اوئے شیر افضل۔ کرم داد کا پاؤں تو بھٹ میں آ گیا تھا۔ تمہیں یاد ہے کیا ؟ بڑا ہی دھنوان اور ہاتھ بھر کے کلیجے کا آدمی تھا۔ کہنے کو اس کو کبوتروں سے عشق تھا مگر لومڑی کا عذاب اسے کہاں کہاں لے گیا۔"

اس نے سر ہلا کے میاں کا کاندھا دبایا اور سوکھے بالن کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

"لو، لومڑی اب گھر تک آ گئی ہے۔ دیکھنا، دیکھنا اب۔"

لومڑی بالن کے ڈھیر پر سینہ پھیلائے لیٹی انہیں تاک رہی تھی۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں ساون کی تیز دھوپ سی تپش اور وحشت تھی۔ اُسے ایک دم حضرت پیر یاد آ گئے۔ کہتے تھے لومڑی جنگل کے سب عیب و ہنر جانتی ہے اور آدمی کو اس کے چہرے سے پہچان جاتی ہے۔ عذاب میں آئے

جھوٹے لوگوں کو تو اُن کے گھروں میں جا کے ۔ ۔ ۔ ۔"

"سوال یہ ہے" اس نے اپنے آپ سے پوچھنا چاہا مگر روہانسا ہو کر حضرت پیر کو یاد کرنے لگا کہ لومڑی اس کے گھر تک آگئی تھی۔ خدا معلوم لومڑی کو کس شیطان نے انگلی دکھائی کہ اب گھروں میں آنے لگی ہے۔ اس نے لومڑی اور کبوتر کے بارے میں سوچنا ترک دینے کو بہتیرا زور لگایا مگر اب تو لومڑی گھر تک آ ہی گئی ہے۔ اُسے آپ ہی آپ ہنسی آگئی۔ اس ہنسی میں عجیب آواز سنائی پڑی۔ اس کے اندر کبوتروں کی ٹکڑی کب جیسے اڑنے لگی ہو۔ یہ میرے اندر — خدایا ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا ۔ ۔ ۔ ۔

وہ خشمناک ہو کر شیر افضل پر چلّایا۔

"اوئے شیر افضل! اوئے ۔ ۔ ۔ ۔"

شیر افضل کے ہاں نہ کرنے سے پہلے ہی لومڑی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اسے مارو اب وقت ہے۔ مار دو اسے شاباش" لیکن مارنا تو درکنار، شیر افضل کے کان پر جُوں تک نہیں رینگی۔ سنّاٹے میں نرم دھوپ اور دوڑتی لومڑی کے سوا کچھ دکھلائی اُسے نہیں پڑا۔

"کہاں مر گئے ہو شیر افضل!" اس نے کندھا تھپتھپا کر شیر افضل کو خبردار کرنا چاہا۔

"کون میں؟ کہاں مر گیا ہوں؟"

"ہاں، ہاں تم۔ اور کون۔ لومڑی کو ایک ڈھیلا تک تم نے مارا ۔ ۔ ۔"

"میں کیوں مارتا، میاں عبدالرزاق؟ میرا ہاتھ کوئی ڈھیلا ہے اور میں ڈھیلا مارنے سے ڈرتا بہت ہوں۔"

"ڈھیلا مارنے سے ڈرتے ہو، مٹی کا ڈھیلا مارنے سے!"

"ہاں ہاں!"

"مٹی سے ڈرتے ہو مگر کیوں؟"

شیر افضل نے جواب دینے کے بجائے قدم اٹھایا۔ وہ بُت کی طرح مغرب میں جاتے شیر افضل کو دیکھتے دیکھتے زمین پر جُھک گیا۔ شاید مٹی ہی مٹی کو پکار رہے۔



خالد سہیل

ریت کے محل

اس کی عمر بمشکل پانچ سال تھی۔

وہ اپنے خاندان کے ساتھ بحرِ ہند کے ساحل پر سیر کرنے آیا تھا۔ تازہ ہوا، سورج کی روشنی اور پانی کی لہروں کے منظر نے اسے سحور کر دیا تھا۔ "ممی میں نہانا چاہتا ہوں۔" اس نے معصوم سی خواہش کا اظہار کیا۔ ممی نے اس کے کپڑے بدل کر اسے سوئمنگ سوٹ پہنا دیا۔ "شون بیٹا! دور نہیں جانا۔" شون خراماں خراماں پانی کی طرف بڑھنے لگا۔ پانی نے اس کے پاؤں چھوئے تو وہ خوشی سے اچھل پڑا "ممی پانی بہت ٹھنڈا ہے۔" وہ زور سے بولا۔ "دھیان سے۔" ممی نے پھر تلقین کی۔

شون کافی دیر تک پانی سے اٹھکھیلیاں کرتا رہا۔ کبھی وہ ساحل سے سیپیاں چنتا اور کبھی گیلی ریت پر اپنے نقشِ قدم دیکھ کر خوش ہوتا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں تھا۔ جب وہ چلتے چلتے تھک گیا تو ریت سے محل بنانے لگا۔

وہ گیلی ریت سے گولے بناتا۔ پھر دیواریں بناتا۔ پھر ان کی چھت بنانے کی کوشش کرتا۔ جب چھت گرنے لگتی تو خود ہی کھلکھلا کر ہنس دیتا۔ اتنے میں اسے دور ایک کالا بچہ کھڑا نظر آیا جو اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ شون نے بھی اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا وہ کالا بچہ آنکھوں میں خلوص پا کر آگے بڑھ آیا۔ دونوں تعارف کروائے بغیر اکٹھے کھیلنے لگے جیسے پرانے دوست ہوں۔ دونوں نے ریت کے محل بنانے شروع کئے۔ اب اگر چھت گرتی تو دونوں اکٹھے ہنس دیتے۔

اتنے میں ایک پولیس کا سپاہی ان کی طرف آیا اور کالے بچے کا بازو پکڑ کر لے جانے لگا۔

"اسے کیوں لے جا رہے ہو؟" شون نے پوچھا۔

"یہ کالا ہے۔ اسے یہاں کھیلنے کی اجازت نہیں۔ یہ BEACH صرف گوروں کے لئے ہے۔"

"لیکن یہ میرا دوست ہے۔" شون چیخا۔

پولیس آفیسر شون کی بات کو نظر انداز کر کے کالے بچے کو لے گیا۔ دونوں بچے سہم گئے۔ کالے بچے کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور شون کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

شون بھاگا بھاگا اپنے دادا کے پاس آیا۔

"گرینڈ پا! وہ میرے دوست کو لے گیا۔"

"کون بیٹا ؟"

"وہ گندا آدمی۔"

"کون سا ؟"

"پولیس آفیسر کہتا ہے میرا دوست کالا ہے۔"

"ہاں بیٹا ! شاہین کے بچے کووں کے ساتھ نہیں کھیلا کرتے۔"

شون کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنی ممی کے پاس چلا گیا اور آئس کریم کھانے لگا۔

کچھ عرصے کے بعد شون پھر اپنے خاندان کے ساتھ ساحل سمندر پر گیا۔ وہ نیکر پہن کر دھوپ میں اچھل کود رہا تھا اور بیسیوں مردوں، عورتوں کو دھوپ میں لیٹے دیکھ رہا تھا۔

"ممی یہ سب لوگ دھوپ میں کیوں لیٹے ہیں، کیا یہ بیمار ہیں ؟"

"نہیں بیٹا" ممی مسکرائی۔ "یہ سن بیدنگ کر رہے ہیں۔"

"وہ کیوں ؟" شون کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

"تاکہ ان کی جلد ٹین ہو جائے۔"

"تو کیا وہ کلرڈ یا انڈین بننا چاہتے ہیں ؟" شون نے معصوم سا سوال کیا۔

"نہیں بیٹا۔ وہ تفریح کر رہے ہیں۔" ممی بات ٹال گئی اور شون اکیلے میں کھیلنے لگا۔

اسے اس دفعہ بھی دوستوں کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کچھ اور گورے بچے آگئے۔ اور وہ سب کھیلنے لگے۔ شون نے ایک دفعہ پھر ریت کے محل بنانے شروع کئے وہ ریت سے محل بناتا لیکن جب وہ سمندر کی لہروں کے ساتھ بہہ جاتے تو ہنسنے لگتا۔

اسے ابھی محل بنانے میں مہارت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

اس کے قریب ہی چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں FRIZBY کھیل رہے تھے۔ شون نے کبھی یہ کھیل نہ کھیلا تھا۔ وہ انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک انڈین لڑکا ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوئمنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بھی FRIZBY کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ گورے لڑکے اور لڑکیوں کو اس کا کھڑا ہونا ناگوار گزرا اور وہ اس کا مذاق اڑانے لگے۔ شون کو سمجھ نہ آیا کہ وہ اس کا کیوں مذاق اڑا رہے ہیں۔

پھر وہ انڈین لڑکا پانی کی طرف بڑھنے لگا۔

"او انڈین !" ایک لڑکی چیخی۔

"تم اس میں نہیں نہا سکتے۔" دوسرا لڑکا بولا۔

"وہ کیوں ؟" اس لڑکے نے پوچھا۔

"تم انڈین ہو۔"

"اور یہ بھی تو انڈین اوشن ہے۔" وہ لڑکا چیخا۔

FRIZBY کھیل بند ہو گیا۔ سب لڑکے لڑکیاں احتجاج کرنے لگے۔ اور شون وہاں سراپا حیرت بنا دیکھتا رہا۔

اس نے پہلے کبھی لڑائی ہوتے نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے وہ گھبرا سا گیا۔ اور بھاگ کر ممی کی گود میں چھپ گیا۔
اتنے میں پولیس آفیسر آیا اور ریڈ انڈین کو لے گیا۔
شون ابھی بھی ممی کی گود میں دبکا بیٹھا تھا۔
ایک کالا لڑکا ممی کے لئے اورنج جوس لے کر آیا۔
"شون بیٹا، جوس پیو گے؟"
"ہاں ممی۔"
"ایک جوس اور لے کر آؤ۔" ممی نے کالے لڑکے کو آرڈر دیا۔
"ممی، یہ کالا لڑکا یہاں کیا کرتا ہے؟"
"نوکری کرتا ہے۔"
"اسے پولیس آفیسر پکڑ کر نہیں لے جاتا؟"
"نہیں بیٹا اسے کھیلنے اور تیرنے کی اجازت نہیں۔"
شون کو یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔
شون نے اورنج جوس کا صرف ایک ہی گھونٹ پیا۔ اس سے باقی جوس نہ پیا گیا۔ نہ جانے کیوں۔
شون کے والدین کی، جن کی رہائش BEACH سے چند میل دور ڈربن میں تھی، جوہنسبرگ تبدیلی ہو گئی، پھر کیپ ٹاؤن۔
شون کو ڈربن اور ساحل سمندر یاد آتا لیکن وہ اور بھی بہت سی یادوں کی طرح اسے ذہن کے کسی طاقچے پر رکھ کر بھول جاتا۔
کئی سالوں کے بعد شون کا ڈربن آنا ہوا۔ اب وہ جوان ہو چکا تھا۔ زندگی بہت سے رنگ بدل چکی تھی۔ شون سیر کرتے ہوئے پھر اسی BEACH پر آ گیا جہاں وہ بچپن میں آیا کرتا تھا۔
اُسے بہت سی خوشگوار تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ وہاں نہ تو پولیس آفیسر تھے اور نہ ہی وہ بورڈ جن پر لکھا تھا کہ وہ BEACH صرف گوروں کے لئے ہے۔ ساحل پر ہر رنگ اور نسل کے مرد، عورتیں اور بچے سیر کر رہے تھے اور نہا رہے تھے۔
شون دل ہی دل میں مسکرا دیا۔
اُس نے اپنی کار پارک کی اور سوئمنگ سوٹ پہن کر ساحل کی طرف چل دیا۔
وہی دھوپ، وہی تازہ ہوا اور وہی پانی کی لہریں تھیں لیکن ان میں زیادہ سرور تھا۔
بہت سی بھولی ہوئی یادیں اس کا خیر مقدم کرنے آ گئیں۔ وہ کافی دیر تک چہل قدمی کرتا رہا اور پھر نہانے لگا۔ نہانے کے بعد وہ دھوپ سینکنے ریت پر لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ غیر شعوری طور پر ریت سے کھیلنے لگے۔ وہ ریت کے محل بنانے لگا لیکن وہ گر گر جاتے۔
اتنے میں اس کے قریب ایک انڈین بچہ آ گیا۔ وہ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا دیا۔
"کیا حال ہے؟" شون نے پوچھا۔
"ٹھیک ہوں۔ آپ کیا بنا رہے ہیں؟" بچے نے معصومیت سے پوچھا۔
"ریت کے محل۔"
"آئیں، میرے ساتھ چلیں۔"

"کہاں؟" شون نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا

"ساحل سے ذرا دور۔"

"وہاں کیا ہے؟" شون اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"کچھ مٹی ہے۔"

"اس سے کیا کریں گے؟"

"ہم دونوں مل کر مٹی کے مکان بنائیں گے۔"

"مٹی سے کیوں؟" شون حیرت سے پوچھنے لگا۔

وہ انڈین بچہ رُک گیا۔ شون کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھے مٹی زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

اور شون پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔



سہیل احمد

ناصر کاظمی کی یاد میں

پھر ساون رُت کی پون چلی تم یاد آئے۔ اس بار ساون تو خشک رہا لیکن ناصر کاظمی کی یادوں کی پھوار مسلسل برس رہی ہے۔ یادوں کا کوئی موسم نہیں ہوتا تو پھر کیوں نہ اس پھوار میں تھوڑی دیر کے لئے بھیگ جائیں۔ باہر کے حبس کا زور تو آنے والی بارشوں ہی سے ٹوٹے گا لیکن اپنے اندر کے حبس سے بچنے کے لئے ناصر کاظمی کی یادیں شاید کچھ دیر کے لئے ٹھنڈک کا احساس جگا دیں۔ ناصر کاظمی پر تنقیدی مضمون لکھنے کے لئے تو میں ہر وقت تیار ہوں لیکن ناصر کی مضطرب اور متجسس شخصیت پر کچھ لکھنا خواہش کے باوجود میرے لئے کٹھن ہے۔ کیا میں اس کی بے چین روح کے درد کو جاننے کا دعویٰ کر سکتا ہوں؟ وہ نفیس شخصیت جو گھاس کی سرسراہٹوں، درختوں کی تالیوں اور رتوں کے نوحوں سے لے کر آسمان کے بدلتے رنگوں اور چاند تک سے گہرا رشتہ محسوس کرتی تھی کیا اس کی مختلف سطحوں کو سمجھنا آسان ہے؟ ناصر کاظمی کن رفتگاں کا سراغ لینے نکلا تھا، وہ کون لوگ تھے جن کے اوجھل ہونے سے زندگی کے معانی بدل گئے۔ وہ نیندیں جو جل گئیں کن خوابوں سے معمور تھیں، وہ کیا صحبتیں تھیں جن کے لئے ناصر سبز دنوں اور سبز راتوں کے لفظ استعمال کرتا تھا؟ یہ سوال میرا راستہ روکتے ہیں اور میں ٹھٹھک جاتا ہوں۔

ناصر سے میری باضابطہ شناسائی چند برسوں کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ میرے ہم عمر ساتھی جنہوں نے مجھے اس کے ساتھ کہیں بیٹھے ہوئے یا چلتے پھرتے دیکھا ہے، مجھے اس کے دوستوں میں شمار کر لیتے ہیں۔ یہ میرے لئے اعزاز ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ میں ناصر کی شناسائی کی پھوار میں ضرور بھیگا ہوا ہوں، اس کی دوستی کی برکھا کا موسم مجھے نصیب نہیں ہوا۔ دوست کا لفظ تو میں انتظار حسین کے بارے میں استعمال کرتے ہوئے جھجک جاتا ہوں جس سے شناسائی کو اب بیس برس ہونے کو آئے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں انتظار حسین کی شناسائی اور دوستی کے درمیان کسی سرحد پہ کھڑا ہوں۔ اس تمام صورت حال کے باوجود میں ناصر کاظمی کے بارے میں چند بکھری بکھری یادوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ممکن ہے یہ باتیں ناصر کے دوستوں کے ساتھ مل کر کچھ معنویت اختیار کر لیں۔

میں نے ۱۹۶۶ء میں اورینٹل کالج میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور ساتھ ہی لاہور کے ادبی حلقوں اور پاک ٹی ہاؤس کی محفلوں میں رسائی ہوئی۔ ناصر اس وقت بھی میرے پسندیدہ شعراء میں شامل تھا۔ اپنے عہد کے پیشتر ہوئے اُسلوب سے ہٹ کر اس کی غزل کا لوریاں دیتا ہوا دھیما انداز، شفاف چاندنی بکھرتا ہوا اسلوب اور فطرت سے اس کی گہری شیفتگی اس وقت بھی مسحور کرتی تھی۔ میں نے بعض کالجوں کے ایسے انعامی مشاعروں میں شرکت کی تھی جن میں ناصر بھی منصفین میں شامل تھا۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے بعض مشاعروں اور کچھ محفلوں میں اسے شعر پڑھتے بھی سنا تھا۔ ایک روز جناب سجاد باقر رضوی اور میں اورینٹل کالج سے نکل کر انارکلی کی طرف آ رہے تھے کہ موڑ پر ناصر سے سامنا ہوا۔ علیک سلیک

کے بعد باقر صاحب نے پوچھا "کہاں جا رہے ہیں؟" ناصر نے جواب دیا "جوتا خریدنے کا ارادہ ہے۔ آپ بھی چلئے۔" باقر صاحب نے مجھ سے کہا "چلو، اس تاریخی لمحے میں شریک ہو جائیں۔" ناصر ہمیں ساتھ لئے انارکلی کے آخر میں جوتوں کی دکان "کرنال شاپ" پہنچا۔ دکاندار اس کا شناسا تھا۔ ناصر نے زرد رنگ کی ایک گرگابی پسند کی مگر پہن کر کہنے لگا "پوری طرح فٹ نہیں۔" دکاندار نے برجستہ کہا "میاں نمبر تو آپ ہی کا ہے۔ اس عرصے میں پاؤں بھاری ہو گیا ہوگا۔" ناصر نے اس فقرے کا خوب لطف لیا اور پھر کہنے لگا "جوتے تو اور جگہوں سے بھی مل جائیں گے۔ یہاں تو ہم یہی کچھ سننے کے لئے آتے ہیں۔" بس وہ دن تھا جب ناصر سے شناسائی کا رشتہ استوار ہوا۔ اب ریڈیو اسٹیشن ہو یا ٹی ہاؤس ناصر ملتا تو اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک ہوتی۔ کچھ عرصے بعد پروفیسر کرار حسین کرشن نگر میں کچھ مجلسیں پڑھنے کے لئے لاہور آئے۔ باقر صاحب اپنے استاد کی خوب تعریفیں کیا کرتے تھے اور میرے دل میں ان سے ملنے کی خواہش تھی۔ باقر صاحب نے کہا "میرے ساتھ چلو ناصر کے ہاں، کرار صاحب کی دعوت ہے۔ اس کے بعد ہم لوگ ان کی مجلس سننے جائیں گے، تم بھی شریک ہو جانا۔" چنانچہ ہم ناصر کے گھر پہنچے۔ میں بن بلایا مہمان تھا لیکن ناصر نے بڑے تپاک اور محبت سے استقبال کیا۔ کرار صاحب سے بھی تعارف ہوا اور ان کی مہذب گفتگو اور وضع قطع نے فوراً مسحور کر لیا۔ کرار صاحب نے پوچھا "آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟" میں نے جواب دیا کہ ارسطو کا تصورِ المیہ۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کرار صاحب، ناصر کاظمی، انتظار حسین، باقر صاحب اور میں اس گھر پہنچے جہاں مجلس ہونے والی تھی۔ منبر پر بیٹھ کر کرار صاحب اور بھی بجے اور ان کے خطاب کا مخصوص انداز اور بھی چمکا۔ انہوں نے یہ کمال بھی کیا کہ ارسطو کا نام لئے بغیر ارسطو کا تصورِ المیہ بھی اپنے خطاب کے اندر سمجھا دیا۔ یوں میرے لئے اس خطاب کی ایک اور معنویت پیدا ہو گئی۔ مجلس کے بعد احاطے میں بیٹھ کر چائے پی رہے تھے کہ ایک شخص ذوالجناح کو اندر لایا۔ سفید رنگ کا خوب صحت مند گھوڑا تھا۔ کسی نے تعریف کی تو کرار صاحب نے بانیٔ مجلس کا نام لے کر کہا "جی ہاں ان کے گھر کا ہی سب سے صحت مند فرد ہے۔"

خیر، اب ناصر سے شناسائی کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا۔ پھر پاک ٹی ہاؤس کی محفلوں میں اس کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملنے لگا۔ احمد مشتاق نے جو کسی کو کم ہی پاس پھٹکنے دیتا تھا، میری ایک نظم سن کر مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا "پروانہ" دے دیا۔ اور اس نظم کی نقل ناصر کو بھی دکھا دی۔ اب ناصر سے ملاقات ہوتی تو وہ شعر و ادب کی باتیں کھل کر کرتا۔ ان دنوں ٹی ہاؤس میں ناصر کا آنا کم ہو چلا تھا۔ بس کسی وقت اچانک ناصر آ جاتا اور پوری محفل میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ ناصر ہمیشہ ٹی ہاؤس کے سامنے والے درخت کے پیچھے سے یوں نمودار ہوتا جیسے درخت کے اندر سے برآمد ہوا ہے۔ درخت کے پاس میونسپلٹی کا ایک نل ہوا کرتا تھا۔ ساتھ ہی ایک پنواڑی بیٹھتا تھا۔ ناصر نل کھول کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارتا، پنواڑی سے پان بنواتا، سگریٹ لیتا اور پھر ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا۔ اس عرصے میں احباب اس کی یہ تمام مخصوص ادائیں دیکھ کر فقرے بازی کرتے رہتے۔ یہی وہ نل ہے جس کا منیر احمد شیخ نے ناصر پر لکھتے ہوئے ذکر کیا ہے اور یہ واقعہ لکھا ہے کہ ناصر ایک زمانے میں ایک تھیلا ساتھ رکھتا تھا اور احباب کو علم نہ تھا کہ اس کے اندر آخر ہے کیا؟ ایک روز وہ نل سے پانی لے کر چھینٹے منہ پر مار رہا تھا کہ احمد مشتاق نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھ کر شور مچا دیا "وہ دیکھو، وہ دیکھو ناصر کاظمی تھیلے میں پانی بھر رہا ہے۔" منیر احمد شیخ کا کہنا ہے کہ اس دن کے بعد پھر ناصر کو اس تھیلے کے بغیر ہی دیکھا گیا۔ ناصر کی گفتگو کی شہرت تو اس وقت بھی تھی۔ رلکے کے بارے میں پال والیری نے کہا ہے کہ وہ ہاتھ دھوتا تھا تو اس وقت بھی شاعر ہی محسوس ہوتا تھا۔ ناصر کی پوری شخصیت شاعری کی ساحرانہ کیفیات میں ڈوبی ہوتی تھی۔ ایک ایسے شہر میں جو تیزی سے بدل رہا تھا لوگ فطرت کے جادو سے منکر ہو رہے تھے۔ ناصر کی گفتگو سے یہ احساس ہوتا تھا جیسے فطرت ہمارے دلوں پر دستک دے رہی ہے۔ جنگل، درخت، جھرنے، کونجیں، چڑیاں اور پھول ان سے ملاقات کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ شخص تو اپنے اندر یہ جنگل اور یہ جھرنے سمیٹے بیٹھا ہے۔ اس کی لفظیات جدا تھی۔ کسی علمی اصطلاح کو استعمال کئے بغیر، کسی فلسفے کسی کتاب کا حوالہ دیئے بغیر وہ زندگی کی خوشبوؤں سے جھولی بھر دیتا تھا۔ کبھی کبھی علمی گفتگو کا بھی اسے شوق ہوتا لیکن زیادہ تر وہ زندگی کے براہِ راست تجربے کو بیان کرتا۔ مگر کمال اس کا یہ تھا کہ دوسرے لوگ اس تجربے کو بیان

کرتے تو وہ واقعہ لگتا، ناصر سناتا تو واقعہ کہانی بن جاتا اور اس میں کئی اسرار پیدا ہو جاتے۔ عام معاملات کو بھی ناصر شاعرانہ بنا دیتا تھا۔ مثلاً کسی نے کہا ناصر صاحب انتظار حسین سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ ناصر نے کہا بھئی انتظار ہفت روزہ نظام کا مدیر تھا۔ عسکری صاحب مجھے اس سے ملانے کے لئے لے گئے۔ عسکری صاحب تو چلے گئے۔ میں آج تک وہیں بیٹھا ہوں۔ فطرت سے اس قربت کے ساتھ اس کی دوسری قربت اُردو کی کلاسیکی اور جدید شاعری سے تھی۔ کلام میر تو خیر اس کا اوڑھنا بچھونا ہی تھا لیکن باقی شعراء کے کلام کا بھی اس نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اچانک کسی شاعر کا کوئی ایسا شعر پڑھ دیتا جس کی معنویتیں اور زبان کی ادائیں بے حد بلیغ ہوتیں لیکن کسی نے وہ شعر پہلے نہ سنا ہوتا۔ جب احباب داد دیتے تو ناصر کے چہرے پر انوکھی سی چمک آجاتی۔ مختلف شاعروں کی بات ہوتی تو ناصر کبھی سنجیدہ انداز میں اور کبھی مذاق کے انداز میں کوئی ایسا جملہ کہتا کہ اس شاعر کے کلام کی کئی سطحیں روشنی میں آجاتیں۔ کئی لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کے تاثراتی بیانات وقتی رو میں وارد ہوتے ہیں جب کہ دراصل ان کے پیچھے گہرے مطالعے کی گونج سنائی دیتی۔ ناصر کی شعر شناسی بلا کی تھی اور بعض اوقات شعر پڑھنے میں وہ کسی لفظ پر اس طرح زور دیتا کہ مفہوم کی نئی سطح سامنے آجاتی اور کبھی شعر کی کسی ایسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا جس کی طرف اوروں کا دھیان نہ گیا ہو۔ وہ کہتا تھا کہ اچھے شعر میں ایک اَن دیکھی سمت ہوتی ہے اور قاری کا کام اس اَن دیکھی سمت کو تلاش کرنا ہے۔ بعض اوقات ناصر کے جملے بہت پرلطف ہوتے۔ ایسے جملے احباب نے اس کے شخصی خاکوں میں درج کئے ہیں۔ مثلاً جوش صاحب کی شاعری کے بارے میں اس کا جملہ بہت چلا تھا کہ وہ ہاتھی پہ بیٹھ کر شکار کھیلنے کے لئے نکلتے ہیں مگر چڑیا مار کر لاتے ہیں۔ اس طرح کے جملوں کی بنیاد کسی تحقیر پر نہ ہوتی تھی۔ یہ گفتگو میں مزا پیدا کرنے کا وسیلہ بھی تھا اور کسی خاص رُخ سے کسی شاعر کے کلام کو دیکھنے کا طریقہ بھی تھا۔ ایک بار فانی کے بارے میں بڑا پرلطف جملہ ہوا۔ کوئی صاحب فانی کے احساسِ الم کا ذکر کر رہے تھے۔ ناصر نے کہا ' یار عورتوں میں ایک رسم ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو گھر کی عورت کسی آنے والی عورت کے گلے مل کر روتی ہے اور دونوں اس وقت تک روتی رہتی ہیں جب تک کوئی تیسری عورت انہیں اٹھ کر چھڑا نہ دے۔ ایسے لگتا ہے کہ فانی کو کسی نے چھڑایا نہیں۔

اسی زمانے میں میاں سہیل افتخار مرحوم نے ایک اشاعتی ادارہ "نگارشات" قائم کیا تھا جس کے منصوبوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بعض اردو شعراء کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے۔ ناصر سے داغ کے کلام کے انتخاب کے لئے کہا گیا۔ ناصر کا طریقہ تھا کہ جب وہ کوئی مضمون لکھنے والا ہوتا تو پھر مختلف لوگوں کے سامنے اپنے خیالات دہراتا۔ شاید یہ دیکھنا مقصود ہوتا کہ ان باتوں کا مطلوبہ اثر ہوتا ہے کہ نہیں۔ ناصر کے اکثر مجوزہ مضامین تو اسی طرح زبانی سُنا سُنا کر ہی تحلیل ہو جاتے اور انہیں لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ مگر جب کوئی مضمون لکھا جاتا تو اس کا اسلوب بالکل الگ ہوتا۔ میرا جی پر اس کا مضمون اس کی تنقیدی صلاحیتوں کی اچھی مثال ہے۔ داغ پر اس کا مجوزہ مضمون بھی اسی طرح گفتگو کی حد تک رہا لیکن اس زمانے میں داغ کی شاعری پر اس کے بعض جملے آج بھی حافظے میں چمک رہے ہیں۔ ایسے لگتا تھا کہ ناصر کا مسئلہ یہ ہے کہ داغ پر فراق کا بے پناہ مضمون موجود ہے اور ناصر جو باتیں کہنا چاہتا ہے ان میں سے بہت سی فراق پہلے ہی سے کہہ چکے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون ناصر کے لئے ایک مہم کی طرح سے تھا کہ کوئی نئی بات نکالی جائے یا ایسے طریقے سے کہی جائے کہ بالکل نئی معلوم ہو۔ چونکہ داغ پر ناصر کے اس مجوزہ مضمون کا تذکرہ اب تک ناصر کے کسی دوست نے نہیں کیا، اس لئے جو باتیں ناصر نے میرے سامنے کہی تھیں ان کو مختصراً درج کرتا ہوں۔

ناصر نے کہا ہمارے محلے میں ایک میر صاحب رہتے تھے۔ محلے کے لڑکے بالے ان کے ہاں جمع ہوتے۔ شطرنج کی بازی جمتی۔ خوش گپیاں ہوتیں۔ میر صاحب کی بیٹھک بڑی سجی ہوئی تھی۔ سفید چاندنیوں کا فرش، اگالدان، پیچوان، پان کی تھالیاں۔ بے حد ستھرائی کا احساس ہوتا۔ ایک دن جو میں ان کے ہاں پہنچا تو دیکھا بیٹھک بند ہے۔ دروازے پہ کھڑے ہو کر آواز دی تو ان کی بیوی نے نام پوچھا اور پھر اندر میر صاحب کو

بتایا۔ میر صاحب نے کہا انہیں اندر بلالو۔ میں اندر گیا تو عجب عالم تھا۔ گرد آلود فرش، ٹوٹے برتن، ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں، صفائی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تو میاں، داغ کی شاعری اس زمانے کے مسلمانوں کی بیٹھک تھی، پیچھے تہذیب کا زوال اور آشوب لیکن اوپر سے سجاوٹ ہی سجاوٹ۔ پھر اسی بات کو ایک اور انداز سے ناصر نے یوں کہا، "دراصل بات یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان میں تلوار اور گھوڑے کر آئے تھے۔ داغ تک پہنچتے پہنچتے تلوار نیام میں چلی گئی تھی اور گھوڑا بگھی میں جُت گیا تھا۔ اسی طرح ایک روز ناصر نے کہا، تمہیں بڑے شعر یاد ہیں، بتاؤ یہ کس کا شعر ہے،

تم کو پردۂ شب تو بصر کو پردۂ چشم
کئی لباس ترے نور کو سیاہ ملے

میں نے چکرا کر دو تین شاعروں کے نام لئے تو ناصر شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا یہ تو داغ کا شعر ہے اور پھر اس شعر پر رواں ہو گیا لباس، پردۂ نور، اور سیاہ کی معنویت پر غور کرو۔ یہ اسی داغ کا شعر ہے جسے صرف عیاشی کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ واقعی شعر کمال کا تھا اور ہماری شاعری کی مابعد الطبیعاتی روایت کی پوری گونج اس کے اندر موجود تھی۔ بعد میں، میں نے داغ کی یہ غزل تلاش کی تو خاصی طویل غزل نکلی مگر اس انداز کا شعر یہی تھا۔ باقی اشعار میں داغ کا مخصوص چلبلا پن تھا۔ ایک شعر سُن لیجئے۔

سب اہلِ حشر جب اپنے کئے کو پائیں گے
بڑا مزا ہو جو مجھ کو مرا گناہ ملے

ناصر کی مضمون نگاری کا ایک اور رنگ بھی میں نے دیکھا۔ حلقۂ اربابِ ذوق میں ایک سال منیر نیازی سیکریٹری ہوئے اور میں جوائنٹ سیکریٹری۔ طے پایا کہ سالانہ اجلاس کی صدارت ناصر کاظمی سے کرائی جائے۔ یہ منیر نیازی کی شاعری میں جلال کا زمانہ تھا اور اس کی شخصیت میں بھی برہمی کا عنصر نمایاں تھا بلکہ ایک دو بار اس "عقاب" کو کسی "نحیف شکار" پر جھپٹتے بھی دیکھا گیا۔ بعض لوگ منیر سے خائف رہتے تھے۔ ایک بار منیر نے ناصر سے بھی کہا "ناصر! تمہارا اور میرا مقابلہ رستم اور سہراب کا مقابلہ ہے۔" دونوں ایک دوسرے سے دوستی کا رشتہ بھی محسوس کرتے تھے۔ ناصر منیر کے بارے میں کہتا تھا میں نے اسے خوشبوؤں میں بسا ہوا دیکھا ہے۔ اور اس کی شاعری کے بارے میں کہتا تھا کہ یہ شخص تو خالی گھروں اور گونگے دروازوں کی زبان بھی سمجھ لیتا ہے۔ ناصر نے صدارت کے لئے ہامی بھر لی مگر مسئلہ یہ تھا کہ حلقے کے سالانہ اجلاس کا خطبۂ صدارت چھپوا کر حاضرین میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ انتظار حسین نے مجھے وارننگ دے دی تھی کہ ناصر کے ساتھ لگے رہو اور مضمون مکمل کراؤ ورنہ اتنا وقت نہیں ہو گا کہ یہ شائع ہو سکے اور اگر ایسا نہ ہوا تو حلقے کی رسم ٹوٹ جائے گی اور اراکین تمہیں گھیریں گے۔ میں نے اس بات کو گرہ میں باندھا مگر حسب معمول بات آگے بڑھتی نظر نہ آئی۔ ناصر نے ٹی ہاؤس میں ایک کاپی کے صفحات اور ایک قلم مجھے دکھایا اور کہا یہ اسی مضمون کے لئے ساتھ لئے پھر رہا ہوں۔ اس زمانے میں، میں ٹمپل روڈ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک رات گیارہ بجے کے بعد ناصر وہاں پہنچا اور زبانی تقریباً پورا مضمون مجھے سنا دیا اور کہا یہ باتیں ذہن میں ہیں، بس لکھنا باقی ہے۔ مجھے احمد مشتاق کا شعر یاد تھا۔

جی بھر آیا کاغذِ خالی کی صورت دیکھ کر
جن کو لکھنا تھا وہ سب باتیں زبانی ہو گئیں

میں مطمئن کیسے ہوتا جب کہ میں دیکھ رہا تھا کہ کاپی کا ابھی ایک صفحہ بھی لکھا نہیں گیا۔ دوسری رات کا وعدہ ہوا۔ میں ناصر کو تلاش کرتے ہوئے رات گئے اس کے گھر پہنچا تو بھابی نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ ان کے کمرے کی بتی بجھ گئی ہے، سو گئے ہیں۔ اگر کہو تو اٹھا دوں۔ میں نے کہا رہنے دیجئے لیکن صبح انہیں میرے آنے کا بتا دیجئے گا۔ میں لوٹ رہا تھا کہ ناصر سامنے بازار سے پان کھاتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ میں نے حیرانی سے کہا آپ تو اس وقت

گھر میں سو رہے ہیں۔ ناصر کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ پھر اس نے کہا بس مضمون تقریباً تیار ہے۔ کل بہرصورت پہنچ جائے گا۔ دوسری رات ناصر مضمون لے آیا۔ مکمل ہو چکا تھا مگر اب یہ دقت تھی کہ اس کی اشاعت کیسے ہو۔ دوسری شام سالانہ اجلاس تھا۔ خیر دوسری صبح ناصر، سلیم شاہد اور میں مکتبۂ جدید پریس پہنچے۔ ناصر نے رشید احمد چودھری صاحب کو خصوصی ہدایات دیں۔ سلیم شاہد کے ذمّے یہ کام لگایا گیا کہ وہ اجلاس سے پہلے یہ کاپیاں وصول کرے۔ عین اس وقت جب حلقے کا اجلاس شروع ہونے والا تھا سلیم شاہد ایک تانگے پر خطبۂ صدارت کی کاپیاں لئے پہنچا۔ اور معاملہ رفع دفع ہوا۔ اجلاس بہت کامیاب ہوا۔ اور شام کوٹی ہاؤس کے باہر جشن بپا ہوا۔ منیر نیازی بہت خوش تھا اور ناصر کی تعریفیں کر رہا تھا اور ناصر، منیر کے ساتھ خلوص کا اظہار کر رہا تھا۔ سجاد باقر رضوی، سلیم شاہد، جاوید شاہین، غالباً زاہد ڈار، انتظار اور کئی دوسرے احباب بھی جمع تھے۔ کچھ لوگ تو تھوڑی دیر بعد رخصت ہوئے مگر باقی احباب ناصر کی تجویز پر پرانی انارکلی کے نکڑ پر چانپیں اور گردے کھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر ناصر نے آگے بڑھ کر دکاندار کو کچھ ہدایات دیں جن کے نتائج کا اس وقت اندازہ نہ ہوا لیکن جب کھانا آیا تو مرچیں اتنی تیز تھیں کہ ہم سب لوگ ہار مان گئے۔ پورے جسم میں ایک تیز آگ دوڑ رہی تھی لیکن ناصر پورے اطمینان سے کھانے میں مصروف تھا۔ دوسرے دن ٹی ہاؤس میں آنے والے ایک صحافی دوست مسعود اللہ خاں نے مجھے پوچھا۔ "رات کیا قصہ ہوا؟" میں نے کہا: "کیا مطلب؟" اس نے کہا: "رات مجھے عجائب گھر سے آگے توپ کے پاس جاوید شاہین سکوٹر پر آتا ہوا ملا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سکوٹر روکا لیکن اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا، کہاں سے آ رہے ہو؟ تو اس نے بس اتنا کہا، ناصر کاظمی . . . سی سی . . . مرچیں اور سکوٹر سٹارٹ کر کے رخصت ہو گیا۔ اب بتاؤ ان اشاروں کے پیچھے قصّہ کیا ہے۔ جاوید شاہین ہی کے ذکر پر یاد آیا کہ شاہین کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "زخم مسلسل کی ہری شاخ" شائع ہوا تو ناصر سخت بیمار ہو چکا تھا اور ہسپتال میں داخل تھا۔ احباب نے ٹی ہاؤس کی گیلری میں جاوید شاہین کے مجموعے کی تقریب رونمائی کا انعقاد کیا۔ احمد مشتاق نے کہا چلو ناصر سے بھی کچھ لکھوا لاتے ہیں۔ ہم دونوں ہسپتال پہنچے اور ناصر سے تاثرات مانگے تو اس نے فوراً ایک صفحہ لکھوا دیا جو اس جملے سے شروع ہوتا تھا "جب میں پہلے پہل جاوید شاہین سے ملا تھا تو وہ ہرا بھرا لڑکا تھا اب زخم مسلسل کی ہری شاخ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

کبھی کبھار جب ناصر سے تنہائی میں ملاقات ہوتی تو فراق کے اشعار کا تبادلہ ہوتا۔ مجھے اس وقت فراق کے بہت سے اشعار یاد تھے اور ناصر تو فراق کی شاعری کا بہت شیدائی تھا۔ فراق کی غزل کا اس نے انتخاب بھی کیا۔ ناصر سلطان کاظمی نے بتایا کہ میر کا انتخاب بھی مکمل موجود ہے اور وہ اس کی اشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح ناصر نے بعض تراجم بھی کئے، رسالوں کی ادارت کی، حلقے کے لئے انتخاب بھی مرتب کئے حالانکہ ہمارا خیال تھا کہ ناصر صرف اس انتخاب کی باتیں ہی کرتا ہے۔ اس طرح جس بکھراؤ کی طرف اس مضمون میں بھی اشارہ ہوا وہ اس کی شخصیت کا ایک رُخ تھا۔ دراصل پتہ نہیں چلتا تھا کہ ناصر کے ہاں افسانے کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ناصر اپنی شطرنج میں مہارت کے بھی قصّے سناتا تھا اور اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ یہ بھی افسانہ ہی ہے۔ ناصر کے انتقال کے کئی برس بعد غلام عباس صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا۔ انٹرویو کرنے والے نے اُن کے شطرنج کے شغف کا پوچھا اور کہا کچھ اور ادیبوں کے ساتھ بھی آپ کھیلتے رہے ہیں تو غلام عباس نے ناصر کا نام بھی لیا اور کہا اُسے بعض اوقات بڑے غضب کی چال سوجھتی تھی۔ یہ انٹرویو پڑھ کر میں نے انتظار حسین سے کہا کہ ممکن ہے ناصر نے ہرن اور شیر کا شکار بھی واقعی کر رکھا ہو۔ انتظار اپنے مخصوص انداز میں ہنس پڑا۔ اسی طرح حلقے میں ایک بار ناصر نے کہا کہ ٹماٹروں کے بھی جذبات ہوتے ہیں۔ انتظار اتنا محظوظ ہوا کہ کالم لکھ دیا۔ پھر "سکریٹ لائف آف دی پلانٹس" جیسی کتابیں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ناصر کی بات کا کچھ علمی پس منظر بھی تھا۔

سنہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں بہت سے ادیب اور شاعر ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن پر موجود رہتے تھے۔ میں بھی وقت گزارنے کے لئے وہیں ہوتا تھا۔ اور اکثر امانت علی خاں مرحوم کے ساتھ بیٹھا نغموں اور ترانوں کی دھنیں سنتا رہتا۔ ایک روز ناصر کاظمی ہسپتال سے اٹھ کر آیا اور

امانت علی خاں سے کہا میں نے بھی ایک ترانہ لکھا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اسے گاؤ۔ دھن تیار ہوئی اور ترانہ ٹیلی وژن پر ریکارڈ ہونے لگا امانت علی خاں اور فتح علی خاں ترانہ گانے والے تھے اور پیچھے آواز لگانے کے لئے انہوں نے کچھ اور لوگ بھی رکھے ہوئے تھے۔ پروڈیوسر نے اعتراض کیا کہ یہ ترانہ صرف امانت علی خاں، فتح علی خاں گائیں گے۔ کورس نہیں ہوگا۔ امانت اڑ گیا اور سخت جھنجھلاہٹ میں بولا" انصاف کرو، اس میں مصرع ہے ــ "بڑھنا ہے تم کو نوح کے سیلاب کی طرح"، اب میں اکیلا نوح کا سیلاب کیسے لا سکتا ہوں۔ ہم سب محظوظ ہوئے اور پھر ترانہ اسی طرح ریکارڈ ہوا جیسے امانت چاہتا تھا۔

اپنی آخری علالت کے دوران میں ناصر نے احمد مشتاق کو بلوایا۔ مشتاق مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ ناصر کاظمی نے دو تین جیبی ڈائریاں نکال کر دیں اور کہا کہ پی پی ایل والے میرا مجموعہ شائع کر رہے ہیں۔ ان تمام چیزوں کی خوشخط نقل فراہم کرو۔ احمد مشتاق نے کہا یہ ڈائریاں میں رکھوں گا ناصر نے کہا پھر میرے پاس کیا رہ جائے گا، خیر تم ہی رکھ لینا۔ مشتاق نے، میں نے اور شبیر شاہد نے یہ چیزیں نقل کیں جو بعد میں "دیوان" اور "پہلی بارش" کے نام سے شائع ہوئیں۔ یہ کام اصل میں تو مشتاق ہی کے سپرد تھا مگر ہمیں بھی اس میں ہاتھ بٹانے کا اعزاز مل گیا۔ "دیوان" تو جلد ہی شائع ہو گیا مگر "پہلی بارش" کی اشاعت میں کچھ دیر ہوئی۔ میں نے ان میں سے کچھ غزلیں اور ناصر کا حلقۂ ارباب ذوق کا خطبۂ صدارت ایک مختصر سے نوٹ کے ساتھ اورینٹل کالج کے رسالے "لفظ" میں شائع کر دیا۔ چنانچہ "پہلی بارش" کی اشاعت سے پہلے ان پر اسی حوالے سے گفتگو ہوئی۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ ناصر کی شخصیت کو ایک مضمون میں سمیٹ لینا میرے بس کی بات نہیں۔ ٹمپل روڈ کے فلیٹ کی کچھ اور نشستیں، ٹی ہاؤس کی کچھ اور محفلیں اور کچھ رتجگے اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر ناصر کی یادوں کی پھوار تو اب موسلا دھار بارش میں تبدیل ہوئی جاتی ہے اور میں ناصر کے لفظوں میں یہ سوچ رہا ہوں ؎

یہ خواب سبز ہے یا رُت وہی پلٹ آئی
چھتوں پہ گھاس، ہواؤں میں نمی پلٹ آئی

(حلقۂ ارباب ذوق، لاہور کے خصوصی اجلاس بیادِ ناصر کے لئے ایک تحریر)

غزلیں

احمد ہمدانی

شکایت نہ لب پہ گلا ہے یہاں!
بھلا اپنا دل کب دکھا ہے یہاں!

نظر دُور تک کوئی آتا نہیں
مگر دُور کی اِک صدا ہے یہاں!

ہیں سائے بہت کوئی چہرہ نہیں
یہ کیسی بھیانک فضا ہے یہاں!

بُھلایا ہے دل نے بھی دُکھنا بہت
یہ بے رحم کیسی ہوا ہے یہاں!

تھیں پیڑوں پہ کیا کیا بہاریں کبھی
ہر اِک پیڑ اب رو رہا ہے یہاں!

ہے ہر سو اُداسی کا اِک کھیت سا
یہ ہر خوشہ کیا تک رہا ہے یہاں!

بگولوں میں لپٹی ہوئی آگ سی
دھواں سا یہ کیا اُٹھ رہا ہے یہاں!

عجب بستیاں ہیں عجب لوگ ہیں
جہاں دیکھو صحرا بسا ہے یہاں

کیوں خلاصہ اُس کو چاہت کا سمجھ بیٹھے تھے ہم
وہ تو بس اِک اجنبی تھا۔ کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ریگِ صحرا کی اُداسی کے سوا کچھ بھی نہ تھا
یُوں جہانِ زیست کو کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اِک نظر ڈالی کسی نے، دل میں دھومیں مچ گئیں
کیا زمانہ تھا جسے اپنا سمجھ بیٹھے تھے ہم

ایک مُدّت سے کہیں پایا نہ کچھ اُس کا سراغ
غم کی وہ لذّت جسے سچّا سمجھ بیٹھے تھے ہم

جانے کب سے اُڑ رہا ہے اِک بگولا دشت میں
سادگی دیکھو اسے ہونا سمجھ بیٹھے تھے ہم

وہ جو سچ ہے، اُس سے بھی کرتی رہی سرگوشیاں
بس یہی دُنیا جسے دھوکا سمجھ بیٹھے تھے ہم

احمد ہمدانی

• گرد کی چادر تنی ہے دیکھئے
زندگی کیا ہو گئی ہے دیکھئے

• قید میں ہے آگہی انسان کی
کیا گھٹن اور بے بسی ہے دیکھئے

• رات کچھ روشن بھی ہے پر ہول بھی
سوگ میں کیوں چاندنی ہے دیکھئے

• جانکنی کے لگ رہے ہیں ڈھیر اب
پیاس کی کھیتی اُگی ہے دیکھئے

• ان سے مل کر بڑھ گئے کچھ اور دُکھ
دُکھ کی یہ صورت نئی ہے دیکھئے

• ہم ہوئے ہونے کے ہاتھوں بے اماں
یہ سزا کیسی ملی ہے دیکھئے

• وہ کہاں آئیں گے اب سوچیے
رات بھی آخر ہوئی ہے دیکھئے

آرزو کا یہ تماشا کیا ہے
میلا میلا یہ اُجالا کیا ہے

کیسے کجلا گئے چہرے۔ لوگو
دُھند کا شہر میں ڈیرا کیا ہے

دشتِ تنہائی میں سایہ نہ صدا
دیر سے پھر کوئی تکتا کیا ہے

یہ خیال ایسے تھے سوچا نہ کبھی
رنج کا ہم سے تقاضا کیا ہے

اجنبی اپنی نظر میں ٹھیرے
ہم نے سوچا تھا کہ لمحہ کیا ہے

ہر طرف پیڑوں تلے دھوپ مگر
چلتے رہنے کا یہ سودا کیا ہے

احمد ہمدانی

ہر طرف یہ دھواں سا کیسا ہے
زخم اِک بے نشاں سا کیسا ہے

ہم سا اِک شخص ایک مُدّت سے
بے اماں بے زباں سا کیسا ہے

یہ بگولے سے اُڑ رہے ہیں کیوں
وحشتوں کا سماں سا کیسا ہے

رات دن روشنی کی بارش میں
خوف اک مہرباں سا کیسا ہے

شہر کیوں بن گئے ہیں ویرانے
گرد کا سائبان سا کیسا ہے

راحتوں کا لباس پہنے ہوئے
دل میں رنجِ زیاں سا کیسا ہے

دُکھ ہوں اپنے نہ جیسے سُکھ اپنے
بے سبب یہ گماں سا کیسا ہے

مجھے پا کر تجھے پانے کی ہم کو حسرتیں کیا ہیں
چمک میں چاند تاروں کی یہ آخر وحشتیں کیا ہیں

بگولے سے یہ صحنِ گلستاں میں اُڑ رہے ہیں کیوں
اُداسی اوڑھے بیٹھی ہیں جو ہم میں راحتیں کیا ہیں

خوشی کے لمحے ہم کو اُن سے کتنا دُور رکھتے ہیں
دلوں کو جو ملا دیں رنج کی وہ ساعتیں کیا ہیں

بس اِک تپتے ہوئے صحرا میں کچھ سوکھے سے پیڑ آخر
ہماری نفرتیں کیا ہیں ہماری چاہتیں کیا ہیں

یہ دُکھ سُکھ تو تماشے ہیں، تماشے ہوتے رہتے ہیں
تماشوں سے الگ، سچ مچ ہماری آفتیں کیا ہیں

ضیا تاروں کی بھی ہے اور چراغوں کی بھی ہے لیکن
جو گھر میں ناچتی ہیں ہر طرف وہ دہشتیں کیا ہیں

احمد ہمدانی

بحال ہو کے بھی اب جی نڈھال کیسا ہے
فضا پہ چھایا ہوا یہ ملال کیسا ہے

تمام عمر سے یہ اپنا حال کیسا ہے
حیات [illegible] ہے یہ دل میں سوال کیسا ہے

یہ نور نور فسانہ یہ زخم زخم سماں
یہ درد درد فریب [illegible] پائمال کیسا ہے

کہاں سے بس گئے آکر بگولے اب دل میں
یہ وحشتوں کا نہ جانے کمال کیسا ہے

ہمارے چاروں طرف آہ و زاریاں لیکن
نظر نہ آئے کوئی یہ کمال کیسا ہے

تھا نفرتوں سے بھی آزردہ وہ کبھی دیکھو
محبتوں سے کوئی اب نڈھال کیسا ہے

شکایتیں کبھی جس کی نہ ختم ہوتی تھیں
اب اس کو دیکھ لو۔ وہ بے خیال کیسا ہے

وہ جس کے لطف پہ ہوتا ہے قتل کا دھوکا
وہ میرا یار میرا خوش جمال کیسا ہے

بسا ہے آنکھوں میں صحرا، یہ حال تو دیکھو
ہمیں نہ دیکھو، جنوں کا کمال تو دیکھو

ہوائیں پیڑوں سے کیا کہہ رہی ہیں، یہ تو سُنو
ہر ایک شاخ پہ گرد ملال تو دیکھو

یہ زرد ریت، اکیلے درخت، جلتی دھوپ
لبوں پہ ان کے ہیں کیا کیا سوال تو دیکھو

ہر ایک سمت مگر چیختے ہیں سناٹے
خموش لمحوں کا تم یہ کمال تو دیکھو

ترقیوں کے سبھی رنگ خوب ہیں لیکن
دکھوں کے پھیلے ہوئے تم یہ جال تو دیکھو

یہ بیٹھے بیٹھے ہمیں ہو گیا ہے کیا آخر
نہ پوچھو بات، ہمارا یہ حال تو دیکھو

احمد ہمدانی

تجھے پاکر میں خود میں آؤں کیسے
جو لَے مجھ میں ہے اس کو گاؤں کیسے

جو رفتہ رفتہ مجھ میں سے ہے کھویا
میں اُس کھوئے ہوئے کو پاؤں کیسے

ندی کا جتنا پانی بہہ چکا ہے
اُسے چاہوں تو واپس لاؤں کیسے

دکھوں کی چادریں ہیں سب پُرانی
نئی اب چادریں سلواؤں کیسے

سبب افسردگی کا ہوں تو لیکن
تری محفل سے اُٹھ کر جاؤں کیسے

ہوا ہے مہرباں کوئی مگر اب
تجھے بھی، عمرِ رفتہ لاؤں کیسے

گمان اپنا ہوں یا میں خیال اپنا ہوں
خلاصہ یہ کہ میں خود ہی کمال اپنا ہوں

تری جفائیں بھی کچھ راستے میں آئیں مگر
یہ واقعہ ہے کہ میں پائمال اپنا ہوں

نہیں رسائی کسی تک مری تو کیا غم ہے
میں خود ہی اپنی مسرت، ملال اپنا ہوں

نظر نظر رہی دُوری، قدم قدم قربت
میں زخم زخم سہی، اندمال اپنا ہوں

فنا کے دشت میں رقصاں بھی کب سے ہوں، لوگو
مگر میں نغمہ کوئی لازوال اپنا ہوں

میں اپنا ایک قصیدہ بھی اور نوحہ بھی
مٹا کے خود کو، میں کیفِ ملال اپنا ہوں

محسن احسان

نہ کسی یار سے ناراض نہ اغیار سے ہم
پھر بھی ہیں شہر میں بے یار و مددگار سے ہم

ہو کوئی دستِ غنی، رہتے ہیں کشکول بدست
اتنے مانوس ہوئے درہم و دینار سے ہم

نہ لبِ بام ستارہ نہ سرِ خاک چراغ
کتنے شرمندہ ہیں گھر کے در و دیوار سے ہم

نہ ہمیں قتل کا اندیشہ، نہ لٹ جانے کا خوف
لاتعلق ہیں بہت قافلہ سالار سے ہم

دل میں تو ہیں تمنا کے تھے سو زخم، مگر
مطمئن ہو گئے اِک حرفِ لبِ یار سے ہم

ہم نے پائی ہے عجب طرفہ طبیعت محسن
بارہا الجھے ہیں خود اپنے طرفدار سے ہم

ہیں برگِ زرد سے خالی بدن درختوں کے
ہوا نے چھین لیے پیرہن درختوں کے

بہار ہی نے خزاں کو سپردِ خاک کیا
بہار ہی نے اتارے کفن درختوں کے

ہوائیں پوچھتی پھرتی ہیں سبز پتوں سے
کہاں چلے گئے ہیں ہم سخن درختوں کے

یہ کیسی بادِ مراد آئی ہے کہ اب کے برس
لہولہان ہوئے ہیں بدن درختوں کے

مری نہ بن سکی محسن جواب تنہا گلی
یہاں حسیں ہیں بہت پیرہن درختوں کے

ـپ کراچی

ـن احسان

ں بھی نام نہ تھا لب پہ تیرے نام کے بعد
غ آئینہ روشن ہوا نہ شام کے بعد

ں کے سفر میں تھکن نہیں ہوتی
ا کہ بیٹھ گئے صرف چند گام کے بعد

ں اڑان کی مفقود ہو گئی دل سے
نوازیٔ صیاد و صید و دام کے بعد

عِ انجمنِ شوق جل سکا نہ کبھی
ے قیام سے پہلے ترے قیام کے بعد

تمام پرندوں کی مجلس آرائی
ش ہو گئے دیوار و بام، شام کے بعد

ت ورق ورق پہ تھا پڑھ لیا محسن
نزیر ہے ہر حرف ناتمام کے بعد

سمجھ رہا ہے مجھے وہ بھی خود پسندوں میں
کہ میرا نام ہے جس کے نیاز مندوں میں

یہ یورشِ غمِ حالات و یہ دل سادہ
گھری ہوئی ہے دلہن بے شمار رندوں میں

خدا پرست ہے کوئی تو خود پرست کوئی
خدا شناس نہیں اک خدا کے بندوں میں

کبھی نہ مجھ سے مری داستانِ غم پوچھے
کوئی تو ایسا بھی ہو میرے دردمندوں میں

تمام عمر جو پستی سے ہم کنار رہے
خدا کی شان وہ شامل ہیں سربلندوں میں

گلہ نہ کر کبھی محسن سے کم نمائی کا
وہ قید خود ہے گرفتار گھر کے دھندوں میں

محسن احسان

آنکھیں بھی عذاب دے رہی ہیں
خوابوں کا حساب دے رہی ہیں

شہتیرِ مکاں چیخ رہا ہے
دیواریں جواب دے رہی ہیں

دریا پہ برس کے چار بوندیں
تاوانِ حباب دے رہی ہیں

پت جھڑ کو گلاب رُت کی کلیاں
کھلنے کا ثواب دے رہی ہیں

محسن کو فریبِ خود نمائی
امواجِ سراب دے رہی ہیں

فولاد میں ڈھل رہی ہے دُنیا
ملبوس بدل رہی ہے دُنیا
شعلوں کی زباں میں بولتی ہے
بارود اُگل رہی ہے دُنیا
افلاس کی دُھوپ سے نکل کر
سرمائے میں جل رہی ہے دُنیا
اِک سُود و زیاں کی کشمکش ہے
ہر لحظہ بدل رہی ہے دُنیا
کانٹوں کا سجا کے تاج سر پہ
غنچوں کو مسل رہی ہے دُنیا
راتوں کو اُجالنے کی خاطر
خورشید نگل رہی ہے دُنیا
یا خواب بکھر گئے ہیں اس کے
یا نیند میں چل رہی ہے دُنیا
بارش کی دُعائیں مانگتی ہے
کس دُھوپ میں جل رہی ہے دُنیا
محسن یہ تضادِ ارتقا ہے
اِک پاؤں پہ چل رہی ہے دُنیا

محسن احسان

ہر چہرہ ہے اک کتاب پڑھ لے
دکھ دل میں ہیں بے حساب پڑھ لے

تحریر نہ کر حدیثِ تعبیر
ریزہ ریزہ ہیں جو خواب پڑھ لے

کچھ گنبدِ درد کی صدا سُن
کچھ شہر کا پیچ و تاب پڑھ لے

تو اپنی کتابِ زندگی کا
بھولا ہوا کوئی باب پڑھ لے

اے محوِ نوشتِ لوحِ تقدیر
ہستی بھی ہے اک عذاب پڑھ لے

کب خیمۂ ابر بچ سکا ہے
آفاق کا باب باب پڑھ لے

یوں غور سے چھت نہ دیکھ محسن
اچھی سی کوئی کتاب پڑھ لے

کچھ کم ہوا اضطراب مجھ میں
کھلنے لگا اک گلاب مجھ میں
ناکام رہا جو زندگی بھر
وہ شخص ہے کامیاب مجھ میں
بدلے گی نہ کائنات میری
آئے گا نہ انقلاب مجھ میں
تہذیب جنوں سے بجھ گیا ہے
روشن تھا جو آفتاب مجھ میں
دریا کی طرح اچھل رہا ہے
پھیلا ہوا اک سراب مجھ میں
آنکھیں ہوئیں نیند سے گریزاں
یہ کون ہے محوِ خواب مجھ میں
جل تھل سا لگا ہے میرے اندر
برسا ہے کوئی سحاب مجھ میں
ہر لحظہ جو روح نوچتا ہے
ایسا بھی ہے اک عقاب مجھ میں
چہرے کی لکیریں کہہ رہی ہیں
باقی نہیں آب و تاب مجھ میں
کچھ خوبیاں مجھ میں ہوں گی محسن
پر عیب ہیں بے حساب مجھ میں

سیپ ٹری

شبنم رومانی

آدھا جیون بیتا آہیں بھرنے میں
آدھی عُمر توازن قائم کرنے میں

دنیا تو پتھر ہے، پتھر کیا جانے
کتنے آنسو چیخ رہے ہیں جھرنے میں

اِک طوفان اور ایک جزیرہ حائل ہے
ڈوبنے اور سمندر پار اُترنے میں

آئینہ بیچارہ خود ہے زنگ آلود
بُجھ جائے گا چہرے روشن کرنے میں

اک پُل جوڑ رہا ہے دو دُنیاؤں کو
اِک پَل حائل ہے جینے اور مرنے میں

مرنے والا دیکھ رہا تھا سب ناٹک
سب مصروف تھے اپنی جیبیں بھرنے میں

ڈھلتا سُورج آنکھ کا ریزہ ہو جاتا ہے
جھوٹے خوابوں کا آمیزہ ہو جاتا ہے

پہلے شیشہ ٹوٹ کے خنجر بَن جاتا تھا
لیکن اَب تو ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے

اپنے فقروں سے ہشیار، کہ فقرہ اکثر
دشمن کے ہاتھوں کا نیزہ ہو جاتا ہے

حسن کی سنگت، پھُول کی رنگت مَس ہو کر
شبنم کا آنسو آویزہ ہو جاتا ہے

سیب کراچی

شبنم رومانی

شب چراغ کر مجھ کو اے خدا اندھیرے میں
سانپ بن کے ڈستا ہے راستا اندھیرے میں

آئینہ اُجالا ہے، ذات کا حوالہ ہے!
پھر بھی کس نے دیکھا ہے آئینہ اندھیرے میں؟

لیکن اب بھی روشن ہیں خواب میری آنکھوں کے
چاند تو کہیں جا کر سو گیا اندھیرے میں

جب بھی بند کیں آنکھیں کھُل گئیں مری آنکھیں
روشنی سے گزرا ہوں بارہا اندھیرے میں

آدمی کی قسمت بھی، آگہی کی قسمت بھی
ابتدا اندھیرے سے، انتہا اندھیرے میں

اپنے علم پر شبنم ناز کیا کرے کوئی
اِک قدم اُجالے میں، دُوسرا اندھیرے میں

ہر آن ایک نیا امتحان سر پر ہے
زمین پاؤں تلے، آسمان سر پر ہے

دُہائی دیتی ہیں کیسی ہری بھری فصلیں
کسی غنیم کی صورت لگان سر پر ہے

میں خاندان کے سر پر ہوں بادلوں کی مثال
سو بجلیوں کی طرح خاندان سر پر ہے

جلا کے خاک ہی کر دے یہ چیختا سورج
مگر دُعاؤں کا اِک سائبان سر پر ہے

اک اور وصلِ سخن اور اک وصالِ نگاہ
مفارقت کی گھڑی میری جان سر پر ہے

شبنم رومانی

چاند نکلا جب اُفق پر تری انگڑائی کا
وہی لمحہ تھا مری تیری شناسائی کا

ہم تری راہ میں خونِ رگِ جاں سے اکثر
سُرخ قالین بچھاتے ہیں پذیرائی کا

یہ پرندوں کا بچھڑنا یہ بچھڑ کر ملنا
درس ہے بچھڑے ہوؤں کیلئے یکجائی کا

کچھ دکھائی نہیں دیتا ہمیں اب اپنے سوا
اے خدا! دُور کر آشوب یہ بینائی کا

ناز اُٹھاتا ہے طبیبوں کے جو ہر روز نئے
اُسی بیمار میں جوہر ہے مسیحائی کا

ہیں سُبک رو تو غلط ہم کو نہ سمجھے کوئی
یہ تو اِظہار ہے دریاؤں کی گہرائی کا

منزلیں غیر شناسی کی ہوئیں طے شبنم
مرحلہ اب ہے خود اپنے سے شناسائی کا

آخرِ شب جو بہم صبح کے اسباب ہوئے
حملہ آور مری آنکھوں پہ مرے خواب ہوئے

تشنگی بھی تو ہے اِک سیلِ بلا کی صورت
بستیاں غرق ہوئیں، خشک جو تالاب ہوئے

اب نہ آئیں گے کبھی قحطِ وفا کی زد میں
وہ علاقے مرے اشکوں سے جو سیراب ہوئے

خواب دیکھے تھے بہت، جنّتِ گم گشتہ کے خواب
تجھ کو دیکھا تو مجسّم مرے سب خواب ہوئے

داغِ رُسوائی نہیں، تمغۂ اعزاز ہے یہ،
تری نسبت کی قسم ہم بھی خوش القاب ہوئے

میں نے اِک روز نظر بھر کے تجھے دیکھا تھا
پھر تو اس نشے کے عادی مرے اعصاب ہوئے

یاد آیا ہے بہت شاہ جہاں پور ہمیں
بعد مُدّت کے جو ہم واردِ پنجاب ہوئے

شبنم رومانی

سبز شجر سے توڑ کے رشتہ اب پچھتاتے ہیں
پتے پاؤں کے نیچے آ کر شور مچاتے ہیں

جتنے رستے ہیں انجانے دیس کو جاتے ہیں
جانے والو! پیچھے پیچھے ہم بھی آتے ہیں

کچھ میرے تیرے دُکھ ہیں، کچھ دُکھ ہیں موسم کے
اولے پتھر برسا کر آنسو بن جاتے ہیں!

اپنی اپنی مجبوری ہے، جو جس کا ہو جائے
سچ پوچھو تو جھوٹے سارے رشتے ناتے ہیں

لاکھ جتن پر بھی نہیں ہوتے سُونے گھر آباد
بسنے والے چُپکے سے دل میں بس جاتے ہیں

ہم نے کھنگالے سات سمندر، چھانے سات افلاک
پھر بھی ایک جزیرے کے قیدی کہلاتے ہیں

یہ دو چار گھڑی کا ملنا یار! غنیمت ہے
تم بھی حال سناؤ، ہم بھی شعر سناتے ہیں

خوابوں کے یہ جگنو مری آنکھوں میں نظر بند
دیکھو مرے آنسو مری آنکھوں میں نظر بند

چہرے کا وہ اِک پھول ہے اب تک تر و تازہ
اب تک ہے وہ خوشبو مری آنکھوں میں نظر بند

دیکھا تو یہ دیکھا کہ فلک ہے نہ زمیں ہے
پہلے تھا یہ پہلو مری آنکھوں میں نظر بند

کیا کیا نہ ترے حسن کی بندش ہے نظر پر
رہتا ہے مگر تُو مری آنکھوں میں نظر بند

میب کراچی

شبنم رومانی

خواب اپنی تعبیر سے ڈر گئے آنکھوں میں
سب موسم چُپ چاپ گزر گئے آنکھوں میں

پیاس نے ریگستان بچھائے چہروں پر
آنسو سات سمندر بھر گئے آنکھوں میں

اُس کا پیرہن تو چاندنی جیسا تھا
پھر یہ کیسے رنگ بکھر گئے آنکھوں میں؟

چلتے چلتے اُس نے جب مُڑ کر دیکھا
روشنیوں کے تیر اُتر گئے آنکھوں میں

جلتی بجھتی اُمیدوں کے عکس لیے
جگنو رات چراغاں کر گئے آنکھوں میں

ہر سانس بن ہے صریرِ خامہ
میں خود کو ہر آن لکھ رہا ہوں

کم ذائقہ آشنا ہیں جس کے
ایک ایسی زبان لکھ رہا ہوں

پتھر ہیں تمام لفظ، لیکن
میں پھول سمان لکھ رہا ہوں

روشن ہے یقین کی رُشنائی
یا اپنے گمان لکھ رہا ہوں؟

اِن دستِ بُریدہ موسموں میں
اللہ کی شان لکھ رہا ہوں!

دیوار بچ رہی ہے مجھ میں
صحرا کو مکان لکھ رہا ہوں

یہ معرفتِ غزل تو دیکھو
انجان کو "جان" لکھ رہا ہوں

خالد اقبال یاسر

کبھی بوند بوند سحاب میں اسے دیکھنا
کبھی نغمہ نغمہ رباب میں اسے دیکھنا

کسی کرم خوردہ کتاب میں اسے ڈھونڈنا
کسی بھولتے ہوئے باب میں اسے دیکھنا

بڑے سہل ہوں گے ملاپ جنتِ خواب میں
مگر اس جہانِ خراب میں اسے دیکھنا

وہ جو سہم سہم گیا ہے شہر پناہ میں
مجھے پاؤں ڈالے رکاب میں اسے دیکھنا

وہ گھڑی کہ حاصلِ عمر تھی نہیں بھولتی
کہاں پھر اسی تب و تاب میں اسے دیکھنا

سکوت اس روز بحر ہفت آسماں میں تھا
عجیب سحر آفتاب کے بادبان میں تھا

زمین بھی اپنی سانس روکے ہوئے کھڑی تھی
خدنگ ابھی وقت کی کشیدہ کمان میں تھا

مشام میں تھی ہرے بھرے ساحلوں کی خوشبو
سفینہ بادِ موافقت کی امان میں تھا

نظر نظر اونچے برج اس کے ابھر رہے تھے
وہ قریۂ نور ہر کسی کے دھیان میں تھا

کیا تھا شہکار کس صنعت گری نے یاسر
وہ نقش پوشیدہ جو ابھی تک چٹان میں تھا

خالد اقبال یاسر

ہوائیں اُڑتے رہے شبنمیں گلوں کے رنگ
تری ہنسی میں نظر آئے تتلیوں کے رنگ

وہ تازگی ترے پاؤں کی نرم چاپ میں تھی
نکھرتے جاتے تھے مرمر کی سیڑھیوں کے رنگ

شفق جھلکتی تھی آنکھوں میں بعدِ باراں کی
وہ ابر تھا بدلتے تھے بجلیوں کے رنگ

کنیزیں پاس کھڑی مور چھل ہلاتی تھیں
کہانی کہتے تھے ناخفتہ انگھڑیوں کے رنگ

وہ دیکھی آنچ پہ یاسر پکی ہوئی مٹی
مجھے خوش آئے صراحی سی گردنوں کے رنگ

بدلتے مناظر کی مشتاق نظریں وہیں رہ گئیں
وہاں سے چلا تو مری دونوں آنکھیں وہیں رہ گئیں

کٹھن منزلوں کا مسافر نگاہوں سے اوجھل ہوا
سنہری سموں والے گھوڑے کی ٹاپیں وہیں رہ گئیں

روانہ ہوا لے جرس کارواں کس طرف کیا خبر؟
بجھی راکھ، خیموں کی ٹوٹی طنابیں وہیں رہ گئیں

وہ کیا صورتیں تھیں کہ جو خاک میں خاک ہوتی رہیں
مگر ان کی باسمِ خوش آداب شامیں وہیں رہ گئیں

سفر میں وہ پچھلے پڑاؤ کے ایام بھولا نہیں
اماوس کی راتیں وہ بے صبر گھاتیں وہیں رہ گئیں

خالد اقبال یاسر

اک روشنی بجھتے ہوئے ذرّات میں آئی
کیا اور کوئی ذات مری ذات میں آئی

پہلے تھا کوئی اور میں اب اور کوئی ہوں
تبدیلی عجب میرے خیالات میں آئی

ہر چند ترے شہر کے در بند نہیں تھے
شب پھر بھی مسافر کو مضافات میں آئی

جی میں ہے وہی کچھ میں کھلی آنکھ سے دیکھوں
عرفاں کی گھڑی عالمِ سکرات میں آئی

لرزے تھے کوئی دیر ستونِ عرش کے یاسر
لکنت سی فرشتوں کی مناجات میں آئی

رستے میں رات آئی تو نمدہ بچھا لیا
گھوڑے کی زین اتار کے تکیہ بنا لیا

ہمراہ جانے کے لئے پَر تولتی ہوا
زادِ سفر میں اپنے لئے اور کیا لیا

دِل میں جو آرزو کوئی سر مارنے لگی
اِس کو تھپک تھپک کے وہیں پر سُلا لیا

ترکش کمان تیغ سرہانے دھرے رہے
اس نے لگا کے گھات مرا خواب اڑا لیا

نکلی نہ تھی ابھی وہ گھڑی دسترس سے دور
دو چار منزلوں پہ اسے میں نے جا لیا

یاسر بہت ملول کیا جب ملال نے
تنہا کہیں پہ بیٹھ کے خود کو رلا لیا

غلام حسین ساجد

ہُوا ہے نازل اِک آئینے پر غضب ہَوا کا
گزر نہ ہوگا ہمارے کوچے سے اَب ہَوا کا

ہوائے ہجرت سے تنگ ہے یہ نگر بھی لیکن
ابھی تلک احترام کرتے ہیں سب ہَوا کا

عجیب پھولوں سے اب بھی کچھ ٹہنیاں لدی ہیں
جلوس گزرے گا میری گلیوں سے کب ہَوا کا

بڑا توجہ طلب ہے میرا یہ مسئلہ بھی
کھلا نہیں میرے ذہن پر کیوں سبب ہَوا کا

اُداس ہو جب بھی طاقچے پر چراغ کی لَو
مِرے دیے کو یقین آتا ہے تب ہَوا کا

خوشی سے لہرا رہے ہیں باغوں میں پھول ساجد
رَچا ہے ساری فضا میں رنگِ طرب ہَوا کا

طلب نہیں ہے متاعِ خورشید کی ہَوا کو
عطا ہوئی ہے چراغ سے روشنی ہَوا کو

اُلجھ رہی ہے کہیں فلک پر نگاہ اُس کی
کسی ستارے سے پیار ہے آج بھی ہَوا کو

سیاہیٔ شب سے ٹوٹ گرنے کو تھیں صدائیں
ملی نمودِ سحر سے پھر تازگی ہَوا کو

زمین پر کچھ دنوں سے بادل جھکے ہوئے ہیں
کہ تازہ کرتی ہے منظروں کی نمی ہَوا کو

میں دیکھتا ہوں کہ شہر ہے زلزلے کی زَد پر
نہ راس آئے گی آج بھی یہ خوشی ہَوا کو

ابھی تلک گھومتے ہیں چاروں طرف بگولے
ترس رہا ہوں میں دشت میں شہر کی ہَوا کو

طلسم کا توڑنا ہی کافی نہیں تھا ساجد
سو پیش ہے اَب ہلاکتِ سامری ہَوا کو

غلام حسین ساجد

ایک اشارے پر ہوتی ہے جب تیار ہَوا
ساجد میں بھی خلق کروں گا پہلی بار ہَوا

کیسے کھُلی فضا میں ہوگا کوئی سانس نصیب
میری قسمت میں لکھّی ہے جب بیمار ہَوا

صرف ہمارے خیمے ہی سے اُس کو لاگ نہیں
کرتی ہے اِک خواب نگر کو بھی مسمار ہَوا

اُٹھ جاتا ہے اپنی قوّت پر سے مرا یقین
کرتی ہے جب میری ہستی کا انکار ہَوا

اُڑتی رہتی ہے جن گلیوں میں نفرت کی راکھ
ڈھونڈ رہی ہے وہاں محبّت کے آثار ہَوا

دُور دُور تک بجھی ہوئی ہے اِک مشعل کی لَو
کر جائے گی اب اِس دریا کو بھی پار ہَوا

آنکھوں میں اِک قصر اُٹھائیں گے مٹّی کے ہاتھ
اور دِل میں تعمیر کرے گی اِک دیوار ہَوا

چھوڑ چکا ہوں مَیں بھی ساجد سب کے ساتھ یہ شہر
گھوم رہی ہے میرے گھر میں بھی بیکار ہَوا

کھُلا ہے رنگِ دُنیا پھر ہَوا سے
ہوا ہے اِک نگر ظاہر ہَوا سے

مُسلسل ٹوٹتی رہتی ہیں لہریں
بہت بیزار ہیں شاعر ہَوا سے

بدل دیتی ہے دھڑکن چال دِل کی
بھٹک جاتا ہے یہ زائر ہَوا سے

خبر لینے کو اُس کے بام و دَر کی
بناتا ہوں میں اِک طائر ہَوا سے

کسی عِشتار نے پھُونکا ہے افسُوں
کہ جل اُٹھے ہیں تارے پھر ہَوا سے

کرے گا ایک دِن پرواز ساجد
پریشاں ہے ابھی طائر ہَوا سے

غلام حسین ساجد

اُس پار سمندر کے جاگیر ہَوا کی ہے
اور پاؤں میں اپنے بھی زنجیر ہَوا کی ہے

کس طرح مرے دل کو آئے نہ یقیں اُس پر
جب خوابِ محبت بھی تحریر ہَوا کی ہے

اُس کو بھی نوازا ہے پرواز کی طاقت سے
شامل مرے خوں میں بھی تاثیر ہَوا کی ہے

اِک شمع دمکتی ہے اُس گھر کے اندھیرے میں
طاقِ شبِ ہجراں پر تصویر ہَوا کی ہے

کچھ رنگ اُبھرتے ہیں آنکھوں کی سیاہی سے
خورشید کے سینے میں تنویر ہَوا کی ہے

ہر چند ٹھکانے کو ہے ایک جہاں ساجد
اِس طور بھٹکنا بھی تقدیر ہَوا کی ہے

بھڑکتا ہے مرے دل میں چراغ شہر ہَوا کا
مرے کوچے میں اُترا ہے کوئی لشکر ہَوا کا

گزرتے ہیں عجب اِک عاجزی کے ساتھ دل سے
کہاں ہے قصرِ مٹی کا، کہاں ہے گھر ہَوا کا

ہَوا کو اپنے خالق سے شکایت آج بھی ہے
اگرچہ دھیان رکھتے ہیں یہ بحر و بر ہَوا کا

وہ اب آئی ہے میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر
ٹھکانہ ہے فصیلِ شہر سے باہر ہَوا کا

وہی مٹی چڑھی جاتی ہے اب بھی آسماں کو
پلٹ کر میں نے دیکھا ہے وہی منظر ہَوا کا

پڑا ہوں خاک پر میں جاگتی آنکھوں کو لے کر
نصیب ایسے میں ہوتا ہے کسے بستر ہَوا کا

اگر وہ عکس اب بھی منتشر ہوگا نہ ساجد
تو پھینکوں گا میں اُس تالاب میں پتھر ہَوا کا

غلام حسین ساجد

گلے سے بھی لگایا تھا دمِ رخصت ہوا نے
کہ دی تھی مجھ کو دنیا میں بڑی عزت ہوا نے

مسلسل گھومتے رہتے ہیں لشکر روشنی کے
بڑھائی ہے نظامِ دہر کی دہشت ہوا نے

مرے سانسوں سے میلا پڑ گیا ہے خواب میرا
اڑا لی ہے طلسمی پھول کی رنگت ہوا نے

اگرچہ ہوں سیاہ خاک کا اِک فرد میں بھی
ادا کی ہے حقیقت میں مری قیمت ہوا نے

سمجھتا ہوں میں اپنے آنسوؤں کو آبِ حیواں!
کہ اِن بوندوں کو بخشی ہے وہی طاقت ہوا نے

اُسی کے ہو کے رہ جاتے ہیں اُلفت کرنے والے!
بھری ہے خاکِ صحرا میں بھی کیا لذت ہوا نے

میں ساجد مانگتا ہوں خاک ہی سے رزق اپنا
عطا کی ہے اگرچہ دہر کو راحت ہوا نے

چراغِ صبح سے چھینا ہے اُس کا حق ہوا نے
کہ دی ہے میرے دروازے پہ پھر دستک ہوا نے

سنا ہے سرد ہے تاثیر موجِ خاک کی بھی
مگر بخشی ہے میری روح کو ٹھنڈک ہوا نے

ستاروں سے کہاں زنجیر ہوتی تھی سیاہی
بکھیری ہے بہت اِس دہر میں کالک ہوا نے

سرہانے پر دھری ہیں جاگتی آنکھیں ہماری
بنایا ہے کسی کے خواب کو توشک ہوا نے

مکیں بدحال تھے کچھ روز سے اِس آئینے کے
سو بانٹی ہے دمِ خورشید سے رونق ہوا نے

سحر ہوتے ہی کھلتے ہیں انوکھے رنگ ساجد
بُنی ہے اِک سلیقے سے مری اجرک ہوا نے

غلام حسین ساجد

خوش آیا نہیں صبح کا منظر بھی ہوا کو
اب راس نہیں موجِ منوّر بھی ہوا کو

بے کار پھرا کرتی ہے وہ شہر میں لیکن
کچھ کام نہیں شہر سے باہر بھی ہوا کو

اُس پھول سے ملنے کی ہوس ختم نہ ہوگی
ہر چند ہر اک شے ہے میسّر بھی ہوا کو

اک دشتِ محبّت سے گزر کرنے کی خاطر
میں ساتھ ملا لوں گا مکرّر بھی ہوا کو

میں اُس کی معیّت میں کئی روز سے خوش ہوں
پہناؤں گا اب خواب کا زیور بھی ہوا کو

کس طرح اُسے روک سکیں گی مری آنکھیں
جب راستہ دیتا ہے سمندر بھی ہوا کو

جس خاک نے پھونکا ہے مری رُوح کو ساجد
کرتی ہے وہی خاک معنبر بھی ہوا کو

راس آتی ہے نظمِ جہاں کو اگر اُس دیئے کی ہوا
کھینچتی ہے چراغوں کی تنویر کو آئینے کی ہوا

صرف اُس نے جلائے نہیں ہیں مرے منظروں کے دیئے
آگ بھرتی ہے میرے رگ و پے میں بھی راستے کی ہوا

اُس نے ایسے اندھیرے میں روشن کیا عکس اک خواب کا
سُرخرو ہے مری شمع کے فیض سے آئینے کی ہوا

گھر پلٹنے کی خواہش میں پیدا ہوئے ہیں ہوا و ہوس
واپسی کے سفر میں بگڑنے لگی قافلے کی ہوا

آج بھی میرے سینے پہ کچھ بوجھ ہے غیب کے راز کا
آج بھی میرے گھر میں سمٹ آئی ہے فاصلے کی ہوا

چین ملتا نہیں ہے مری رُوح کو جامِ جمشید سے
سیر کرتی ہے ساجد مجھے خواب کے سلسلے کی ہوا

پ کراچی

لام حسین ساجد

پھر کھینچتی ہے شمعِ جہاں تاب کی ہوا
زنجیر کر رہی ہے مجھے خواب کی ہوا

ساکت پڑا ہوا ہوں کسی جھیل کی طرح
رُکتی ہے میری سطح پر مہتاب کی ہوا

میں نے بھی اِک کنویں میں گزاری تھی ساری رات
اُس نے بھی ترک کی تھی گُلِ آب کی ہوا

بُجھنے کو ہے چراغ بھی کیا میری فکر کا!
خوش ہو رہی ہے کس لئے محراب کی ہوا

اُس کو بھی میری رُوح سے شاید تھی کوئی کد
جس نے بھی سطحِ خاک پہ نایاب کی ہوا

ساجد فقط دعائے اسیرانِ دشت سے
رُک پائے گی نہ شہر کے آداب کی ہوا

کہاں محصور کرتی ہے مناظر کو ہوا میری
جکڑ سکتی ہے لیکن ایک شاعر کو ہوا میری

اگرچہ نوچ لیتی ہے وہ پَر میرے خیالوں کے
اُڑاتی ہے مگر اک سبز طائر کو ہوا میری

حضر میں شمعِ محفل ہے سفر میں چھاؤں بنتی ہے
سو اکثر راس آتی ہے مسافر کو ہوا میری

اُدھر کے رنگ تکتا ہے، اِدھر کی سیر کرتا ہے
جہاں بھی کھینچ لے جاتی ہے زائر کو ہوا میری

جہانِ خواب کی تفسیر آساں تو نہیں، لیکن
نئے پہلو سجھاتی ہے مُفسّر کو ہوا میری

عجب اِک روشنی سی ہے مری تحریر میں ساجد
نیا مفہوم دیتی ہے عناصر کو ہوا میری

غلام حسین ساجد

بنا لیا ہے کہیں فلک پر مکاں ہوا نے
بس ایک خوابِ وصال کے درمیاں ہوا نے

فقط وہ خورشید ہی نہیں ہے نشانہ اس کا
کیا ہے میرے بھی آئینے کا زیاں ہوا نے

نظر نہ آئیں گے اب سنورتے ہوئے ستارے
کہ اب بکھیرا ہے عرش پر بھی دھواں ہوا نے

اُسے بھی نظمِ جہاں پہ شرمندگی ہوئی ہے
کیا ہے جب بھی حسابِ سود و زیاں ہوا نے

اُنہیں اگر موقلم دیا ہے کہ عکس کھینچیں!
عطا کیا ہے مجھے ابھی زورِ بیاں ہوا نے

وہ خواب میں ایک پل کو مہماں ہوا تھا میرا
جگا دیا ہے مجھے کسی مہرباں ہوا نے

چھپا لیا ہے چراغ سے ایک بھید ساجد
مگر بنایا ہے شمع کو رازداں ہوا نے

چراغ اور آئینے سے مُنہ موڑ کر ہوا نے
بنا لیا ہے کسی ستارے پہ گھر ہوا نے

فقط نہتّا نہیں کیا میرے دشمنوں کو
دھری ہے میری کٹار بھی خاک پر ہوا نے

اگر بڑھایا ہے آگ نے غیب کا تقدّس
کیا ہے خوابِ جہاں کو بھی خوب تر ہوا نے

اُداس رہتی ہے اب ستاروں کی روشنی بھی
کہ چھین لی ہے مری متاعِ نظر ہوا نے

بہت بڑھایا ہے نوعِ انساں میں صبر لیکن
کیا ہے میعادِ عمر کو مختصر ہوا نے

کڑی مشقت نے شل کیے تھے ہمارے بازو
اُکھاڑ پھینکا ہے اب قفس کو مگر ہوا نے

اُلٹ کے رکھ دوں گا ایک لمحے میں دشت ساجد
عطا کیا ہے مجھے کچھ ایسا ہنر ہوا نے

غلام حسین ساجد

تھکن سے گھومتا رہتا ہے سر میری ہوا کا
مگر جاری ہے گردوں کو سفر میری ہوا کا

ضرورت ہی مجھے کیا ہے خود اپنی مدح کی اب
اگر ظاہر ہے دنیا پر ہنر میری ہوا کا

سحر ہوتے ہی اڑتی ہیں عجب چنگاریاں سی
مجھے بے چین رکھتا ہے شرر میری ہوا کا

ابھی وہ غور سے سنتا ہے میری گفتگو کو
ابھی ہے طبع پر اس کی اثر میری ہوا کا

بہت خوش ہے کسی بے مہر کے نزدیک رہ کر
ٹھکانہ ہے ابھی اک بام پر میری ہوا کا

مری مٹی میں کھلتے ہیں عجب کچھ پھول لیکن
انہیں پھر راکھ کر دیتا ہے شر میری ہوا کا

ہوئی ہے خلق مجھ کو منتشر رکھنے کی خاطر
فسانہ ہے بہت ہی مختصر میری ہوا کا

مجھے اب روک پائے گا نہ کوئی شہر ساجد
کہ اک لشکر ہے دریا سے ادھر میری ہوا کا

نقش کریں گے جبر کے ماتھے پر تحریر ہوا کی
پاؤں میں چلتے وقت کے ڈالیں گے زنجیر ہوا کی

نہیں کہ جان بلب ہے صرف مرے دشمن کا لشکر
بوجھ بنی ہے میرے دل کا بھی تاخیر ہوا کی

بہے چلے جاتے ہیں مٹی کے معصوم ستارے
رک جاتی ہے ایک جھروکے میں تنویر ہوا کی

میرے حصے میں آئے ہیں مٹی، آگ اور پانی
آئی ہے اک خواب کے حصے میں جاگیر ہوا کی

سچ ہے غیب کی نسبت سے ہوتی ہیں روشن آنکھیں
دیکھیں کون بدلنے آتا ہے تقدیر ہوا کی!

جب اک کیف سے لہراتے ہیں پھول کسی گلشن کے
بڑھ جاتی ہے میرے دل میں بھی توقیر ہوا کی

شاید اب ملتان بھی ساجد مجھ کو راس آ جائے
بدل رہی ہے دھیرے دھیرے کچھ تاثیر ہوا کی

غلام حسین ساجد

اسیر کیسے کروں گا اُس نیلمیں ہَوا کو
مرے ستارے سے کوئی نسبت نہیں ہَوا کو

بنائے گی آشیاں کسی طاقچے میں اپنا
نہ چین آئے گا خاک پر جب کہیں ہَوا کو

تمام آنکھوں میں پھر اُترنے لگی ہے مٹّی
ترس رہے ہیں کئی دنوں سے مکیں ہَوا کو

اُسے خوشی آتی نہیں ہے سانس کی اسیری
پسند کرتی نہیں ہے وہ یاسمیں ہَوا کو

بڑی ضرورت ہے آج عشتار کو مدد کی
بُلا رہا ہے چراغ زیرِ زمیں ہَوا کو

مجھے خدایانِ بحر و بر سے گلہ رہے گا
اگر نہ بھائے گی راحتِ اوّلیں ہَوا کو

کہیں حقیقت میں وہم ہی تو نہیں ہوں ساجد
نہیں ہے میرے وجود پر بھی یقیں ہَوا کو

اس خواب کے ورثے میں اِک دہر ہَوا کا ہے
کچھ رنگ ہے مٹّی کا، کچھ زہر ہَوا کا ہے

اِس پار بھی چلتے ہیں جھونکے تری یادوں کے
اُس پار بھی دریا کے اِک شہر ہَوا کا ہے

کس طور بجھاؤں گا اُس رُوپ کی مشعل کو
مہمان مرے گھر بھی اِک قہر ہَوا کا ہے

اِک آگ سی جلتی ہے اب میری رگوں میں بھی
شامل مرے خوں میں بھی اب زہر ہَوا کا ہے

بے صبر ہوائیں ہیں اُس شخص کے لشکر میں
اور میرے جِلو میں بھی اِک دہر ہَوا کا ہے

ساجد مری دُنیا کی اتنی سی حقیقت ہے!
اِک دشت کے سینے پر اِک شہر ہَوا کا ہے

غلام حسین ساجد

ہر چند آئینے کو نسبت نہیں ہوا سے
ہوتی ہے تازہ اب بھی وہ یا ئیں ہوا سے

کچھ رنگ ہے فضا میں میرے لہو کی چھب کا
کچھ راکھ اُڑ رہی ہے اک نیلمیں ہوا سے

کرتی ہے خلق یوں تو اب بھی جہاں کو لیکن
اس بار اُٹھ گیا ہے میرا یقیں ہوا سے

پھر عرش پر بسائی ہیں بستیاں کسی نے
محروم رہ گئے ہیں اب بھی مکیں ہوا سے

میں سانس لے رہا ہوں اک خواب کی مدد سے
اک آگ جل رہی ہے زیرِ زمیں ہوا سے

بے خواب جس کے دم سے ہیں آئینے کی آنکھیں
زندہ ہے میرا دِل بھی اُس اوّلیں ہوا سے

کب سے مرے بدن کے زنداں میں ہے وہ ساجد
اِک شرطِ جیت لی تھی میں نے کہیں ہوا سے

کئی دِن سے بُلاتے ہیں ستارے بھی ہوا کو
بہت بے چین کرتے ہیں یہ بچّے بھی ہوا کو

جو اِک دُشمن سے چھینوں گا ہوا کی سلطنت میں
کروں گا ایک دُشمن کے حوالے بھی ہوا کو

مجھے بھی ساتھ رکھنی ہے سفر میں خاک اپنی
کہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں پرندے بھی ہوا کو

حقیقت میں ضرورت بھی کبھی پڑتی ہے لیکن
کبھی ہم ساتھ لے لیتے ہیں ویسے بھی ہوا کو

فقط وہ بند کھڑکی ہی نہیں بے صبر اتنی
ترستے ہیں مرے گھر کے دریچے بھی ہوا کو

نبھائے جا رہا ہوں میں بھی اپنا کام ساجد
اسیرِ خواب رکھتا ہوں، میں جیسے بھی ہوا کو

کرامت غوری

وہ دلنواز ہے کیوں دل کو اعتبار نہیں
خزاں گزر بھی گئی آمدِ بہار نہیں

فصیل شہر پہ پہرے ہیں ظلمتوں کے ابھی
سحر کے نور میں اَب تک سوادِ یار نہیں

میرا چمن ہے، میرے پھول میری کلیاں ہیں
مگر چمن کی بہاروں پہ اختیار نہیں

عجیب موڑ پہ چھوڑا ہے لاکے دُنیا نے
تری تلاش تو ہے تیرا انتظار نہیں

دیارِ عشق میں رزقِ حبیب ہے ناپید
غریبِ شہر کو اَب یہ بھی روزگار نہیں

یہ مانتے ہیں کرامت وہ حاصلِ جاں ہے
مگر حقیقتِ حالات سے فرار نہیں

وہ بے مثال تھا اور مجھ سے پیار کرتا تھا
میں جس پہ اپنے دل و جاں نثار کرتا تھا

وہ دلنواز بھی تھا اور زمانہ ساز بھی تھا
کرم کے ساتھ ستم بے شمار کرتا تھا

کبھی تو مجھ کو رگِ جاں سے پاس رکھتا تھا
کبھی وہ حلقۂ اعدا میں وار کرتا تھا

وہ مجھ کو ہجر کے لمحے جتاتا رہتا تھا
کبھی جو وصل سے وہ مشکبار کرتا تھا

وہ آکے مجھ میں نئی رُوح پھونک جاتا تھا
غمِ زمانہ جو مجھ کو شکار کرتا تھا

اَب اُس کا راستہ تکنا ہی زندگی ٹھہرا
کبھی جو شخص میرا انتظار کرتا تھا

کرامت آج بھی اُس کا سرور باقی ہے
جو آدمی سے مجھے مستِ خمار کرتا تھا

کرامت اللہ غوری

میں تیری آنکھ میں ٹھہرا ہوا ہوں
سمندر ہوں مگر سمٹا ہوا ہوں

بغاوت خون میں شامل ہے لیکن
سکوتِ شہر سے سہما ہوا ہوں

میں یوں تخریب پہ مائل ہوں جیسے
تری تخلیق کی میں انتہا ہوں

جسے سود و زیاں کا غم نہیں ہے
میں اپنے عہد کا وہ سلسلہ ہوں

مرے فن کو مرے قد سے نہ ناپو
نظر آتا ہوں جو اس سے سوا ہوں

کرامت بات اپنے ظرف کی ہے
فراتِ وقت سے پیاسا چلا ہوں

جگر کو چاک کر دوں صاحبِ ہنر ٹھہروں
میں تیرے عشق میں اتنا تو معتبر ٹھہروں

تو آفتاب بنے تو نظر کی دھوپ بنے
میں سایہ بن کے ترے ساتھ سربسر ٹھہروں

میں تیرے عشق میں پھیلوں سمندروں کی طرح
سمٹ سکوں تو تری آنکھ کا گہر ٹھہروں

جو تو رکے تو ترے پاؤں کی لکیر بنوں
ترے جلو میں چلوں تیرا ہمسفر ٹھہروں

تری انا کو تراشوں سفید مرمر میں
ثنائے ذات کا ایسا نشان ور ٹھہروں

اس ایک پل کیلئے جب میں تجھ کو یاد آؤں
سوال بن کے ترے در پہ عمر بھر ٹھہروں

کرامت اللہ غوری

میں آگ ہوں نہ میرے پاس آ جلا دوں گا
میں زخم زخم ہوں تجھ کو لہو رُلا دوں گا

میری پناہ میں آنا ہے تیری نادانی
میں خود تباہ ہوں تجھ کو پناہ کیا دوں گا

پلٹ سکے تو چلا جا عزیز رکھ نہ مجھے
میں خود سراب ہوں صحرا تجھے بنا دوں گا

غبار بن کے نہ چھا جاؤں تیری دُنیا پر
میں راہزن ہوں تجھے راہ سے ہٹا دوں گا

تو آبدار صدف ہے تو لعل و گوہر ہے
میں سنگِ راہ ہوں پتھر تجھے بنا دوں گا

تری نگاہِ زمانہ شناس اب بھی نہیں
ذرا سے پردے ہٹا مصلحت سکھا دوں گا

مجھے نہ روک کہ اب بخت میرے ساتھ نہیں
میں آج ضبط کی ساری حدیں مٹا دوں گا

میرے جنوں کا ہر انداز فاتحانہ ہے
میں آج زعم کا ہر سومنات ڈھا دوں گا

کبھی اندھیرے جو اوقات کے بڑھے میری
تو گھر کو پھونک کے سب مشعلیں جلا دوں گا

کرامت اُس نے میرا صبر آزمایا ہے
سو مَیں نے عہد کیا ہے اُسے بھلا دوں گا

یہ کون مجھے بُلا رہا ہے
تو ہے کہ دُور کی صدا ہے

سورج میں جلال بڑھ رہا ہے
یا وقتِ زوال آ رہا ہے

تو مجھ سے بھلا کیوں ہو نادم
تو فرشتہ ہے اور نہ خدا ہے

دُنیا نے سبق بہت دیے پر
خود میں نے انہیں بھلا دیا ہے

میں ان سے کہاں تلک بچوں گا
کانٹوں نے چمن بسا لیا ہے

ذہنوں میں شکوک کم نہیں تھے
تو اور انہیں بڑھا رہا ہے

آنکھیں تری سچ بولتی ہیں
اب کیوں اُنہیں جھٹلا رہا ہے

رستے میں راہزن بہت ہیں
تو کِس سے فریب کھا رہا ہے

سب چہرے کتاب تھے لیکن
میں نے ہی انہیں غلط پڑھا ہے

تجھ میں جو عکس تھا خدا کا
وہ عکس کیوں اب گہنا رہا ہے

اجداد سے ہم کو جو ملا تھا
سرمایہ وہ لُٹتا جا رہا ہے

اسعد بدایونی

پلک جھپکتے حقائق فسانہ ہوتے ہیں
یہ قافلے تو ازل سے روانہ ہوتے ہیں

شدید دھوپ سے سمجھوتہ کون کرتا ہے
گھنے درخت ہی سب کا ٹھکانہ ہوتے ہیں

کبھی طویل علاقے سمٹنے لگتے ہیں
کبھی حقیر سے لمحے زمانہ ہوتے ہیں

کھلے دریچے ہوا کو پسند آتے ہیں
چراغِ خانہ ہی اکثر نشانہ ہوتے ہیں

کتاب کوئی اُترتی نہیں تو کیا غم ہے
کہ ہم پہ ظلم تو پیغمبرانہ ہوتے ہیں

تلاشِ رزق میں ویران کرتا رہتا ہوں
ابھی سفر نہیں سامان کرتا رہتا ہوں

خود اپنی راہ میں اکثر پہاڑ اُگاتا ہوں
خود اپنی مشکلیں آسان کرتا رہتا ہوں

بس ایک تیری محبت پہ انحصار نہیں
یہ کاروبار مری جان کرتا رہتا ہوں

سجاتا رہتا ہوں کاغذ کے پھول پیڑوں پہ
میں تتلیوں کو پریشان کرتا رہتا ہوں

میں تخمِ اشک سے طوفاں اُگانے کی ضد میں
تمام شہر کو حیران کرتا رہتا ہوں

مرے مکاں میں دھواں بھی گھٹن بھی ہے لیکن
میں خوشبوؤں کو بھی مہمان کرتا رہتا ہوں

اسعد بدایونی

زیادہ خواب بھی اعصاب کو تھکاتے ہیں
مسافروں سے کہو راستے بلاتے ہیں

ستم گروں کا قبیلہ کہیں قریب ہی ہے
دعا کے زرد پرندے ادھر سے آتے ہیں

ہر ایک ذرۂ خاکی میں خون شامل ہے
کہ اس زمیں میں بہت آسماں سماتے ہیں

سرائے دل میں کبھی کوئی شخص آیا تھا
دریچے، طاقچے، دیوار و در بتاتے ہیں

فضائے شوق میں پھیلے ہوئے ہیں جال تو کیا
کہ طائروں کو بڑے داؤ پیچ آتے ہیں

زمین تنگ ہمیشہ سے اہلِ درد پہ ہے
جبھی یہ لوگ سمندر کے ہوتے جاتے ہیں

وہ ایک نام جو دریا بھی ہے کنارا بھی
رہا ہے اس سے بہت رابطہ ہمارا بھی

چمن وہی کہ جہاں پر لبوں کے پھول کھلیں
بدن وہی کہ جہاں رات ہو گوارا بھی

ہمیں بھی لمحۂ رخصت سے ہول آتا ہے
جدا ہوا ہے کوئی مہرباں ہمارا بھی

علامتِ شجرِ سایہ دار بھی وہ جسم
خرابیٔ دل و دیدہ کا استعارہ بھی

افق تھکن کی ردا میں لپٹتا جاتا ہے
سو ہم بھی چپ ہیں اور اس شام کا ستارہ بھی

اسعد بدایونی

میں شاعر کاذب لفظوں کا میں عاشق کچے رنگوں کا
مرے پاس ہے تھوڑا سرمایہ کچھ جذبوں اور اُمنگوں کا

مرے شہر ترے میدانوں میں کچھ پھول ٹہلتے رہتے تھے
ترے آسمان پر میلہ تھا کچھ اُڑتی ہوئی پتنگوں کا

مرے دریا ترے کناروں پر کچھ ریت گھروندے روشن تھے
ترے پانی کی آغوش میں تھا اک ٹولہ مست ملنگوں کا

جب شاخیں سبز تابندہ تھیں جب ساری آنکھیں زندہ تھیں
میں پتّہ ہوں اُس موسم کا میں نوحہ گران رنگوں کا

میں ایک سپاہی ہارا ہُوا تسلیم مجھے تسلیم مجھے
اب ذکر نہ چھیڑو میداں کا اب حال نہ پوچھو جنگوں کا

اَب کے اُداسیوں کی تب و تاب اور ہے
آنکھیں وہی ہیں ان میں مگر خواب اور ہے

میں ساحلِ ہوس پہ کھڑا سوچتا ہُوں کیا
یہ پھُول اور ہے کہ یہ تالاب اور ہے

موجِ خیال گردشِ بے منظری میں ہے
ایک آسمان جیسے تہہ آب اور ہے

اِن آنسوؤں سے کشتِ بدن سینچتا ہوں میں
جو شہر کو ڈبوئے وہ سیلاب اور ہے

گہرے سمندروں سے شکایت نہیں کوئی
دل جس میں ڈوبتا ہے وہ گرداب اور ہے

باہر کی چاندنی کا سبب ہے فلک کا چاند
اندر کے آسمان پہ مہتاب اور ہے

اسعد بدایونی

سورج کی طرح قریۂ مہتاب میں آیا
رات ایک عجب شخص مرے خواب میں آیا

کیا لہر تھی جو مجھ کو لگا آئی کنارے
کس موج سے پھر حلقۂ گرداب میں آیا

یہ شہر تو صحراؤں کی سرحد پہ بسا تھا
کیسے یہ خرابہ کفِ سیلاب میں آیا

اِک یاد سے روشن ہوئے دیوار و در و بام
خم ایک نئی طرح کا محراب میں آیا

پہلے تو دھنک رنگ میں ڈوبا اُفقِ جاں
پھر منظرِ ہجراں بھی تب و تاب میں آیا

اک شخص کہ یکتا تھا دریدہ دہنی میں
ذکر اُس کا مگر پیار سے احباب میں آیا

مرے ریگ زار میں اس برس یہ کمال موجِ بلا کا تھا
نہ وہ کشتیاں تھیں غبار کی نہ وہ بادبان ہوا کا تھا

جو ہتھیلیوں کو سجا گیا جو سہیلیوں کو ہنسا گیا
مری آرزوؤں کا خون تھا کہ وہ رنگ برگِ حنا کا تھا

کبھی چشمِ شوق کے سامنے کوئی شے دھنک کی طرح کھنچی
کبھی دل کے دشت میں پھول سا کوئی کھِل گیا جو بلا کا تھا

کبھی ایک یاد کی لہر نے مرے ساحلوں کو سُبک کیا
کبھی اک ستارہ چمک اُٹھا جو اُسی ستارہ نما کا تھا

کئی رنگ جس میں سما گئے وہ طویل دُھوپ کی جھیل تھی
جو کئی چراغ بجھا گیا ہے وہ ہاتھ بادِ فنا کا تھا

اسعد بدایونی

ہم اپنے ہجر میں اپنے وصال میں گم ہیں
وہ سوچتا ہے کہ اُس کے خیال میں گم ہیں

ہر ایک لمحۂ لذّت حساب مانگتا ہے
سو ہم بھی سب کی طرح اک سوال میں گم ہیں

کہاں سے آئے ہیں یہ طائرانِ خوش آواز
درخت کس لیے سحرِ جلال میں گم ہیں

شفق کی آنکھ کسے رو رہی ہے مدّت سے
دیار و دشت سبھی کس ملال میں گم ہیں

رتوں کے دائرے کیوں آج تک سلامت ہیں
تمام سلسلے کیوں ماہ و سال میں گم ہیں

یہ چاند جھیل کے پانی سے ہم کلام ہے کیوں
کنارے کس لیے رنج و ملال میں گم ہیں

رہی اگرچہ نگاروں کی مہربانی بھی
بہت خراب کٹی رات بھی جوانی بھی

تجھے گنوا کے ترے واسطوں کا کیا کرتے
اسی لیے تو نہ رکھی کوئی نشانی بھی

دل و نگاہ کے رستوں میں کون حائل ہے
کہ ہم پہ بند ہوئے روشنی بھی پانی بھی

اگر لبوں سے نہ نکلے اگر دلوں میں رہے
بہت نئی ہے ابھی بات اک پرانی بھی

عذابِ صحبتِ ناجنس کے شکار ہیں ہم
خدا زمیں پہ ہمیں دے ہمارا ثانی بھی

یاسمین حمید

ہمیں جبر بھی بچانے کا اُس میں یارا نہیں
سو ہم بھی ڈوب گئے اور اسے پکارا نہیں

خود آفتاب میری راہ کا چراغ بنے
مگر یہ بات میرے چاند کو گوارا نہیں

جو اُس میں اُتری تو طوفان ہی ملیں گے مجھے
میں جانتی ہوں کہ وہ موج ہے کنارا نہیں

وجود جس کو کسی معتبر شجر نے دیا
ہوا کی زد میں بھی تنکا وہ بے سہارا نہیں

عجب فضا ہے کہ رنگِ نمودِ صبح بھی ہے
سیاہ رات نے بھی پیرہن اُتارا نہیں

ہوا تو لائی ہے کچھ بیج زندگی کے مگر
فضائیں خشک ہیں موسم کا ہی اشارہ نہیں

جلے گا خود بھی سحر تک مجھے بھی لَو دے گا
چراغِ شام کوئی بخت کا ستارا نہیں

تو بدل کر کبھی انداز پذیرائی کا
امتحاں لے میرے احساس کی بینائی کا

آئی جب اُس کے مقابل تو نیا بھید کھلا
مجھ کو اندازہ نہ تھا اپنی توانائی کا

اُس نے بس سطح پہ چلنے کا سلیقہ سیکھا
اور سمجھنا تو مجھے کام تھا گہرائی کا

مسئلے میرے چمن زادوں کے تبدیل ہوئے
پھول اب ذکر نہیں کرتے ہیں تنہائی کا

رُوح کی کوکھ ہمیشہ ہی تہی رہتی ہے
چہروں پہ غازہ سجا رہتا ہے زیبائی کا

وقت نے کوئی گرہ کھولی نہیں ہے اب تک
بس لئے پھرتا ہے اک زعم مسیحائی کا

کھو گیا کثرتِ گویائی کے ہنگامے میں
ایک جو حرف تھا گفتار میں دانائی کا

یاسمین حمید

شام کا پہلا ستارا ڈوبا
اک مسافر کا سہارا ڈوبا

کم نگاہی نے اسے مار دیا
موج کی ضد میں کنارا ڈوبا

گننے نکلا تھا بھنور کے چکر
اس تجسس میں بچارا ڈوبا

کچھ تو گہرائی میں لذت ہوگی
اس سے پوچھو جو دوبارہ ڈوبا

اس نے چلنے کو کہا تھا لیکن
بھیڑ میں اس کا اشارا ڈوبا

ایک اک نقش نے مبہوت کیا
جیسے آنکھوں میں نظارا ڈوبا

موجۂ عشق ہے طغیانی یہ
پھر کوئی بخت کا مارا ڈوبا

کسی نے حشر برپا کر دیا ہے
سمندر کو جو قطرہ کر دیا ہے

خوشی جو دل کی تہہ سے پھوٹتی تھی
اسے نقشِ سویدا کر دیا ہے

بنا کر دوست میرے چارہ گر کو
میرے زخموں کو گہرا کر دیا ہے

جہاں منزل کے میں نے بیج ڈالے
انہیں کھیتوں کو رستہ کر دیا ہے

بہت تھی آئینے کی آبداری
اسے نظروں نے میلا کر دیا ہے

میں سچائی اسے کیسے دکھاؤں
اسے نفرت نے اندھا کر دیا ہے

محبت کی گواہی دے کے تم نے
مجھے سب میں اکیلا کر دیا ہے

یاسمین حمید

پتھرائی ہوئی آنکھ میں آنسو نہ رہا
کچھ رنج کے اظہار کا پہلو نہ رہا

تو تھا تو اندھیرے میں نظر آ نہ سکا
پھر روشنی در آئی مگر تو نہ رہا

مانا کہ جلانا نہ تھا مقصود اسے
کچھ آگ کو فطرت پہ ہی قابو نہ رہا

یا میری سماعت ہی بے احساس ہوئی
یا اُس کے تخاطب میں ہی جادو نہ رہا

رستہ کسی کھوئی ہوئی بلبل کا بنے
ایسا کوئی اب باغ میں جگنو نہ رہا

رقص کرتی لہر پہ بس مسکرانا چاہیئے
پھینک کے پانی میں پتھر بھول جانا چاہیئے

سر پہ چھت تو پڑ گئی ہے یہ مگر سوچا نہیں
دل کی بے سمتی کو بھی کوئی ٹھکانہ چاہیئے

منتقل ہونے سے پہلے ان در و دیوار کو
بجلیاں خود ہی گرا کے آزمانا چاہیئے

ہاں نئے آئینے کا بھی عکس اُجلا ہے مگر
کیا پُرانے آئینوں کو ٹوٹ جانا چاہیئے؟

کیا خبر یہ شہر میری فتح کے قابل نہ ہو
سوچ کر ہی کشتیوں کو بھی جلانا چاہیئے

نظمیں

احمد ظفر

اندھی مسافت کا بھنور

گونگے رشتوں کی دہلیز پر آسماں جھک رہا ہے
بے نقاب آفتوں کے روشن چہرے
قرونِ اولیٰ کے شتربانوں کو تلاش کر رہے ہیں
جو کسی نیلی محمل نشیں کی آرزو میں بھٹکتے بھٹکتے
اپنی آنکھیں کسی سمندر کی تہہ میں دفن کر گئے ہیں

پیاسے کہساروں کے سینے میں
کتنے چشمے مچل مچل کر سو چکے ہیں
یاس کے گہوارے میں پھولوں کی مہک
ایک بے جسم دوشیزہ کے خدوخال دکھا رہی ہے
کوہ قاف کے شہزادوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر سجائے ہیں،
شہسوار عبث کی دلدل میں اپنی شناخت کا آخری حوالہ بھی
گم کر چکے ہیں

سورج کے تالاب میں قطرہ قطرہ شبنم کی پھوار
بے بنیاد درودیوار پر
سات رنگوں کی اجنبی عبارت لکھ رہی ہے
لہو میں ڈوبے ہوئے پرندوں کے پر
کسی مصور کے قلم کے ہم رنگ ہو گئے ہیں
ہجر کی فصیلوں پہ رکھے ہوئے چراغوں کی لہریں تھرتھرا رہی ہیں
اندھی الھڑ لڑکیوں کے ہنستے ہوئے ہونٹوں کا موم پگھل رہا ہے

سلگتے لمحوں کی آنچ سرگوشیاں کر رہی ہے
کسی الاؤ کے فلک بوس شعلے، راکھ میں تبدیل ہو رہے ہیں
زندہ انسانوں کے مردہ جسم،
دار و رسن کے مرحلوں کو آواز دے رہے ہیں،
ہم کون ہیں؟ ازل کے مسافر"
جو اپنی شخصیت کے سرابوں میں صدیوں سے سسک رہے ہیں۔

احمد ظفر

ہونی

مَیں آئینہ توڑ دوں
تو میرا ہی عکس ریزہ ریزہ ہو گا
تم جدائی کے کہسار کی اس طرف چلی جاؤ گی
یہاں خزاں زدہ شجر پر ــــ
پھر بھی ــــ نئے نئے پھول کِھلتے رہیں گے
تصوّر کی اندھی آنکھ میں سورج
مستقبل کی عبارت لکھتا رہے گا
چاند کے داغ دار چہرے سے
چاندنی کا دریا بہتا رہے گا
زندگی، کائنات، اور انسان
ہوا کے سرکش جھونکوں کی طرح
ایک دوسرے سے اُلجھتے رہیں گے۔

انہونی

پہاڑ بولتے ہیں!
دریا نغمہ سرا رہتے ہیں
پھر بھی تم خاموش رہتی ہو
میں سرگوشیوں کے چراغ
کب تک روشن رکھوں گا
فاختہ کے زخم سے رِستا ہُوا لہو
امن کے بول لکھتا ہے
تو خوشبو بارود کا لباس پہن لیتی ہے
بُرائی کے زہر سے بننے والی کسی تصویر کو
مُصوّروں نے کسی ادھورے خواب کی تعبیر کیوں لکھا ہے؟۔

محبتوں کے نگار خانے میں

ظفر

دوستی شراب کے پیالے میں ڈبوئی نہیں جاتی
خلوص کے آئینے میں سیقل کی جاتی ہے
نشہ عبادت ہے، اور عبادت عمل ؟
ہجر کے آزردہ لمحوں سے وصل کے گل فروش لمحے جنم لے سکتے ہیں ؟
مرنے والے جاتے جاتے اپنے ہاتھوں کے رستے لہو سے —
— در و دیوار پر آئندہ کی عبارت لکھ جاتے ہیں
تم جو کسی نادیدہ صحرا میں، نخلستان کے سرسبز شجر کی طرح تھے
آج کسی اُجڑے ہوئے اجنبی دیار میں
اپنی پہچان کے کانٹوں سے اُنگلیاں لہولہان کر رہے ہو

آؤ میں تمہیں سرشار کر دوں
تم مجھے حواس کی آخری سرحد پر
خود فراموشی کے کسی جنگل میں
ایک بار پھر تنہا چھوڑ دو
یہی میرا حوالہ ہے
جو کسی قاتل کے سینے پر
ہفت رنگ تمغوں کی طرح جگ مگ جگ مگ نہیں کرتا

ہم محبتوں کے نگار خانے میں
اپنی اپنی شدید نفرتوں کے اسیر
حروف کی منشیات کے سوداگر
ایک ہی سمت میں کب تک ہمسفر رہیں گے ۔

احمد ظفر

عہدِ بے نام کا منظر نامہ

ا۔ انجماد

یہاں گہری خموشی ہے
وہاں کوئی سمندر سانس لیتا ہے
یہاں شبنم کسی غم کی طرح دن میں سلگتی ہے
وہاں اندھے ستارے روشنی کی آرزو میں ـــــ
ــــ ریزہ ریزہ ہو گئے جیسے ـــــ
کنویں میں جس طرح کوئی پری اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی ہے

خموشی کس قدر گہری خموشی ہے
کہ غنچوں کی چٹک بھی بوجھ بنتی جا رہی ہے شب کی پلکوں پر
کسی کا نام لیوا کون ہوگا، کون ہوتا ہے؟
یہ سائے دل ہمیں ہیں
واہموں میں زندگی ساری بسر ہوگی
کسے معلوم ہے وہ نام کس کا ہے؟
جسے نادیدہ ہاتھوں نے کبھی لکھا، کبھی خود ہی مٹایا ہے
عبارت حرف کی مرہونِ منّت حرف لفظوں کے
مگر پھر بھی کسی نے ان کہی کا زرد پتھر رکھ لیا ہے اپنے ہونٹوں پر

یہی وہ کارزارِ زندگی ہے
دیکھنے والوں نے دیکھا ہے تماشا پتلیوں کا
پتلیاں بے جان ہیں جس میں
برستے بادلوں میں جس طرح صحرا
ازل کی پیاس، آنکھیں بے حسی، میّت کی خاموشی
زمیں کے دائروں میں آگ روشن ہے
مگر تاریکیوں کے جال پھیلاتے ہوئے لمحے سسکتے ہیں

شکستِ فاش دی ہو خامشی نے قصر کے اونچے مکینوں کو
یہ ممکن تو نہیں ہے پھر بھی ایسے خواب دیکھے جا رہے ہیں
زندگی کے زرد جنگل میں
کسی کی جستجو ہے یا فریبِ آرزو، تصویر کے دو رُخ
اسی تصویر کو دل سے لگائے جل رہے ہیں ہم
مگر وہ مشعلیں جو بجھ چکی ہیں خامشی سے کیسے روشن ہوں

۲- خواب در خواب

یہ کیسے خواب ہیں ؟
جو دائرہ بننے سے پہلے ٹوٹ جاتے ہیں
سزا ہے میرے ہونے کی
نہ ہونے کے تصور میں ہو تم جیسے
یہاں سے آسماں تک ایک ہی زینہ
کسی آفت زدہ مفرور کو آواز دیتا ہے
کہ کس نے یہاں دل سے لگایا تھا
ابھی تک ایک مبہم نقش کا کوئی معمہ مرتسم ہے خاک پر جیسے
فصیلیں فاصلوں کی اور بھی کچھ اونچی ہوتی جاتی ہیں

"ابھی تک آئینے کے سامنے بیٹھی ہو تم
آرائشوں کے سرد جنگل سے نکل آؤ
تقاضوں کی عبارت سے کوئی حرفِ گلِ تازہ سجا لو اپنے بالوں میں
خیالوں کی کسی جنت میں اترو گی
تو میں جھک کر تمہارے ہاتھ چوموں گا"

نہیں تم وہ نہیں ہو، تم جسے میں نے
کسی طوفانِ یخ بستہ میں پلکوں پر سجایا تھا
نہیں تم وہ نہیں ہو، زخم جس کے گن رہا ہوں میں
مجھے جب فرصتِ لمحہ میسر تھی — مگر اب میں —
خلا کے آئینوں کا عکسِ مبہم ہوں
زمیں پاتال ہے میرے لئے، پاتال میں دشمن
مجھے جو لمحہ لمحہ ریزہ ریزہ کرتے رہتے ہیں۔

"قبیلے مقتلوں میں سر سجا کر رقص میں مصروف ہیں دیکھو
مگر میں خواب دیکھوں گا
ہزاروں بے زباں لمحے تمہاری یاد کا گھونگھٹ اٹھاتے ہیں
مجھے تم چاہتی ہو یا نہیں؛ معصوم ہے کس کو ؟
تمہیں میں نے خریدا تھا
مگر یہ بھی حقیقت ہے
تمہارے سامنے میں سر بہ زانو ہوں"
وہاں گہری خموشی تھی،
یہاں پانی نہیں ہے رات کا صحرا سسکتا ہے
لہو میں ڈوبتی آنکھیں بلاتی ہیں
ستارے ایک بے معنی عبارت کے اشارے ہیں
سلگتے چشم و لب سے پیاس کی لہریں الجھتی ہیں
کوئی ہمزاد پریوں کا یہاں تنہا تڑپتا ہے

یہ ضد کیسی ؟
یہاں کوئی نہیں ہے ، بال تو کھولو
یہ غم کیسا؟ یہ کس کی آرزوئیں سانس لیتی ہیں
وہ لمحہ لوٹ کر آیا نہ آئے گا
بدلتے روز و شب میں زندگی پھولوں کی بارش ہے
چلو ساغر اُٹھاؤ، جسم کا ہر زاویہ بدلو
چلو ہم رقص بن کر ہم سُریلی بانسری کی تان پر جھومیں

مگر یہ روشنی کی خواہشیں تاریکیوں کا باب اوّل ہے
ہمیشہ بند رہتا ہے کھُلے تو ہر طرف آسیب ہی آسیب ہنستے ہیں
ازل کا کوئی زنداں جس طرح آواز دیتا ہے
مشیت، دست بستہ قیدیوں کو موت کا پیغام دیتی ہے
یہاں بونے جلوسِ بے اماں میں نوچتے ہیں زندہ لاشوں کو

"تمہیں میں نے اسی بازار سے شاید خریدا تھا ؟
کنیزوں کا وہ تاجر گفتگو جس کی حکیمانہ تھی ـــــ
ـــــ لیکن وہ خیانت کا کوئی اندھا حوالہ یاد ہے مجھ کو
ادھر آؤ مجھے سرشار کر دو ـــــ
ـــــ میں تمہیں آزاد کر دوں گا
مرے سینے میں خنجر کی طرح اُترو
کہ میں ریگِ رواں بن کر بکھر جاؤں"

۳- عذابِ آخر

درندے حکمراں ہیں

سرزمینِ یاس پر، احساس پر ـــ
ـــ ہر آس پر گہرے گھُٹتے بادل مُسلّط ہیں
مقدر آئینہ خانوں میں بیٹھے کچھ شکاری
اور حواری ترکشوں پر ناز کرتے تیر برساتے ہوئے آئے
وہ ان کے قہقہوں پر قہقہے افلاک کی جیسے خبر لائیں
یہاں سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے
اور اگر ہے بھی تو بس یہ ہے
اُٹھو اس قاتلوں کے شہر میں ہم قاتلوں سے مل جائیں

مجھے معلوم ہے پیمانۂ امروز و فردا آزمائش ہے
تمہیں جنسِ فرومایہ سمجھتے ہیں،
تو میں روحوں کی اس پیکار میں تنہا مسافر ہوں
بہ ظاہر ایک صحرا کی طرح تم اصل میں کوئی سمندر ہو
تمہارے حسن کے ایوان کا میں طفلِ مکتب ہوں
تمہیں میں نے خریدا تھا ؟ نہیں !!
یہ سب غلط ہے، اب مجھے چاہے خریدو
یا مجھے نیلام کر دو تم
تمہارے فیصلے کا منتظر ہوں کاش تم میری طرف دیکھو
اسیری کے عذابِ جاں گسل سے تم نکل جاؤ
رہائی کے سرابِ مستقل میں مر رہا ہوں میں ۔

سیپ کراچی

بلراج کومل

خوشبو کے بعد

موسم گل کی خوشبو
ہوا میں اُتر آئی ہے
لڑکیوں نے
حسیں شوخ، ممنوع، ملبوس
اَب زیب تن کر لئے ہیں
بنایا تھا چڑیا نے
کچھ روز پہلے نیا گھونسلہ
گھر کے محفوظ گوشے میں
ننھی سی، پیاری سی، آواز کل سے
وہاں سے اُبھرنے لگی
کھیل رنگوں کے، کچھ روز میں
مل کے کھیلیں گے بچے

مرے سَر میں، خنجر کی مانند اُتری تھی
پھر درد کی موج کچھ دیر پہلے
معطر تھا، شیریں تھا وہ نام
مجھ کو رہا یاد برسوں
مگر آج کیا ہو گیا، جانے کیوں آج
وہ نام
میرے لبوں کے
قریب آتے آتے کہیں رہ گیا۔

نجات

ایک شعلہ، ایک خنجر
سُرخ لاوے کا فشار
جسم و جاں میں
اس طرح اُترا
کہ میں جلنے لگا۔

سُرخ تھا، یا سبز تھا
میرا دشمن،
دائرہ در دائرہ رقص فگن
یا پھر کالا سیہ
میں جشن میں
اس راز سے واقف نہ تھا
حشر سے گزرا تو بس
سَر تا پا میں صرف موجِ حشر تھا، موجِ فراز
سارے رنگوں کی حدوں سے بے نیاز
رنگ کیا پہچانتا۔
مجھ کو جلنا تھا، میں آخر جل گیا، میں جل کہ
دوسرے قالب میں شاید ڈھل گیا۔

راج کومل

شہر میں ایک تحریر

مَیں نے پتھر سے لکھا
اس نے شیشے پر پڑھا
درسِ عبرت خوب تھا
چند لمحوں کے لئے
طفلِ مکتب کی طرح
وہ پریشاں ہوگیا
اور پھر اس شخص نے
ٹھیک اسی انداز سے
جو مرا انداز تھا
ہاتھ میں پتھر لیا
اور سارے شہر میں
درسِ عبرت لکھ دیا۔

موت

بڑا خوش بخت ہوں میں
وہ جسے شرف نمو
آخر ملے گا
بیج وہ ننھا سا میں ہی ہوں

مَیں دھرتی میں
اُترتا ہوں
میں رسمِ پیرہن سے آشنا ہوں
یہی سرِ انجام لیکن
آج
رسمِ پیرہن سے بھی گزرتا ہوں
سلاسل سے بالآخر آج میں آزاد ہوتا ہوں
مبارک ساعت یاراں
نویدِ فصلِ نو لائی ہے
رنگوں کا، شگوفوں کا
نیا امکان لائی ہے۔

بلراج کومل

شناخت

شناخت اس کے نام سے تھی
جسم کی بہار سے
شناخت آفتاب سے تھی
زلفِ آبشار سے
شناخت پیرہن سے تھی
غزالِ نور بار سے
شناخت اس کے شبنمی
فشارِ آتشیں سے تھی
زمین دوز، آسماں صفت خمار سے

کھلی ہوئی تھی، دُور دُور تک
تبسّموں کی سُرخ دھوپ
تیز روشنی
تمام شفقتوں کی نرم چاندنی

ملائک و نجوم
آج سارے بے مُراد ہو گئے
شناختیں اُجڑ گئیں
سُلگتے بام و در کے درمیاں
شمار ہو رہے ہیں سوختہ بریدہ جسم
ریزہ ریزہ کچھ مکاں
وہ بے شناخت ہو گئی
وہ خواب تھی
وہ اک حسین نام تھی
وہ نام سے بچھڑ گئی۔

عبدالعزیز خالد

شاخِ نبات

(پرتوِ شعرِ فیض کاشانی)

(۱)

سکینتِ دل و جاں لا الٰہ الا اللہ — خلاصۂ دو جہاں لا الٰہ الا اللہ
پکارے عالمِ کل کی زبانِ حال و مقام — بہ آشکار و نہاں لا الٰہ الا اللہ
بگوشِ جاں یہی آواز دمبدم آئے — ز جزو جزو جہاں لا الٰہ الا اللہ
بہ شوقِ دوست کہیں متصل بہ بانگِ بلند — ہمہ زمین و زماں لا الٰہ الا اللہ
نہ محض مومنِ توحید ہی سے بلکہ سُن — ز سومناتِ مغاں لا الٰہ الا اللہ
دلال و غنجِ بتاں، غمزہ ہائے لالہ رخاں — کریں بہ رمز بیاں لا الٰہ الا اللہ
گزر ہو صحنِ چمن میں تو کنج کنج سے سُن — صدائے سروِ رواں لا الٰہ الا اللہ
نکلے پنبۂ غفلت تو کان سے تو سُنے — ز نطقِ خُرد و کلاں لا الٰہ الا اللہ
زباں ہی سے نہیں بلکہ جان و دل سے کہہ — بنالہ و بہ فغاں لا الٰہ الا اللہ
سرورِ اہلِ معاصی ہے نغمۂ دف و چنگ — سرورِ متقیاں لا الٰہ الا اللہ
ندائے ہاتفِ غیبی سُنوں سحرگاہاں — کہ ایُّہَا الثَّقلاں لا الٰہ الا اللہ
رہا مکالمہ صوفی سے جو، کہی کیا اس میں — صلائے پیرِ مغاں لا الٰہ الا اللہ
پکار نطق و زباں سے بھی فیض تاکہ ہو نشر — شہادتِ دل و جاں لا الٰہ الا اللہ

(۲)

پروردگارا! بندہ ہوں اَلْمُلْکُ لَکْ وَالْحَمْدُ لَکْ — احسان سے شرمندہ ہوں اَلْمُلْکُ لَکْ وَالْحَمْدُ لَکْ
بے مانگے مجھ کو جان دی پھر واپسی کی مانگ کی — دوں جان جبتک زندہ ہوں اَلْمُلْکُ لَکْ وَالْحَمْدُ لَکْ
میں تیرے لطف و قہر سے، آبِ حیات و زہر سے — پُر گریہ و پُر خندہ ہوں اَلْمُلْکُ لَکْ وَالْحَمْدُ لَکْ
جلتا ہوں تیرے عشق میں شمعِ فروزاں کی طرح — تیرے سبب تابندہ ہوں اَلْمُلْکُ لَکْ وَالْحَمْدُ لَکْ
دکھلایا اپنا راستہ خود بن کے میرا رہنما — جوئیندہ و یابندہ ہوں اَلْمُلْکُ لَکْ وَالْحَمْدُ لَکْ
شر پر نہ قادر خیر پر، بس میں نہ میرے نفع و ضر — مالک ہے تو میں بندہ ہوں اَلْمُلْکُ لَکْ وَالْحَمْدُ لَکْ

خودؔ سے فنائے بیکراں تجھ سے بقائے جاوداں
میں دائمی پایندہ ہوں اَلْمُلْكُ لَكَ وَالْحَمْدُ لَكْ

خود سے مری قیمت ہے کیا، ناچیز تجھ سے چیز ہے
بے قدر ہوں شرمندہ ہوں اَلْمُلْكُ لَكَ وَالْحَمْدُ لَكْ

(۳)

گو خودؔ میں ہے دلبری لیکن تو چیزے دیگری
جانے پری افسوں گری لیکن تو چیزے دیگری

سورج ہے گو گرمِ وفا گو چاند ہے موصوفِ ضیا
گو خودؔ ہے غرقِ حیا لیکن تو چیزے دیگری

گو سینکڑوں گُل پیرہن شکر لب و سیمیں ذقن
ہیں فتنۂ ہر مرد و زن لیکن تو چیزے دیگری

خورشید رُو دیکھے کئی، زنجیر مُو دیکھے کئی
پُر رنگ و بُو دیکھے کئی لیکن تو چیزے دیگری

کثرت دلاراؤں کی ہے تمثاد بالاؤں کی ہے
آئینہ سیماؤں کی ہے لیکن تو چیزے دیگری

ہیں دلبرِ دمساز بھی، افسوں گرِ غمّاز بھی
عشوہ دہ طنّاز بھی لیکن تو چیزے دیگری

کیا رُوئے گُلگوں کی کمی، کیا قدِّ موزوں کی کمی
کیا صُنعِ بےچوں کی کمی لیکن تو چیزے دیگری

موتی پروئیں اور بھی، کر کے جنہوں نے شاعری
صاحب دلوں سے داد لی لیکن تو چیزے دیگری

(۴)

اے رہنمائے گمشدگاں اِهْدِنَا الصِّرَاط
اے نورِ چشمِ راہرواں اِهْدِنَا الصِّرَاط

ہم دوزخِ ہوا و ہوس میں گرے ہوئے
گم کردگانِ راہِ جناں اِهْدِنَا الصِّرَاط

دُور و دراز راستہ، تاریک و تار رات
مرکب ضعیف، جادہ نہاں اِهْدِنَا الصِّرَاط

دامانِدگانِ راہ کی جاں پر بنی ہوئی
سُن کر صفیرِ راہزناں اِهْدِنَا الصِّرَاط

سُود و زیاں پہ ہم کو نہیں کچھ بھی اختیار
اے نقشبندِ سُود و زیاں اِهْدِنَا الصِّرَاط

گم گشتہ فیضؔ کس سے کرے عرضِ مدّعا
اے رہنمائے گمشدگاں اِهْدِنَا الصِّرَاط

(۵)

ہے قصدِ خرابات تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ
ہوں فارغِ آفات تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ

میں خرقہ و سجّادہ و تسبیح سے گزرا
کیا کشف و کرامات تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ

زندانِ عناصر سے رہا ہو کے میں پہنچا
تا بامِ سماوات تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ

پوشیدہ رہے خرقہ سالوس میں کب تک
بتخانۂ طاعات تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ

کہتا ہوں تجھے فیضؔ نہ گرمانے بُرا تو
کر ترکِ خرافات تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ

(۶)

ئیں آئینِ خدائی سے نہیں واقف نہیں واقف
ئیں وہ، وہ ئیں، دوتائی سے نہیں واقف نہیں واقف

ئیں اس زُہدِ ریائی سے نہیں واقف نہیں واقف
خودی و خودنمائی سے نہیں واقف نہیں واقف

گوارا ہے مجھے وہ بُت جو میرے ساتھ کرتا ہے   وفاؤ بے وفائی سے نہیں واقف نہیں واقف
گدائی حُسنِ خوباں کی میں کرتا ہوں زہے قسمت!   نعیمِ بادشاہی سے نہیں واقف نہیں واقف
ہیں مہر ماہ رُویاں سے دل وجاں روشن وتاباں   طریقِ روشنائی سے نہیں واقف نہیں واقف
میں گلزارِ رُخِ خوباں میں ہاں کرتا ہوں گلچینی   رسوم یار رسائی سے نہیں واقف نہیں واقف
نہیں میں خوشہ چیں، خرمن سے دامن اپنا بھرتا ہوں   میں دستورِ گدائی سے نہیں واقف نہیں واقف
ہے دُنیا خوب واقف نیک ہوں میں یا کہ بد ہوں میں   زبانِ خود ستائی سے نہیں واقف نہیں واقف
ہمیشہ قفس رہتا ہوں اسیرِ دامِ خوشش رُو یار   میں اُمیدِ رہائی سے نہیں واقف نہیں واقف

(۷)

تجھ کو صدا دوں اَنْتَ السَّمِیْعُ   بس تجھ سے مانگوں اَنْتَ الشَّفِیْعُ
ہمت بلند اور کوتاہ بازو   اَنْتَ الرَّفِیْعُ اَنْتَ الْمُنِیْعُ
جس سمت دیکھوں چہرہ ہے تیرا   پستی و بالا اَنْتَ الْوَسِیْعُ
ہر شے کو تو نے گھیرا ہُوا ہے   ہر شے پہ حاوی اَنْتَ الْجَمِیْعُ
تو میری دُنیا تُو میری عقبیٰ   یہ بھی ہے وہ بھی اَنْتَ الْبَدِیْعُ
محشر میں میری فردِ عمل سے   عفواً گزر جلد اَنْتَ السَّرِیْعُ
دے جام بھر کر دریائے حُب سے   سُن بات میری اَنْتَ السَّمِیْعُ

(۸)

اندیشۂ آب و علف میں عمر کر دی سب تلف   کچھ بھی کیا نہ ہر حال اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم
بے حد گنہ میں نے کیے نامے سیہ میں نے کیے   زیں جُرمہائے بیکراں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم
کچھ فکرِ آیندہ کروں تدبیر پایندہ کروں   ماضی تو یکسر ہے زیاں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم
مجھ کو نہیں معلوم کیوں کر یُں ہُوا رہنِ بلا   نکتہ ہے یہ مجھ سے نہاں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم
جاتی ہے جاں سوئے عُلا جاتا ہے تن سُوئے بلا   از امتزاجِ این و آں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم
حائل کبھی دنیا ہے رہ میں سدرۂ عُقبیٰ کبھی   کیا یہ جہاں کیا وہ جہاں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم
شرمندہ ہوتا ہوں میں ہر دم پھر بھی کرتا ہوں گناہ   یَا رَبِّ اَنْتَ الْمُسْتَعَانُ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم
دس بار یا سو بار جتنی بار بھی ہو کم ہے لا   ہر دم جہاں اندر جہاں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم

(۹)

مجھ سے کہا: کر ذکرِ ھُوْ سُبْحَانَہٗ سُبْحَانَہٗ   ہُوں کیسے اس کے رُوبرو ؟ سُبْحَانَہٗ سُبْحَانَہٗ
کیسے میں ذکر اس کا کروں؟ کیسے میں فکر اس کا کروں؟   کیسے میں شکر اس کا کروں ؟ سُبْحَانَہٗ سُبْحَانَہ

مَیں ذکر ہُوں ذاکر ہے وہ میں شکر ہوں شاکر ہے وہ
میں آنکھ ہُوں ناظر ہے وہ سُبحَانَہٗ سُبحَانَہٗ
ہے ذکر بھی مذکور بھی ہے شکر بھی مشکور بھی
ناظر بھی ہے منظور بھی سُبحَانَہٗ سُبحَانَہٗ
گاہے بُلانے وہ مجھے، گاہے ہنسانے وہ مجھے
چاہے بنائے جو مجھے سُبحَانَہٗ سُبحَانَہٗ

(۱۰)

ساقیِ کوئے بقا کی ہے صدا بِسمِ اللہ
جس کسی کو ہے سرِ جامِ فنا بِسمِ اللہ
رُوئے ساقی بہ صفا، صاف ہمارا سینہ
مے مصفا شُدہ اخوانِ صفا بِسمِ اللہ
ہے دوا دردِ غذا خونِ جگر، عشق طبیب
صادقانہ جو ہے جویائے شفا بِسمِ اللہ
ساغرِ درد بکف ساقیِ میخانۂ عشق
جو بھی ہے ملتمسِ جامِ بلا بِسمِ اللہ
اے کہ وہ جس کو ہے ارمانِ نمازِ اخلاص
عشق ہے جانبِ حق قبلہ نما بِسمِ اللہ
فیضِ بِسمِل کا نہ پوچھو کہ وہ تحریر کرے
ایسی تحریر سرِ لوح ہوا بِسمِ اللہ

(۱۱)

خجستہ بے فضائے مرغزارِ اُنس کے جویا!
تجھے کیا راس آئی تنگنائے وحشتِ دُنیا
ترا کیا حال ہے اے قطرہ دریا کی کشاکش میں؟
ہے جذبِ دوست میں کیا رنگ تیرا اے دلِ شیدا؟
نہ چشمِ مستِ ساقی ہے نہ وہ لعلِ لبِ رنگیں
ہے تیرا حال اے مخمور کیسا بے مے و مینا؟

(۱۲)

ہوا پژمردہ دل آلودگی سے
کیا میں نے نہ کچھ افسردگی سے
کبھی یہ لے گیا دل کو کبھی وہ
تلف کی عمر میں نے سادگی سے
نہیں ہے خواہشِ سامان و ایواں
پڑا ہے واسطہ آوارگی سے
کیا مُردوں کو زندہ، صُور پھُونکا
کہیں خوشتر ہے موت اس زندگی سے
سرود و شعر کے سانچے میں ڈھالا
لیا ہے کام کیا آشفتگی سے

(۱۳)

جسے نصیب ہو ذوقِ نعیمِ درویشی
کبھی نہ چھوڑے طریقِ قویمِ درویشی
بزرگوار خدایا! ہزار شکر ترا
مجھے ہے تختِ کیانی گلیمِ درویشی
ہُوا بہ ہمتِ ارواحِ پاکِ درویشاں
میں گامزن بہ رہِ مستقیمِ درویشی
ہزار شکر کہ پیوستہ فیض کے دل و جاں
رہیں معطرِ عطرِ نسیمِ درویشی

(۱۴)

اُٹھا ساقیا جامِ لبریز دے
ہمیں بادۂ عشرت انگیز دے
نہیں ہے مے صاف گر دستیاب
تو دے ساغرِ درد آمیز دے

ادیب سہیل

نادان لمحوں کی خوشبو

کئی لڑکیاں میرے بچپن کے رستے کی راہی تھیں
اور سال و سن میں بڑی تھیں،
مرے گھر کے کوٹھے پہ ہر روز آ کر
وہ گڑیوں کی شادی رچانے کے کھیلوں میں مصروف رہتی تھیں پہروں
کسی کی ہو گڑیا
دُلہن میرے گڈے کی بنتی تھی وہ،
اور سجاتی تھی خلوت،
کبھی گڈے، گڑیے کے اس کھیل میں کوئی لڑکی ترنگوں میں آتی
تو خود ہی وہ گڑیا کے ہمراہ، بنتی، سنورتی
بنا کر مجھے اپنا گڈا
وہ جلوت سے خلوت تلک کا ہر اک سوانگ بھرتی۔
یہ سب لڑکیاں آج بھی ہیں مرے پیش و پس
پر بہو، بیٹیوں والیاں ہیں،
کبھی جو اچانک اکٹھی کسی بزم میں مل گئی ہیں
تو اِن میں کوئی ہنس پڑی کھلکھلا کر
حمائل کئے میری گردن میں بازو
کوئی بیتے دن کے خیالوں میں پڑ کر کچھ ایسی لجا سی گئی ہے
بہو، بیٹیاں اِس لجاجت کی تہہ تک پہنچنے لگی، تو وہ لینے لگی ہیں۔
میں نادان لمحوں کی خوشبو میں لپٹی ہوئی یاد کے جھمگھٹوں میں کھڑا ہوں۔

ادیب سہیل

علم

علم اکہرا جس کا ہے
ٹھنٹھ پہ بیٹھا پرندہ ہے
علم دھنک ہے جس کے گیان کے امبر پر
اُس کے اندر سات سمندر بہتے ہیں

زینہ زینہ اُتر کے دیکھو

کنار دریا
یہ بیضوی سا جو سنگ پارہ پڑا ہوا ہے
کسی بھی اِک سیل کا نتیجہ نہیں ہے
اس کے
عقب میں دیکھو تو سیل کا سِلسِلہ لگا ہے
اِسے اِسی چاک نے گھڑا ہے.

نظر جو شہکار عہد موجود آ رہا ہے
یہ عہد موجود کا کرشمہ اگرچہ لگتا ہے
لیکن ایسا نہیں ہے اس کی بناوٹوں میں
سجاوٹوں میں
کئی زمانے گُندھے ہوئے ہیں
رگوں میں اِس کی قرن قرن کا لہو رواں ہے
تم اِس کی چھب پر نگاہ کرنے کا کرب جھیلو
عقب میں پھیلے کئی زمانوں میں،
زینہ زینہ اُتر کے دیکھو
کہ طائرانہ نظر کے ہاتھ اس سے کچھ نہ آئے گا
یہ سفر بے بصر رہے گا۔

شبنم رومانی

جہاں پناہ

دو دشمنوں کے درمیاں
اِک نیم جاں

اندر بڑا سا کھنکھجورا
رت جگوں میں،
خوں سے خالی رگوں میں،
پاؤں پھیلائے ہوئے

اندر دُکھن
باہر دُھواں
کچھ اجنبی قدموں کی چاپ
اور کچھ دبی سرگوشیاں
دُزدانہ دم سادھے ہُوئے
کچھ سنسناتی گولیاں

مخبر ہوائیں تاک میں
دم ناک میں

بیٹیاں جو دفنا دی گئی تھیں
اپنی قبروں سے نکل آئی ہیں پھر
خنجر چھپائے زہر کے
اپنے کفن کے چاک میں

تاجِ سریر و سلطنت
عنوان اس مضمون کے
اندر کبھی دشمن خون کا
باہر کبھی پیاسے خوں کے

دو دشمنوں کے درمیاں
اِک نیم جاں۔

سیپ کراچی

شبنم رومانی

خیریت نامہ

میں ایک لمبے سفر سے
زندہ، صحیح و سالم جو واپس آیا
تو کوئی پہچان ہی نہ پایا

ہر ایک یوں مجھ کو دیکھتا تھا
کہ جیسے میری جبیں پہ آنکھیں اُگ آئی ہوں
اور میرے شانوں سے چار بازو لٹک رہے ہوں
کہ جیسے سب شیشہ تاب آنکھوں میں
بال میرے کھٹک رہے ہوں

ہر ایک یوں مجھ کو دیکھتا تھا
کہ جیسے میرا وجود مشکوک ہو خدایا!
کہ جیسے میں ہوں
کسی کھنڈر کی اکیلی بیری کا کوئی سایہ
جو میری صورت پہن کے
اور میرا نام اپنا کے
اس خرابے میں آ گیا ہو

میں ایک لمبے سفر سے
زندہ، صحیح و سالم جو واپس آیا
تو کوئی پہچان ہی نہ پایا۔

دیوارِ گریہ کی جانب

اِس لمحے
جب ماتھے پر نیلی ناگن لہراتی ہے
حیرت کی شمعیں جلتی ہیں آنکھوں کے زندانوں میں
سینے کی اُڑتی مٹی نے
چہرے پر ناموزوں مصرعے لکھے ہیں
کون یہ دروازے پر دستک دیتا ہے؟

باہر سناٹا ہے
لیکن گھر کے اندر — ایسا شور ہے ایسا شور ہے
جیسے اب اِک پیلی آندھی
جلتی بجھتی آنکھوں کی یہ شمعیں لے کر
چہرے کی رنگت کی صورت اُڑ جائے گی
صحراؤں میں گھوم گھوم کر
دریاؤں کے ہونٹ چوم کر
دیوارِ گریہ کی جانب مُڑ جائے گی۔

شبنم رومانی

خیمہ بستی

گلی میں کچھ لوگ بھاری قدموں سے چل رہے ہیں
شکاری کتّوں کے بھونکنے سے
عجیب سا شور ہو رہا ہے
پڑوس کے چند بچّے ڈر کر
مرے "وِلا" کے برآمدے میں جو آ چھپے ہیں
تو گھر میں پتّھر بھی آ رہے ہیں!

پڑوس کے چند بچّے ڈر کر
مرے "وِلا" کے برآمدے میں جو آ چھپے ہیں
تو سوچتا ہُوں
میں اپنے دل میں انھیں بساؤں؟
کہ اپنے آنگن کی سبز بیلوں،
اور اپنی کیاری کے سُرخ پھولوں،
اور اپنے کمروں کے صاف شیشوں کو
بارشِ سنگ سے بچاؤں؟؟؟

شہر آشوب

نام
تشخّص کے لیے یُوں تو ضروری ہے
مگر نام کے معنی پہ اگر غور کیا جائے
تو خود اپنے تشخّص پہ ہنسی آتے

یہی نام
یہی بھیڑ میں ہر فرد کی پہچان
ہر انسان
اسی نام کی شہرت کے لئے
عالمِ تخلیق میں
تخلیق مکرّر کی مسرّت کے لئے
خود کو مثالِ مہ تقویم
کیا کرتا ہے تقسیم
کہ تفہیم کی صورت کوئی پیدا ہو
کہ ہونے کی ضرورت کوئی پیدا ہو
مگر اے مرے ہمزاد!
یہ شہرت،
یہ تشخّص
یہی پہچان،
مرے کرب کا سامان
مری حسرتِ تقصیر
مرے پاؤں کی زنجیر
مری راہ کا پتّھر بھی تو ہے!!

امجد اسلام امجد

وقت بھی کتنا ظالم ہے

اتنے برس کی دُوری اور مجبوری کے
افسونِ سفر میں لپٹا ہُوا
اک شخص اچانک آن ملا
میں اُس کو دیکھ کے ششدر تھا
وہ مجھ سے سوا حیران ملا،

{یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے!
اس ہجر میں کیا کیا روئے تھے ہم!
اس یاد میں کیسے کھوئے تھے ہم!}

کچھ دیر تو دونوں چپ سے رہے
پھر اُس نے کہا — "تم کیسے ہو؟"
پھر میں نے کہا — "بس اچھا ہوں"

پھر اُس نے کہا
"یہ اتنے دنوں کے بعد کا ملنا خوب رہا.....
.....کوئی پُرانا دوست ملے تو دل کو بھلا سا لگتا ہے!.....
.....یہ شہر تو بالکل بدل گیا.....
.....اب چلتی ہوں"

پھر میں نے کہا
"میں شام سے ہر روز یہاں پر آتا ہُوں.....
.....جب وقت ملے تم آجانا.....
.....اس وقت مجھے بھی جلدی ہے.....اب چلتا ہوں"
یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے!!

صدائے آشنا

تری آہٹ،
شگفتی دوپہر کو ایک پل میں شام کرتی ہے
سوادِ ہجر کو کچھ اس طرح گلفام کرتی ہے
صدائے آشنا جیسے،
گھنے، گہرے، اندھیرے جنگلوں کی بے یقینی میں
رُخِ منزل دکھاتی،
روشنی کا کام کرتی ہے!

اظہر قادری

اظہارِ ہنر

(۱)

جسم کو افکار کے ہم نے دیا
پیرہن الفاظ کا
معنی و مفہوم سے الفاظ کو
معتبر ہم نے کیا
لفظ سے کاڑھے اسالیبِ بیاں
حرف کو آہنگ تو ہم نے دیا
بولنا ہم نے سکھایا دہر کو
تھی زباں گونگی اسے کی ہم نے گویائی عطا
کان کو لطفِ بیاں سے آشنا ہم نے کیا
گلشنِ تخئیل کی شادابیاں
کارنامے ہیں ہمارے ذہن کے

(۲)

ہوتی ہے ہر عہد کی ہم سے شناخت
ہم کبھی غالب، کبھی اقبال ہیں
ہم کبھی حالی، کبھی آزاد ہیں
ہم کبھی انشا، کبھی ہیں مصحفی
آتش و ناسخ، امیر و داغ ہیں
وحشت و حسرت، جگر ہیں، جوش ہیں
ہم ولی ہیں، شاعرِ دو گام ہیں
قاسمی ہیں، میر و درد و فیض ہیں
ہم نظیر و مومن و ناطق، حجاز و شاد ہیں
گوئٹے، فردوسی و حافظ ہیں ہم
ہم نظیری ہیں، کبھی خیام ہیں
ہم کبھی رومی، کبھی سعدی، کبھی ٹیگور
ہم کبھی وارث، بھٹائی ہیں، کبھی ہیں شیخ ایاز
ڈانٹے ہیں ہم کبھی بادلیئر
کٹس ہیں شیلی ہیں ہم ہیں والمیک
ہومر و ورجل ہیں کالی داس ہیں

(۳)

ہم نے گائے نغمہ ہائے حُسن و عشق
لیلیٰ مجنوں، عذرا وامق، ہیر رانجھا کو ملی
داستانِ شوق میں ہم سے حیاتِ جاوداں،
ہم نے کاڑھا
سروقد کا استعارہ قامتِ محبوب سے
ہم نے دی تشبیہہ رفتارِ صبا کو باغ میں
مستی و کیفِ خرامِ یار سے
زُلف میں اُڑتی گھٹاؤں کو کیا ہم نے اسیر
بزم میں سرکایا ہم نے
دخترِ انگور کے رُخ سے نقاب
ہم تصوّف کے مسائل سے بھی اُلجھے بارہا
حمد لکھی
نعت لکھی
عظمتِ انساں کی ہم نے داستاں تصنیف کی
اہلِ دُنیا کو دیا ہم نے پیامِ انقلاب
جلوۂ حسنِ زمیں کا ہم نے چھیڑا تذکرہ
ہم نے لکھا قصۂ کوہ ودمن
ذکر ہم سے لالہ وگل کا چلا
ہم سے نکلی رسمِ توصیفِ بہار
ہم نے صحرا کو عطا کی وسعتِ دیوانگی
ہم نے ذرّوں کو بنایا ہمسفرِ مہر و ماہ

(۴)

پیچ و خم ہم نے سنوارے گیسوئے تہذیب کے
ہم نے جھلکایا رُخِ زیبائے فن
شیشۂ ایام میں،
ہم نے چمکایا زمیں پر آفتابِ آگہی
ہم نے ایوانِ تمدّن میں بکھیری روشنی
محترم تاریخ کو ہم نے کیا
کیا صلہ اس کا مگر ہم کو ملا
یہ سوال اہلِ جہاں سے وقت نے پوچھا تھا کل
یہ سوال اب بھی کھڑا ہے وقت کی دہلیز پر

(۵)

فیضِ غالب سے نہیں ہم کو ستائش کی ہوس
اور نہ پروائے صلہ
آرزو جاگیر کی ہے اور نہ خلعت چاہیئے
ہم کو اظہارِ ہنر کی بس اجازت چاہیئے ۔۔

رحمان فراز

اَب شام ڈھلے.....

اَب شام ڈھلے، چپکے چپکے
اس دل سے باتیں ہوتی تھیں
بے برانہ سری تنہائی کی
کچھ باتیں تشنگیٔ جاں کی
اپنی ہی نفی کی کچھ باتیں
یا اپنی ہی جویائی کی
باتیں دل کے سونے بَن کی
آنکھوں میں اُمڈتے اشکوں کی
باتیں غم کی گہرائی کی

اَب باطن کے سنّاٹوں میں
کچھ حرفِ تبسم سے خالی
جو حرفِ تسلّی بن نہ سکے
در آتے ہیں نکہت کی طرح
کچھ خواب کسی کی چاہت کے

یہ سنولایا، دُھندلایا بدن
یہ سنّاٹے، یہ قریۂ جاں
آنکھوں میں سحر کی بجھتی کرن
یہ شام کی بڑھتی تیرگیاں
سب آئینے بے نُور ہوئے
جو خواب تھے، چکنا چُور ہوئے

جس راہ کو تکتی تھیں آنکھیں
اُس رہ سے کوئی گزرا ہی نہیں
جس گھر میں جلائی تھیں شمعیں
اُس گھر میں کوئی ٹھہرا ہی نہیں
وہ شمعیں اَب کافور ہوئیں
وہ آنکھیں اَب بے نور ہوئیں

اَب شام ڈھلے، چُپکے چُپکے

مختار کریمی

زندگی

ناگ پھنی کا ایک اِک پتا ناگ کا پھن ہے
جن کے زہر بھرے کانٹے
نوکِ زباں سے لمس کی لذّت سمجھاتے ہیں
لیکن ایسے ہاتھ جو آنکھیں بھی رکھتے ہیں
اس کی قربت سے ڈرتے ہیں
ایک ہی زردی مائل، سبز لبادہ اوڑھے
ناگ پھنی میں کتنے ناگ چھپے بیٹھے ہیں
جن کے پھن میں زہر بھی ہے تریاق بھی ہے
کانٹوں کی محدود فضا میں دُکھ سکھ کا آفاق بھی ہے
لیکن دشت کی ریت بھری بے رنگ فضا میں
کم آنکھوں نے دیکھا ہوگا
زہر بھرے کانٹوں کے اوپر
صبح کے ٹھنڈے لمحوں میں
کبھی کبھی دو چار گھڑی کو
پھول بھی کھلتے رہتے ہیں
جن کی زردی، غیرتِ قوسِ قزح ہوتی ہے
جن کی نرمی، رشکِ گُل و ریحاں ہوتی ہے
لیکن چشمِ حقیقت بیں ہی ذوقِ سماعت حاصل کرکے
سُن سکتی ہے
صبح کے گزراں لمحوں میں زرد زبانیں کیا کہتی ہیں۔

میرا گھر

حدِ نظر تک برف جمی ہے
سارے پتھر اپنی اپنی آگ دبائے یخ بستہ ہیں
زندہ پودے خواہشِ نشو و نما کی ٹھنڈی قبروں میں
خوابیدہ ہیں
تند و تیز ہوائیں
خاموشی سے دست و گریباں
چیخ رہی ہیں
برف کی موٹی تہہ کے نیچے ایک سمندر چھپا ہوا ہے
اُوپر کچھ خوں خوار بھیڑیے
بھوکے پیاسے، نیند کے ماتے، آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہیں
لیکن کوئی گرگِ گرسنہ جب بھی تھک کر گر جاتا ہے
باقی اس کو کھا لیتے ہیں
دُور کہیں سورج کی کرنیں دُھند میں پنہاں سارا منظر دیکھ رہی ہیں
ایک سا منظر کب رہتا ہے!
سورج کا کرنیں پھیلانا، دُھند کا چھٹنا، برف پگھلنا
اِک قانونِ فطرت ہے
دُھند چھٹے تو منظر بدلے، میں بھی دیکھوں
یہ قطبین کا کوئی تختۂ مرگ صفت ہے
یا وہ گھر ہے جس کے اندر
میں جینے کی خواہش میں اب تک زندہ ہوں۔

جلیل عالی

آسرا

ترستا ہے دلِ شاعر
کہیں کوئی سنکی ساعت
یہی دو چار
خوشں تعبیر حرفوں کا
کرم کر دے
تو کچھ دن
زندگی کرنے کا
پھر سے آسرا ہو جائے

تعلّق!

بے مصرف مصروف دنوں کی
یکسانی کے خالی پن میں
خود کو بھی بھولا رہتا ہوں

کوئی خوشی جب رنگ جمائے
یا ہوں گہرے غم کے سائے
یاد بہت آنے لگتے ہو

مشکل

کسی سے کیا کہیں دل کی
یہاں تو ہر کوئی
اپنی سُنانے بیٹھ جاتا ہے

محمد افسر ساجد

آئینہ

درد کے جھلملاتے آئینوں میں
تمام چہرے دھندلے نظر آتے ہیں
(اپنا ہی!)
دھوپ انہیں جھلساتی ہے
چاندنی آبدار کرتی ہے
لیکن وقت ______
تھا، ہے اور ہوگا!!
اس کے سامنے
احتیاط نظر، بیگانگی اور اپنائیت
سب ہیچ ہیں ___!!

جمیل عظیم آبادی

جو پیڑ صدیوں کا تھا پرانا

○

جو پیڑ صدیوں کا تھا پرانا
بہار رُت میں ہرا بھرا تھا
طیور اُس پر چہک رہے تھے
ہوا میں اُڑ کر بہک رہے تھے
تھی رات تاروں سے جگمگائی
کہ جیسے دُلہن سجی سجائی
سکون پرور فضا تھی چھائی
اُسی میں دو دل ملے تھے باہم
ملا تھا کوئی گلے کسی سے
ہوا تھا عہدِ وفا کسی سے
گواہ تھا وہ طویل قامت
جو پیڑ صدیوں کا تھا پرانا

○

ہوئی جو صبحِ وصال آخر
طلسمِ خواب و خیال ٹوٹا
حصارِ اُلفت تھا پارہ پارہ
کوئی کہیں تھا، کوئی کہیں تھا
فضا وہ ساری بدل چکی تھی
نہ رات تاروں سے جگمگائی
ملا نہ کوئی گلے کسی سے
رہا نہ کوئی گواہ باقی

○

جو پیڑ صدیوں کا تھا پرانا
وہ بادِ صرصر سے جل چکا تھا

جمیل عظیم آبادی

وعدہ

وہ وعدہ آپ کا
وعدہ
نہ اب تک ہو سکا پورا
زمیں بدلی، زماں بدلا
مگر وہ وعدۂ فردا
ابھی تک اک معمّہ ہے
اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ
رنگ خسروی بدلا
جہانِ خود فراموشی،
کے بادل چھٹ گئے سارے
شفق پھولی، کرن پھوٹی، دھنک ابھری
مگر سورج جو نکلا صبح دم تو،
خود اپنی تیرہ بختی پر،
پشیماں اور
گھبرایا ہوا،
مگر وہ وعدۂ فردا
ابھی تک اک معمّہ ہے
خبر ہو آپ کو شاید کہ،
ظلمت کے شکنجے میں
صداقت،
صبح کی دہلیز پر
گھٹ گھٹ کے،
مرتی ہے، سحر خواب پریشاں ہے
وہ وعدہ آپ کا
وعدہ
نہ جانے کب،
حدیثِ دل بنے گا، اور
میزانِ صداقت میں،
تُلے گا رُوبرو سب کے۔

رحمان نامور

نئے موسم کی سوغات

مجھے محسوس کرنے دو
کہ تم نزدیک ہو میرے
قبا پھولوں کی نازک پتیوں سے
بُن کے بنی ہے
تمہاری اوڑھنی بے نام سے رنگوں میں ڈوبی ہے
یہ میرے سامنے سے آتی جاتی لڑکیاں
"ساری"
تمہارا آئینہ ہیں
سطح پر جس کی
تمہارے خال وخد ایسے نمایاں ہیں
تمہارا عکس ہوں جیسے
یہ سب چہرے
تمہارے تو نہیں ہیں
پھر بھی مجھ کو ایسا لگتا ہے
کہ جیسے اب کے موسم میں
گلابوں پر کسی نے
ایک ہی سے رنگ چھڑکے ہوں

پوروں میں آنکھیں

کسی دن تم اندھیرے میں
مرے لکھے ہوئے الفاظ پڑھنا
کہ میری انگلیوں کی نرم پوریں
اپنی آنکھوں سے
وہ سارے حرف لکھتی ہیں
کہ جن میں چاند سورج اور ستاروں کی
روپہلی اور سنہری
نرم کرنوں کی
خنک سی روشنی گوندھی گئی ہو
اور وہ سارے روشنی دیتے ہوئے الفاظ
تم کاغذ پہ یوں بکھرے ہوئے پاؤ گے
جس طرح
اندھیری شب میں ساون کی
فضائیں اڑنے والے جگنوؤں کی روشنی
بینائی کو انعام دیتی ہے
اک ایسی خود شناسی کا
کہ جس سے
روزِ روشن میں بھی
اکثر دیدہ ور محروم رہتے ہیں
سو اک دن تم مرے الفاظ
تاریکی میں پڑھنا
تو، تمہیں محسوس یہ ہوگا
کہ ساون کی اندھیری رات میں
ہر سمت جگنو سے
فضا میں رقص فرما ہیں۔

سلیم کوثر

محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے

محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے جس میں تم لکھو
کہ کل کس رنگ کے کپڑے پہننے کونسی خوشبو لگانی ہے
کسے کیا بات کہنی، کونسی کس سے چھپانی ہے
کہاں کس پیڑ کے سائے تلے ملنا ہے، مل کر پوچھنا ہے
"کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے"
یہ فرسودہ سا جملہ ہے، مگر پھر بھی یہی جملہ
دریچوں، آنگنوں، سڑکوں، گلی کوچوں میں، چوباروں میں
چوباروں کی ٹوٹی سیڑھیوں میں
ہر جگہ کوئی کسی سے کہہ رہا ہے
"کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے"
محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے جس میں تم لکھو
تمہیں کس وقت، کس سے، کس جگہ ملنا ہے، کس کو چھوڑ جانا ہے
کہاں پر کس طرح کی گفتگو کرنی ہے یا خاموش رہنا ہے
کسی کے ساتھ کتنی دُور تک جانا ہے یا پھر لوٹ آنا ہے
کہاں پلکیں جھکانا ہے، کہاں آنکھیں ملانا ہے

یا یہ لکھو،
کہ اب کی بار جب وہ ملنے آئے گا
تو اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر
دھنک چہرے پہ روشن، جگمگاتی، اس کی آنکھوں میں اُتر جائیں گے
اور پھر گلشن و صحرا کے بیچوں بیچ دل کی سلطنت میں
خاک اُڑائیں گے

بہت ممکن ہے وہ عجلت میں آئے
اور تم اُس کا ہاتھ، ہاتھوں میں نہ لے پاؤ
نہ آنکھوں ہی میں جھانکو اور نہ دل کی سلطنت کو فتح کر پاؤ
جہاں پر گفتگو کرنی ہے تم خاموش ہو جاؤ
جہاں خاموش رہنا ہے وہاں تم بولتے جاؤ

نئے کپڑے پہن کے گھر سے نکلو میلے ہو جاؤ
کوئی خوشبو لگانے کا ارادہ ہو
تو شیشی ہاتھ سے گر جائے

تم ویران ہو جاؤ
سفر کرنے سے پہلے بے سروسامان ہو جاؤ
محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے

آب جو ہے
جو دلوں کے درمیاں بہتی ہے

خوشبو ہے
کبھی پلکوں پہ لہرائے تو آنکھیں ہنسنے لگتی ہیں
جو آنکھوں میں اُتر جائے
تو منظر اور پس منظر میں شمعیں جلنے لگتی ہیں
کسی بھی رنگ کو چھو لے
وہی دل کو گوارا ہے
کسی مٹی میں گھل جائے
وہی مٹی ستارا ہے۔

فاطمہ حسن

مجھے ڈر لگتا ہے

لوگوں نے خواب دیکھنے شروع کر دیے ہیں
اور مجھے ڈر لگتا ہے
کہ اب یہ تعبیر پوچھیں گے
اور پھر تعبیر ڈھونڈیں گے
جب یہ تعبیر پوچھیں گے تو ان کے
ہونٹ سی دیے جائیں گے
اور جب یہ تعبیر ڈھونڈیں گے
تو ان کی آنکھوں پہ پٹی باندھ دی جائے گی
سوئے ہوئے لوگ اچھے ہوتے ہیں
کہ وہ کچھ بھی نہیں پوچھتے
نہ علماء کے بے معنی الفاظ
نہ حکمرانوں کی معنی خیز حرکات
ن کے کان بے خبر اور ہونٹ بے ضرر ہوتے ہیں
جبھی تو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو
سلا دیا جاتا ہے کہ
سی میں جاگنے والوں کی بھلائی ہے۔

ایک سوال

خواب کے نام پر
تم کیا دیکھنا چاہتے ہو
میرے منتشر وجود کو سمٹا ہوا
یا شاخ کی طرح تم پر
جھکا ہوا
میرا سایا۔

المنظر کی ایک شام

شام کے جھٹ پٹے میں
پرندوں کی پرواز
کی سمت دکھلاتے ہوئے
تم نے جس پیڑ کو
ان کا مسکن کہا تھا
مجھے وہ پیڑ
اور تم
ایک جیسے لگے تھے

مصروفیت

تم اپنا کوئی خواب مجھے سناؤ
پھر اس کی تعبیر
سوچنے دو

تسلیم الٰہی زلفی

خموشی بیاں تک پہنچی

جسم تک آئی
جان تک پہنچی
یہ زمیں آسماں تک پہنچی
سب در و بام نعرہ زن ہیں آج
ہر گلی، کوچہ و دیار میں شور
بول اُٹھے تمام مُہر بہ لب
پاؤں کی بیڑیاں چھنک اُٹھیں
آج ہر درد جاگ اُٹھا ہے
آج ہر چوٹ ہو گئی تازہ
زخم در زخم ہے خطاب و کلام
لو! خموشی بیاں تک پہنچی۔

ایک رات کا مہماں

آج کی رات غنیمت ہے
نہیں کل کا پتا
میں کہاں جاؤں
کہاں میرا سفینہ ٹھہرے
کس جزیرے پہ کہاں میرا بسیرا ہو جائے
آج کی رات غنیمت ہے
کہ میں بپھرے ہُوئے اور
سفّاک سمندر کے تھپیڑوں سے الگ
آپ کے پاس مہکتے ہوئے اس کمرے میں
چند گھڑیوں کے لئے
ملنے چلا آیا ہوں
میری یخبستگیٔ جاں بھی ہو شعلہ شعلہ
دستِ سیمیں جو سر بندِ قبا ہو جائے۔

ثروت سلطانہ

راستے سفر میں ہیں

چاند
میری ہتھیلی پر
آ کر ٹک گیا
ستارے میری انگلیوں کی پوروں پر
میں ان کی گنتی کرتی ہوں
مگر گن نہیں پاتی
کہ نہ خواہشوں کا شمار ہے نہ زخموں کا!
میں اپنے آنچل کے پلو میں
خواہشیں باندھ لیتی ہوں
اور اک پٹی پھاڑ کر
اپنے زخموں کو
ڈھانپ لیتی ہوں
میری آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں
دل آس کے پنکھ پہن کر اڑتا ہے
کوئی راستہ ساجن تک نہیں جاتا
کہ راستے خود سفر میں ہیں ......

سُراغ کا ایک لمحہ ....

نیند شاخ پر اُگا پھول
مُسافتوں کے کانٹوں نے قہقہہ لگایا
تتلیاں سوکھی گھاس پر بسیرا کرنے لگیں
سینے صلیب کی آنکھ پر
سچائی صرف زمین ہے
آنکھیں دُھواں بن کر پھیل گئیں
خوشی جُھوٹ کے پہیے پہن کر
دوڑتی پھر رہی ہے
جنگل راستوں سے رُوٹھ کر
دُور کھڑے ہیں۔

ثروت سُلطانہ

آج

عورت، ڈگڈگی اور مداری
رقص کی کتنی قسمیں ؟ ؟
گھر کے اندر، گھر کے باہر
طاقت کے سُر پہ
تشدّد کی لے پہ
ناچتی ہانپتی کانپتی عورت
یہی چہرہ ورثے میں باقی ہے .....
آج اس کی آنکھوں میں جاگتا ہے
گھر کے اندر، گھر کے باہر
مداری کے ہاتھ سے ڈگڈگی چھین کر
دُور پھینک دے گی
اور اپنی ہی رسّی سے
مداری کو کس دے گی
رقص جاری رہے گا
موسیقی وہ خود ترتیب دے گی
آزادی کی سانسوں سے
زندگی کے ساز پہ!

کڑوا گھونٹ

سُنو
وہ باتیں
ازبر تو ہیں
لیکن
کھوکھلے لفظوں کے لباس میں
اور پیوند نہ لگاؤ
ٹانکے ٹوٹ جائیں گے
جاؤ
کہیں سے
یقین ڈھونڈ لاؤ
ورنہ تمہارے ہاتھ میں جھنجھنا رہ جائے گا
جس کا گھنگھرو بجتا نہ ہو!!!

...طفُ المنّان

عشق پیچاں

...ستونوں سے لپٹتی پھیلتی بیلیں
...ہی کو چھو کر دیکھتی ہیں سب نگار و نقش
...اں پہ بھی ہر سوداں کی محنت سے
...تہ تاج نے اُس دور کے صاحب دروں کی
...تسکین کی خاطر بنائے تھے

وہ سارے نقش جن میں آج بھی صدیاں گزرنے پر
...ایاں ہیں کسی کے درد کے رشتے
کہیں ناکامیاں دل کی
کہیں پر اس کے سائے میں سہارا ڈھونڈتے
دو ملنے والوں کی ادھوری، مختصر سی، ان کہی باتیں
نشاں کچھ سوکھی بیلوں کے
کہیں مُرجھائی سی پتّی، کہیں گل ریزہ ریزہ سے

یہاں بیل بھی اُن صورتوں کا آئینہ بن کر
سوالی ہے
کہ میں خوابوں کے زینے سے اُتر آؤں کہ رُک جاؤں
ستونوں کی بلندی چھو کے یہ پوچھے اشاروں سے

تمہیں میرے لئے جس نے
بہت سے بیتتے سالوں میں بنایا تھا
اسے معلوم ہی کب تھا
کہ ایسا ایک دن آنے کو ہے جس میں
مرے پاؤں کی مہندی
اور مرے ماتھے کا جھومر
سب تمہارے چرن میں رکھ کر الگ ہٹ جاؤں گی
لیکن یہ دو آنکھیں
اک ایسے اجنبی کو دان کر دوں گی
جو مدت سے کہیں آکاش پر بیٹھا
مجھے اس طرح تکتا ہے کہ سوتا بھی نہیں اک پل کو
ہر دم مسکراتا ہے
مجھے پانے کی حسرت میں نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے
ستونوں کی بلندی سے پرے میں جا نہیں سکتی۔

ماہ طلعت زاہدی

سرِ ساحلِ یاد

ایک خواہش
کہ کبھی دھیان میں جاگی بھی نہ تھی
آج نیزے کی انی بن گئی
دل خوں ہوا
سینت کر اپنے خیالوں کو رکھا تھا میں نے
ڈوب گیا کیوں تن، من
کیسا طوفان اُٹھا

میں سرِ ساحلِ یاد
غرقِ فراق
اُس کی محبت کو سمندر دیکھوں
جس کی لہروں پہ زمانوں نے لکھی
حسن اور پریم کی کتھا
وصل مقدر جس کا۔
خواب تھا، خواب رہا
میری لگن، پیار اُس کا.......

میں کڑے کوس کی اس منزل پر
جسم سے جان کی دوری ناپوں
اور سوچوں
وہ مری چاہ سے مہکا ہُوا پھول
میں ہوا بن کے جسے انگ لگا سکتی نہیں
کاش میں اُس کو بھلا ہی سکتی
جس کہانی میں ملن کا کوئی عنوان نہ تھا
اُس میں اسے کاش کوئی ترک کا امکان ہوتا

رب نواز مائل

کہانیاں

ادھر صرف لفظوں کے بل پر
کہانیاں نہیں ہوتیں
لفظ کہ تیرے حسیں سے ہوں
یا میرے وفا جُو سے —
داستانیں کچھ اور ہی شے ہیں
تمہیں اپنا پتہ، پھر سے ملے
(ہر شرف و عزت، کھونے کے بعد بھی)
ناممکن کیوں ہو
زندگی روتے روتے
کبھی شہروں، گلیوں: میں اچانک ہنس دے
تحیّر فزا حقیقت کیوں ٹھہرے
لیکن کہانیاں، صرف لفظوں کے بل پر
ذرا بھی کہی جائیں
کون سوچے
کوئی نہ کوئی امرِ قوی
ازقسمِ غم
سوچتے ہوئے دِن، سوچتی ہوئی راتیں
سارے چُپ رہ کر بھی
تواتر سے محوِ تکلّم
(یہ اُس کا چہرہ یہ میرا چہرہ)
جب تک نہ ہوں
کہانیاں کون سُنے —

حاصلِ صدعمر

لفظ میری تصویر ہُوئے کب
ہر دِن سوچوں
جُملے ایسے ہی سب لکھوں

جیسے اِس بارے میں ہوں شب
کیا دِکھلاؤں
پھُول سحر کے کیسے کھلاؤں

شعر یہ لفظوں میں کچھ اپنے
ہلکی سی تصویر لیے
عمروں عمروں، جیسے اِتنا
اِتنا ہی کاغذ پہ اُتارا۔

محمد فیروز شاہ

بیروت میں کربلا کی بازگشت

ہوائے شہر ستم رسیدہ!
اُداس مت ہو
تری فضاؤں میں وفا کے غنچے چٹک رہے ہیں
تری شبوں میں دلیر جذبے دمک رہے ہیں
ترے دنوں میں لہو کے سورج چمک رہے ہیں

ترے دھوئیں سے اَٹے بدن پر
شہید لمحوں کی سُرخ چادر
یہ سُرخروئی کی اِک علامت ہے سربلندی کی اک ادا ہے

یہ کربلا کا عظیم ورثہ
جو ہر زمانے کے حق پسندوں کو نصرتوں کی
بشارتوں کی سعادتیں بانٹتا رہا ہے!

سعید لمحوں کا یہ ہراول
مرے زمانے میں آ کے تیرے
مُقدّروں میں لکھا گیا ہے
فضائے شہرِ ستم رسیدہ
اُداس مت ہو ـــ!!!

ڈرو اُس وقت سے ......

بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے بہہ گیا ہے
مگر وہ باقی جو رہ گیا ہے
جو دیکھ سکتے ہو اُس میں دیکھو
کہ اُن گنت جگمگاتے موتی
زمیں کی گود میں پڑے ہیں

یہ غوطہ خوری کی مشقیں کس دن تمہارے کام آئیں گی بتاؤ
لگا سکو تو عمیق غوطے لگا کے آؤ
مگر تمہارے یہ ہاتھ خالی کے خالی آئے ـــ تو یاد رکھنا
یہ پانی باقی جو رہ گیا ہے ـــ نہیں رہے گا!

تو ایک دن پھر تمہاری آنکھوں کے سامنے
دُور تک منتشر وسعتوں کا ایک صحرا
تمام ویرانیاں سمیٹے پڑا ہوا ہوگا اور پھر تم
گئے زمانوں کا نوحہ کرتی نگاہوں سے سیپیاں چنو گے
یہ سیپیاں بھی تمہاری مانند کھوکھلی ہوں گی ـــ جن کے اندر
نمو کے آثار تک نہ ہوں گے!!!

ثمینہ راجہ

ستارے ساتھ چلتے ہیں

بہت مدت سے تجھ سے دور ہوں
پریشاں ہے، میں نے
بچھڑ کر، زندگی سے
آشنائی کی
بظاہر میں اکیلی ہوں
اور اک تنہائی کی چادر میں لپٹی
شام کے زینے پہ چڑھتی ہوں
ہوائیں تیز ہوتی ہیں
میں تیری یاد کی انگلی پکڑ کر
جب بھی کالی رات کے
سینے پہ چلتی ہوں
ستارے ساتھ چلتے ہیں
بظاہر میں اکیلی ہوں
ستارے ساتھ چلتے ہیں۔

انتباہ

دائروں کے سفر پہ نکلے ہو
تم اک اندھے سفر پہ نکلے ہو
اور حدِ نظر تلک ہے خلا
ماورائے خلا بھی جو کچھ ہے
وہ بھی اک دائرے میں بنتا ہے
پھر ابد کو تلاش کرتے ہو
اپنی حد کو تلاش کرتے ہو
ہاں مگر کائنات کا یہ سفر
اک مدوّر سفر ہے ایسا نہ ہو
تم ابد کی تلاش میں اک دن
جا کے اپنے ازل کو چھو بیٹھو
اور ازل واپسی کا اذن نہ دے

شاہین بدر

حادثہ

چاند سا چہرہ کھلا تیرہ شبی کے دشت میں
اور ستاروں کی طرح
ہوگئیں یادوں کی کلیاں بے قرار
وقت کی سولی پہ ہے لٹکی ہوئی زندہ دلی
اپنے اندر ٹوٹتا جاتا ہوں میں
آئینہ خانے میں ماضی کے، کئی تصویریں ہیں
ایک میں ملتی ہے رشتے کی جھلک
دوسری میں ربطِ باہم کی مہک
ہے وہی موسم ـــــ وہی ارض و سما
ہوں مگر میں اجنبیت کا شکار
میز کے نیچے پڑا ہے اک کھلونا کانچ کا ٹوٹا ہوا۔!

زرد پتّوں کی بہار

سبز مدھم روشنی در آئی ہے
ذہن کے ویراں کھنڈر میں عہدِ رفتہ کے نقوش
پھر نظر آنے لگے
آرزوؤں کی تھیں جتنی تتلیاں ـــــ
سب اُڑ گئیں
اور حسرت بن گئیں
دشتِ غربت میں مگر یادوں کے پھول
میری تنہائی پہ خوشبو ریز ہیں
وقت کے گہرے سمندر کے قریب
زیست کے تاریک ریگستان میں
رقص کرتی، جھومتی گاتی ہوئی
آگئی ہے زرد پتّوں کی بہار۔!

سبب کراچی

گوہر سلطانہ عظمیٰ

آگ

اجنبی مسافر
اپنی اونٹنی کو ابھی
فصیل کے ادھر ہی رکھو
یہ رات
ظلمتوں کی راتوں میں ایک ہے
جس کی سحر کی قیمت
عشاق کا لہو ہے
یا
سروں کے مینار
اجنبی مسافر
یہ شعلے دیکھ رہے ہو
یہ جشن نہیں ہے
اس شہر کے ہر مکان میں
آج ایک ہی آگ لگی ہے

نظم

تمہیں میرے اندر
کتنے نغموں کا ترنم ملتا ہے
تمہیں میرے اندر
کتنے پھولوں کا رنگ ملتا ہے
تمہیں میرے اندر
کتنے جذبوں کا عکس ملتا ہے
تم میری گود سے
کتنے لمس کی گرمی پاتے ہو
اور اکثر تھک کر
میرے ہی بازوؤں میں سو جاتے ہو
مگر تم
کبھی نہ جان سکے ہو
تم کبھی نہ جان سکو گے
کہ تمہارے ان شہد آگیں لمحوں میں
میں اپنی ذات کے
کتنے کربلا سے گزرتی ہوں۔

ارشد جہلمی

شکنجے

عجیب لوگ ہیں
کہ جب سے میں نے
"یہ بڑے گوشت کی دکان نہیں"
کا سائن بورڈ لگایا ہے
میرے پاس چھوٹا گوشت لینے آجاتے ہیں

دوسری غلطی

کیا کہا ؟
گلدان ٹوٹ گیا ؟
چلو بھول جاؤ !
کوئی بات نہیں
تا یہ آواز کیسی ؟
بلی نے دودھ گرادیا ؟
تمہارے ہوتے ہوئے ؟
اور تم نے گلدان بھی توڑا ہے !

طفل تسلّی

ماں ! تم تو کہتی تھیں
"چھت پر کاگا بول رہا ہے
تیرے ابو شہر سے آئیں گے
میٹھی میٹھی چیزیں لائیں گے"
لیکن ماں !
اب دیکھ لو ماں !
ابّو تو نہیں آئے
اور کاگا میرے ہاتھ سے
روٹی کا ٹکڑا چھین کے بھاگ گیا ہے

مُسافر

چاند ڈوب گیا
تارے بُجھ گئے
اور اب آنکھیں ملتا ہُوا سورج
افق ماں کی چادر میں
کڑی دُھوپ کا توشہ باندھے
میرا شریکِ سفر بنا ہے
دیکھئے کب تک ساتھ دے

معترض سے

اگر میں پسِ دیوار ہوں
تو تم بھی
جو دیوار کے اُس پار ہو
پسِ دیوار ہو

نظم

اس حادثے کا ذکر
میرے کرم فرماؤں سے نہ کرنا
کہ وہ زخموں پہ مرہم رکھنے کے بجائے
سڑک پر چلنے کے اُصول بتائیں گے

گاہک

پھر ایک گاہک ایسا آیا
جس نے کھڑے کھڑے
میری ساری دکان خریدی
اور کہنے لگا
"بھائی صاحب!
کیا چاہیے؟"

مقصدِ حیات

تم نے کہا تھا نا!
کہ مجھے مر جانا چاہیے
دیکھ لو!
پچھلے بیس سال سے
تمہارے اس فیصلے کی
دھجیاں اُڑا رہا ہوں

نظم

باتیں کرو
کہ سرِ شام
دو آدمی
چُپ چاپ بیٹھے
اچھے نہیں لگتے

جذبۂ تعمیر سلامت

پوچھتے ہو!
"اس گھر کی کھڑکیاں، دروازے اور شہتیر
ہر چیز سوختہ کیوں ہے؟
کیا یہاں آگ لگی تھی؟"
نہیں بھائی نہیں!
ہم نے یہ مکان
جلے ہوئے گھروں کے ملبے سے بنایا ہے

نظم

اے وقت!
خوراک کی تلاش میں نکلے ہوئے پرندوں کے پاس
شام کا قاصد بھیج
کہ اپنے گرے ہوئے چھتنار کا نوحہ پڑھ جائیں

فرضِ منصبی

آگ بجھانے والی
اِک تیز رفتار گاڑی نے
بوڑھے والدین کی اُمیدوں کا چراغ
گُل کر دیا۔

مضامین



ڈاکٹر الیاس عشقی

اُردو رسالے کا ایک باب، سُر یمن کلیان

اُردو زبان میں کلاسیکی سندھی شعراء کے انداز اور روایت پر کلام مرتب کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ شعراء شاہ عنایت رضوی، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کے کلیات کو رسالو (رسالے) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ عام طور پر تیس سے چھتیس سُروں (ابواب) پر مشتمل ہے۔ شاہ بھٹائی کے مختلف خطی اور چھاپی رسالوں میں انتیس، تیس اور چونتیس سے لے کر چالیس سروں تک ہوتے ہیں لیکن اب ایک معیاری رسالے میں تیس سر رکھے جاتے ہیں۔ دوسرے شعراء کے رسالے اس سے کم یا اتنے ہی سروں پر محیط ہوتے ہیں۔

رسالے کا ہر "سُر" یا باب ایک یا چند داستانوں سے مرتب ہوتا ہے جس میں ابیات ہوتے ہیں اور ہر داستان کے آخر میں ایک یا ایک سے زیادہ وائیاں ہوتی ہیں۔ داستان میں کوئی قصہ بیان نہیں کیا جاتا بلکہ کسی داستان یا کسی اور موضوع پر ابیات جمع کئے جاتے ہیں۔ آخر میں وائی یا وائیاں بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ بیت اور وائی چوں کہ گائی جاتی ہیں اس لئے یہ بیک وقت شاعری اور موسیقی دونوں صنفوں میں شمار کی جاتی ہیں اور عوام اور خواص میں یکساں مقبول ہیں۔

"سُر" سرود کا مخفف ہے۔ اس کا تعلق موسیقی سے بھی ہے اور شاعری سے بھی۔ موسیقی میں اس کے معنی "راگ" کے ہیں۔ شاہ اور دوسرے سندھی شعراء کے رسالوں میں سُر کئی رشتوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ کچھ سُروں کے نام راگوں کے نام پر ہیں جیسے رام کلی، سری راگ۔ ہر چند کہ ان میں شامل شاعری کے موضوعات بھی ہیں، کچھ سُروں کے نام داستانوں پر ہیں جیسے لیلا چنیسر، عمر ماروئی۔ کچھ کا تعلق راگوں اور داستانوں دونوں سے ہے جیسے سوہنی جو راگ بھی ہے اور جس میں سوہنی کی داستان سے متعلق شاعری کی جاتی ہے یا کاموڈ (کامود) جس کا نام راگ پر ہے لیکن اس میں نوری جام تماچی کی داستان سے متعلق شاعری ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ایسے سُر بھی ہیں جن کا داستانوں اور راگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ جُدا جُدا موضوعات سے متعلق ہیں جیسے ڈہر، کارایل اور کاپاٹی وغیرہ۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے شاہ بھٹائی کے رسالے کے ہر سُر سے متعلق ایک راگ مخصوص تھا جس کا نام وہی تھا جو اس سُر کا ہے لیکن اب یہ صورت حال نہیں ہے۔ پھر بھی بہت سے سروں سے متعلق راگ مخصوص ہیں اور جن سروں کے لئے راگ نہیں ہیں وہ بھی کسی نہ کسی ایسے سندھی راگ میں گائے جاتے ہیں جو عام عارفانہ اور عاشقانہ شاعری کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ شاہ لطیف کے خطی اور چھاپی نسخوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں چھتیس سے اڑتیس سروں کے نام ملتے ہیں اور اتنے ہی سر بھی رسالوں میں پائے جاتے ہیں اس لئے یہ مشہور ہو گیا کہ شاہ کے رسالے میں جتنے سُر ہیں اتنے راگ بھی ہیں۔ البتہ شاہ کی درگاہ پر راگوں کا جو سلسلہ ہے اس سے اس طرف اشارے ملتے ہیں کہ

شاید شاہ کے رسالے کے ہر سُر کے لئے ایک راگ مخصوص ہو گا۔ شاہ کے دور میں ان سروں (یا راگوں) کے لئے جو درگاہ کی روایت ہیں رات کے اوقات میں عشا سے لے کر فجر تک وقت مقرر ہیں لیکن درگاہ کے باہر راگوں کے لئے کوئی وقت مخصوص نہیں ہے۔

ملک کے دوسرے علاقوں میں دو قسم کی موسیقی رائج ہے۔ ایک لوک موسیقی جسے عوامی موسیقی کہہ لیجئے اور دوسری کلاسیکی لیکن سندھ میں ان دو کے علاوہ ایک تیسری موسیقی بھی ہے جو یہی سروں کی موسیقی ہے اور جسے میں سندھ کی "روایتی موسیقی" سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ موسیقی عوام و خواص سب میں یکساں مقبول ہے۔ اس موسیقی کا کردار "موضوعاتی" ہے اور راگ یعنی سُر کا موضوع وہی ہے جو اس باب میں داخل داستان یا مضمون کا ہے اس لئے کہ صدیوں سے وہ کلام اسی مخصوص سُر میں گایا جا رہا ہے۔ وہ کلام اس مخصوص سُر (راگ) کے علاوہ کسی اور دھن میں نہیں گایا جا سکتا مثلاً سسی پنہوں کی داستان کا موضوع غفلت اور تلاش ہے۔ سسی رات کو سو گئی تھی تو اس کے دیور پنہوں کو لے کر چلے گئے اور پھر وہ اس کی تلاش میں بیابانوں اور کوہستانوں میں بھٹکتے ہوئی اپنی جان سے گئی۔ یہ داستان "کوہیاری" میں گاتے ہیں۔ اس سُر یا راگ کا موضوع یہی ہے۔ رانو کی داستان کا موضوع بدگمانی کی وجہ سے فراق اور اس کا عذاب ہے اور یہی راگ "رانو" کا موضوع ہے۔ نوری جام تماچی کا موضوع انکسار اور اپنی حقیقت اور اصلیت کو فراموش نہ کرنا ہے اس لئے کہ نوری ایک خوبصورت مچھیرن تھی جسے (بادشاہ) جام تماچی نے اپنی ملکہ بنا لیا تھا لیکن اُسے نہ اپنے رانی ہونے پر غرور تھا نہ اپنے حسن پر ناز۔ وہ خود کو ایک مچھیرن ہی سمجھتی رہی اور ہمیشہ انکسار سے پیش آتی تھی۔ یہی راگ کاموڈ (کاموڈ) کا موضوع ہے جس میں اس داستان سے متعلق کلام گایا جاتا ہے۔ اس طرح سندھی روایتی (سروں کی) موسیقی ایک کا موضوعاتی کردار ہے۔ موضوعاتی سروں یا راگوں میں مقررہ موضوع کے علاوہ دوسرا کلام نہیں گا سکتے ہیں۔ بعض سُر ایسے ہیں جن میں مختلف موضوعات کا کلام گاتے ہیں جیسے سندھی بھیروں، ماجھ اور پربھاتی وغیرہ۔

بات وائی اور بیت کی ہو رہی تھی۔ اس لئے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ یہ دونوں اصناف گائی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے بیک وقت موسیقی اور شاعری کی اصناف تو ہیں ہی، لیکن ان کی ہیئتیں بھی مخصوص ہیں۔ بیت جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے فارسی بیت سے ملتا جلتا ہے جہاں سے اس کا نام مستعار لیا گیا ہے۔ جس طرح سعدی کی گلستاں بوستاں، جامی کی بہارستان اور مثنوی رُومی کے ابیات میں دانش کے اقوال اور پند و نصائح یا فلسفیانہ نکات بیان ہوئے ہیں اور وہ ضرب المثل بن کر زبان زد خاص و عام ہیں اسی طرح سندھی ابیات میں بھی یہی خصوصیات ملتی ہیں۔ اور وہ بھی فارسی ابیات کی طرح تمثیلی انداز کی معنویت رکھتے ہیں۔

فارسی ابیات کے لئے وزن مقرر نہیں ہے۔ وہ کسی بھی وزن میں ہو سکتے ہیں لیکن سندھی بیت کے لئے وزن مخصوص ہے۔ ان کا وزن دوہے کا وزن ہے جو ہندی عروض پنگل میں داخل ہے۔ جس طرح رباعی کے چار مصرعے مخصوص وزن کے سوا نہیں کہے جا سکتے اسی طرح دوہے کے دو مصرعے بھی مخصوص وزن کے علاوہ کسی اور وزن میں نہیں کہے جا سکتے۔ دوہے کے ہر مصرعے میں چوبیس^۲۴ ماترے ہوتے ہیں۔ اور قافیہ مصرعوں کے آخر میں آتا ہے۔ ہر مصرع کے چوبیس ماترے تیرہ^۱۳ اور گیارہ^۱۱ ماتروں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ درمیان میں وقفہ ہوتا ہے جسے "بسرام" کہتے ہیں۔

"دوہا"

پہلا مصرع ـــــ ۱۳ ماترے ـــــ وقفہ ـــــ ۱۱ ماترے ـــــ قافیہ

دوسرا مصرع ـــــ ۱۳ ماترے ـــــ وقفہ ـــــ ۱۱ ماترے ـــــ قافیہ

ماتراؤں کا نظام وہی حرکت و سکون کا نظام ہے جس پر ہر قسم کی موزونیت کا دارومدار ہے۔ دوہے کو اُلٹ دیا جائے تو "سورٹھا" بن جاتا ہے۔ یعنی تیرہ^۱۳، گیارہ^۱۱ ماتراؤں کی تقسیم اُلٹ کر گیارہ^۱۱ تیرہ^۱۳ ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں "تُک" یعنی قافیہ جو مصرعوں کے آخر میں ہوتا

ہے درمیان میں آجاتا ہے۔

"سورٹھا"

پہلا مصرع : ـــ ۱۱ ماترے ـــ قافیہ ـــ ۱۳ ماترے ـــ

دوسرا مصرع : ـــ ۱۱ ماترے ـــ قافیہ ـــ ۱۳ ماترے ـــ

اسی طرح دوہے ، سورٹھے اور سورٹھے + دوہے کے میل سے دوہے کی دو قسمیں اور بن جاتی ہیں ایک "دوہا سورٹھا" ہے جس کا پہلا مصرع دوہے کے انداز پر ہوتا ہے یعنی قافیہ اس کے آخر میں آتا ہے اور دوسرے مصرع میں قافیہ سورٹھے کے انداز میں مصرع کے درمیان میں آتا ہے۔ اسے "بڑا دوہا" بھی کہتے ہیں۔

"بڑا دوہا"

پہلا مصرع :۔ ـــ ۱۳ ماترے ـــ وقفہ ـــ ۱۱ ماترے ـــ قافیہ

دوسرا مصرع: ـــ ۱۱ ماترے ـــ قافیہ ـــ ۱۳ ماترے ـــ

اس کے برخلاف اگر پہلا مصرع سورٹھے کی طرح اور دوسرا دوہے کے انداز پر ہو تو یہ "سورٹھا دوہا" ہوگا اور اسے "تونری دوہے" کا نام دیا گیا ہے۔

"تونری دوہا"

پہلا مصرع : ـــ ۱۱ ماترے ـــ قافیہ ـــ ۱۳ ماترے ـــ

دوسرا مصرع : ـــ ۱۳ ماترے ـــ وقفہ ـــ ۱۱ ماترے ـــ قافیہ

ان چاروں قسموں میں ماتراؤں کی تعداد ہر مصرع میں چوبیس ہی رہتی ہے۔ اور سوائے الٹے دوہے کے جسے "سورٹھے" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، باقی کو دوہا ہی کہا گیا ہے۔ یعنی ایک عام دوہا، دوسرا "بڑا دوہا"، تیسرا "تونری دوہا"۔ سندھی ابیات انہیں دوہوں اور سورٹھوں کے امتزاج سے تشکیل پاتے ہیں۔ سندھی دوہڑہ کا وزن بھی یہی ہے اور قافیے بھی اول بدل کر اسی ترکیب سے لائے جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ فارسی ابیات میں ایک سے لے کر حسب ضرورت جس قدر ابیات چاہیں کہے جا سکتے ہیں لیکن سندھی ابیات میں بیتوں اور اشعار کا نہیں مصرعوں کا شمار ہوتا ہے یعنی سندھی بیت دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ اور اس سے بھی زیادہ مصرعوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ یعنی سندھی ابیات میں فارسی ابیات کے برخلاف مصرعوں کی تعداد طاق بھی ہو سکتی ہے۔ ایک اور بات جو سندھی ابیات کی تکنیک میں اہم ہے وہ یہ کہ بیت کے پہلے مصرعے میں قافیہ مصرع کے آخر میں بھی آتا ہے اور درمیان میں بھی لایا جا سکتا ہے لیکن آخری مصرع میں قافیہ ہمیشہ سورٹھے کے انداز میں مصرع کے درمیان میں لایا جاتا ہے۔ شاہ بھٹائی کے رسالے میں سب سے طویل بیت گیارہ مصرعوں کا ہے لیکن عوامی شاعر ساون فقیر نے جو طویل ترین بیت کہا ہے اس میں پچپن مصرعے ہیں مگر کلاسیکی شعراء نے اتنے طویل ابیات نہیں کہے ہیں۔ بیت کا وزن عروض کے اعتبار سے یہ بنتا ہے:۔

فعلن فعلن فاعلن ، فعلن فعلن فاع یا فع

جس طرح رباعی کا وزن مخصوص ہے، ہر وزن کے چار مصرعوں کو جن کے آخر میں قافیہ لایا جائے رباعی نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح دوہے کے مخصوص وزن کے علاوہ کسی اور وزن میں کہے ہوئے دو مصرع کو جن میں اسی طرح قافیے لائے جائیں جس طرح ذکر کیا گیا ہے بیت نہیں کہلائیں گے۔ بیت کو فنی طور پر پختہ بنانے کے لئے اور بھی باتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں جو تکنیکی طور پر بیت کو مکمل اور خوبصورت

بناتی ہیں۔ ان سب کا ذکر تو ممکن نہیں۔ صرف چند کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
سندھی ابیات میں سے بعض کو ایک سے الفاظ سے شروع کیا جاتا ہے، مثلاً :-

"دنیا میں رہنا نہیں" ، دھیان سے کرنا کام
کات خوشی سے رات دن ، ابھی سے کیا آرام
کل تجھ کو الزام ، دیں گی چرخے والیاں

"دنیا میں رہنا نہیں" ، غافل ہوش سنبھال
سوچ سکے تو سوچ لے ، کیا ہے تیرا حال
کل یہ موٹا مال ، ماریں گے سر پر ترے

اسی طرح بعض اوقات کچھ ابیات ایک جیسے الفاظ پر ختم کئے جاتے ہیں، مثلاً :-

ہنر کتائی کا بڑا ، ہاتھ ہاتھ کی بات
تو کاتن ہار کی ذات ، "چھٹے نہ پونی ہاتھ سے"

جو آیا وہ جائے گا ، چرخے پر رکھ دھیان
ہنر کتائی کا یہاں ، تیرا نام نشان
سوت تری پہچان ، "چھٹے نہ پونی ہاتھ سے"

کبھی کبھی ایک بیت جن الفاظ پر ختم ہوتا ہے اس کے بعد آنے والا بیت یا ابیات انہیں الفاظ سے شروع ہوتے ہیں :

راہِ عشق سے لوٹ جا ، گر ہے پیاری جان
قدم قدم اس راہ میں ، موت کا ہے سامان
یہ عاشق کی شان ، "خوف نہ کھائے جور سے"

"خوف نہ کھائے جور سے" جو ، وہ ہے منصور
وحدت کے نشے سے وہ ، سدا رہے مخمور
کبھی نہ ہو رنجور ، عشق میں وہ انجام سے

کبھی کبھی بیت کے پہلے اور دوسرے اور آخری مصرع کے شروع میں یکساں الفاظ لائے جاتے ہیں :-

"عشق میں رشتہ درد کا" ، کیا جانیں گے غیر
چاہت اور اخلاص سے ، جن کے دل کو بیر
اک نقطے پر جمع ہوں ، کیسے شر اور خیر
اس رستے میں پیر ، وہ رکھے جو مرد ہو

جس کو ہو احساس ، "عشق میں رشتہ درد کا"
اس نے کبھی سمجھا نہیں ، اپنے کو مظلوم
اس پر کریں ہجوم ، رنج و الم تو شاد ہو

عشق میں رشتہ درد کا" ۔ جیسے گل میں بو
اس کو ہے معلوم ، دل کو جس کی آرزو
اشکوں سے کرلے وضو ، تو تیری نذر قبول ہو

اب سُر یمن کلیان میں جو اردو ابیات درج کئے جائیں گے ان میں صرف وزن اور قوافی ہی نہیں بلکہ بیت کی تکنیک میں بھی سندھی ابیات ہی کا انداز اختیار کیا گیا ہے کیوں کہ اس سے مخصوص فنی فضا اور خاص لہجہ اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں جو اردو میں بھی اجنبی یا نامانوس معلوم نہیں ہوتے ۔ یہ ابیات "یمن کلیان" سے تعلق رکھتے ہیں جو رسالے کا دوسرا سُر (یا باب) ہے ۔ یہ ابتدائی دو سُر کلیان اور یمن کلیان عشق حقیقی کی ماہیت اور نوعیت سے تعلق رکھتے ہیں ۔ حمد ، نعت اور منقبت کے بعد یہ توضیح و رسالت کے اسرار و رموز ، عشق کی حقیقت اور مختلف کیفیات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ سُر یمن کلیان میں سُر کلیان ہی کے مطالب کی توسیع ہے ۔ اس میں تمثیلی انداز میں عشق کے حقائق اور شدائد یا امتحانات کا ذکر آیا ہے ۔ عشق میں ہر قدم پر امتحان ہوتا ہے ۔ دار و رسن اور صلیب کی منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے ۔ محبوب خنجر بکف عشق کی صداقت کا ثبوت چاہتا ہے اور عاشق کے لئے امتحان کا ہر لمحہ اور ظلم و جور کی ہر ادا ، تکلیف و اذیت کا ہر پل عین راحت بن جاتا ہے ۔ اس کے لئے مرض عشق شفا سے بہتر ہے ۔ وہ وید یا طبیب کا متلاشی نہیں ہوتا بلکہ اس کا طبیب تو "حبیب" خود ہوتا ہے ۔ عاشق لوہے کی طرح آگ میں تپ کر فولاد کی خاصیت اختیار کرتا ہے ۔ ان منزلوں سے گزر کر ہی عشق عشق بن جاتا ہے اور محبوب کے قابل ہوتا ہے ۔ اس کی مثال چراغ اور پتنگ کی سی ہے جو چراغ کا طواف کرتے ہوئے جل کر جان دے دیتا ہے ۔ اس کا عشق ایک نشے اور کیف و سرور کی صورت اختیار کر جاتا ہے جس میں کوئی چیز اس کو اس کیفیت کی دائمی لذت سے محروم نہیں کر سکتی ۔ زہر آلود شراب بھی اس کے اس کیف میں اضافہ ہی کرتی ہے ۔ بلکہ وہ زہر آلود شراب ہی کا طالب رہتا ہے ۔ یہاں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ایک لوک کہانی کی طرف تلمیح و اشارہ کیا ہے جس میں کراچی کے قرب و جوار میں ایک شاہراہ پر موکھی نامی ایک ساقیہ کا شراب خانہ تھا جس کی دور دور شہرت تھی ۔ ایک دن سات "متارے" (بہادر شخص) اس کے میخانے میں آ کر شراب کہنہ کے طلب گار ہوتے ہیں ۔ موکھی کے ہاں اس دن کوئی مٹکا شراب کہنہ کا موجود نہیں ہوتا ۔ بڑی تلاش کے بعد ایک مٹکا نظر آتا ہے ۔ وہ اسے کھولتی ہے تو اسے اس میں ایک مردہ سانپ نظر آتا ہے ۔ وہ شراب نہیں دیتی بلکہ بہانہ بنا دیتی ہے لیکن متارے اصرار کرتے ہیں کہ وہ دور سے اس کی تعریف سن کر آئے ۔ وہ مجبور ہو جاتی ہے تو اسی شراب میں سے انہیں پیالے بھر بھر کر پلا دیتی ہے ۔ وہ شراب پی کر سرشار ہو جاتے ہیں ۔ اور اپنی راہ لیتے ہیں ۔ موکھی کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مر گئے ہوں گے لیکن ایک سال بعد وہ واپس آ کر وہی شراب مانگتے ہیں ۔ موکھی انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ شراب دیتی ہے مگر انہیں اس سے سرور نہیں ہوتا ہے اور وہ اسی ایک سال قبل والی شراب کا تقاضا کرتے ہیں ۔ لاچار ہو کر موکھی کو حقیقت کا انکشاف کرنا پڑتا ہے ۔ انکشاف حقیقت کے بعد وہ جان دے دیتے ہیں ۔ شاہ صاحب نے اس سُر میں زہر آلود شراب اور موکھی کو تلمیح ہی نہیں بلکہ تمثیل کے انداز میں بھی پیش کیا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ عشق کا منتہا اور آخری منزل اس حقیقت کا انکشاف ہے جو موت پر منتج ہوتا ہے ۔ سُر یمن کلیان کی شاعری کے موضوعات یہی ہیں ۔ بیتوں کے آخر میں "وائی" ہے جو غزل کی ہیئت کے قریب

ہے۔ ایک ایسی غزل جو مطلعوں پر مشتمل ہے۔ یہ بھی بیک وقت شاعری اور موسیقی کی صنف ہے۔

داستانِ اوّل

اوّل آخر ایک ہے ، ظاہر باطن حق
عقل نہ اس کو پا سکے ، احدیت[۱] مطلق
ظلمت میں ظلمت چھپی ، فکر نہ کچھ منطق
سابق وہ اسبق ، ذات سے پہلے کچھ نہ تھا

ثانی کا امکان نہ تھا ، کامل تھی وحدت[۲]
گم تھا اس میں سربسر ، رازِ الوہیت
ظل اس کا کوئی نہ تھا ، ظاہر نہ تھی صفت
یہ اس کی عظمت ، اس کے علاوہ کچھ نہ تھا

واحدیت[۳] کی شکل میں ، اس کا ہوا ظہور
پرے تھا جو ادراک سے ، وہم و گماں سے دور
کُنہ کو اس کی پا سکے ، کس کا ہے مقدور
پھر بھی کہے شعور ، وہ ہے اور کوئی نہیں

اپنے امر سے روح[۴] کا ، اس نے کیا اظہار
ہر شے کے ادراک کا ، فہم نہیں معیار
کئے جتن تفہیم کے ، انسان نے تو ہزار
عقل و خرد لاچار ، "نَفَخْتُ مِنْ رُّوحِیْ" ہے کیا

عینِ حقیقت خود بنی ، اپنی آپ مثال[۵]
وحدت اس کی اصل ہے ، کثرت محض خیال
اپنے تصور سے ہوا ، ظاہر اس کا کمال
کثرت امرِ محال ، گر عالم نہ ہو مثال کا

---

۴ الروح من امر ربی

پرتو اس کی مثال کے ، سب جسم[1] و اجساد
شجر، حجر، انسان ، کیا آتش، آب اور باد
سب کی حقیقت خاک ہے ، سارے خاک نہاد
سب اس کی ایجاد ، سب کی حقیقت ایک ہے

احدیت وحدت بنی ، کھلی ازل کی کتاب
واحدیت وحدت ہوئی ، اُٹھنے لگے حجاب
روح، مثال اور جسم کا ، ہر نکتہ نایاب
ویسے الگ ہر باب ، اصل حقیقت ایک ہے

حادث اور قدیم کیا ، کیا واجب ، امکان
کون وجودِ ممتنع ، کس کو ہے عرفان
جو جانے حیران ، کچھ اظہار نہ کر سکے

جانیں حال "زمان"[7] کا ، جو ہیں اہلِ عال
ماضی کیا ، موجود کیا ، کیسا استقبال
سب کچھ وہم و خیال ، راز کی باتیں راز ہیں

راز کی باتیں راز ہیں ، پھر بھی نہ ہو حیران
تین سروں میں اک صدا ، جو ہے اسے پہچان
پہلا سُر جو سن چکا ، اس کو ماضی جان
دوسرے سُر کو سُن کے تو ، حال سمجھ نادان
تیسرا سُر جو آئے گا ، وہ مستقبل جان
یہ ہے رازِ "زمان" ، اس نکتے پر غور کر

کیا ہے "زمان" اور کیا "مکان" ، قدرت کی تمثیل
یہ ساری تفصیل ، تخم و شجر میں ہے نہاں
بو کر تخم زمین میں ، ہوگا راز عیاں

۱ تا ۶ وجود کے مراتبِ نزولی یا مراتبِ ستہ جن کو احدیت، وحدت، واحدیت، روح، مثال اور جسم کہا گیا ہے جن میں نزول فرما کر وجودِ حقیقی نے اپنا اظہار کیا ہے
۷ مسئلہ زمان و مکان کی توضیح سروں اور تخم و شجر کی تمثیل سے کی گئی ہے۔

پھوٹے گا پودا جہاں ، وہ ہے اس کا مکان
ہوگا درخت جوان ، دے گا سایا اور پھل

تخم کی وسعت الامان ، یہ اس کی تفسیر
تخم ہے خواب مختصر ، یہ اس کی تعبیر
شاخ و برگ و بار و گل ، سب اس کی تقدیر
ہے کُن کی تاثیر ، سارا رمز وجود کا

ایک مکاں ہے وہ زمین ، جہاں شجر کی اساس
ایک مکان ہے وہ فضا ، جہاں گلوں کی باس
یہ ہے وجہِ قیاس ، غور و فکر وجود میں

کیا ہے زماں اور کیا مکاں ، یہ ہے امر محال[1]
کمرے میں اک شمع کر روشن ، دیکھ مثال
گر تو کرے خیال ، ہوا ہے پہلے سے وہاں

کمرے میں ہے روشنی ، اور ہوا کا وجود
شیشہ رنگیں ہے اگر ، پاس ترے موجود
رکھ دے شیشہ شمع پر ، رنگ کی ہو گی نمود
پھر تو آتشِ شمع سے ، روشن کر دے عود
نور، ہوا اور رنگ و بو ، حدوں میں ہیں محدود
"زماں" میں سب مسدود ، سب کا الگ مکان ہے

جس کی شان ہے سرمدی ، وحدت اس کا مکان
اس تک وہم و گمان ، پہنچے تو گم عقل ہو

اصل زمان و مکان پر ، ہستی کی بنیاد
خالق کا ارشاد ، قرآن میں "والعصر" ہے

---

[1] دوسری تمثیل اندھیرے کمرے میں ہوا، روشنی، رنگ اور خوشبو کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا مکان علیحدہ ہے مگر ان کی علیحدگی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ سب ایک زمان میں علیحدہ علیحدہ مکانوں میں پائے جاتے ہیں مگر ان کا ادراک عقلی اور ذہنی ہے۔

قطع کرے ہر چیز کو ، وقت ہے ایسی سَیف[1]
غافل تجھ پر حیف ، گر حکمت کو نہ پا سکے

دل کے روگی رہ گئے ، رخصت ہوئے طبیب
دُور نگاہوں سے ہوئے ، دل سے رہے قریب
محروموں کے نصیب ، جینا ایک عذاب ہے

جینا ایک عذاب ہے ، ہو گا کیسے ملاپ
پل پل جینا پاپ ، کاٹے عمر کٹے نہیں

کوئی دوا علاج ہے ، اور نہ صحت روگ
عشق ہے راحت روح کی ، جوگ نہ کوئی بروگ
عاشق سادہ لوگ ، دارو چاہیں طبیب سے

طالب اچھے حال کے ، کب ہیں عاشق لوگ
عشق میں بڑھتا ہے سوا ، اور وفا سے روگ
روحوں کا سنجوگ ، درد کے رشتے سے ہوا

اس کے ہاتھ علاج ہے ، عُذر نہ کچھ معذور
اس کے لئے قریب ہے ، تیرے لئے جو دُور
تو ہے اگر مجبور ، اس کو مجبوری ہے کیا

منزل کو محبوب کی ، سہج نہ پائے کوئی
خود کو مٹائے سوئی ، پہنچے جو مقصود کو

پہنچے جو مقصود کو ، پھولا نہیں سمائے
خاطر میں نہیں لائے ، بوالہوس اور رقیب کو

---

۱ الوقتُ سَیفٌ

دیا اور پتنگ دونوں کو ، کب ہے ہوش
ایک کے دل میں جوش ہے ، ایک جلے خاموش
دونوں ہم آغوش ، پھر بھی سدا جلتے رہیں

دیا اور پتنگ دونوں کا اک رنگ ہے
رہتے ہیں دونوں سنگ ، پھر بھی سدا جلتے رہیں

دیا اور پتنگ دونوں کے دو رنگ ہیں
دونوں جان سے تنگ ، پھر بھی سدا جلتے رہیں

دیا اور پتنگ ، اپنی اپنی آگ ہے
آگ سے دونوں کے نہیں ، دل میں کوئی درنگ
فطرت دونوں کی جدا ، پھر بھی ہیں ہم رنگ
جلیں ایک ہی آگ سے ، اور نہیں دل تنگ
کوئی نہیں احساس انہیں ، نام ہے کیا ، کیا ننگ
دونوں ہم آہنگ ، دو قالب ایک جان ہیں

عشق کی بھٹی میں ہوا ، پختہ جو انسان
اس کی یہ پہچان ، جائے دہکتی آگ میں

پتھر چٹخے آگ میں ، پگھل جائے فولاد
تڑخے اور پگھلے نہیں ، دل کی وہ بنیاد
جلے آگ میں عشق کی ، اور نہ کرے فریاد
آدم کی اولاد ، ظالم اور جاہل رہے

سر ہو جب سندان پر ، ہے فن یا دھرام
قاتل کا کیا پوچھنا ، کچھ ہو نشان اور نام
شکر ہو کس کا اس گھڑی ، اور کس پر الزام
لوہا جب ہو خام ، دیکھو ہنر لہار کا

دھونک دھونک کر دھونکنی ، سُرخ کیا فولاد
بے شکلی کو شکل دی ، دو لُہار کو داد
صورت اس کو وہ ملی ، جیسی خس کی نہاد
ہرچہ بادا باد ، سر ہو جب سندان پر

ہاتھ ہے کچھ لوہار کا ، کچھ لوہے کی ذات
پھر بنتی ہے بات ، آب دار تلوار کی

لوہاروں کو چاہیئے ، لوہے کی پہچان
ہنر اگر ہے ہاتھ میں ، تو کیا سود و زیان
کاریگر کو چاہئیں ، اچھے گھن سندان
مشکل ہے آسان ، ہنرمند لوہار کی

ہاتھ سپاہی کا ہو گر ، تیغ بڑا ہتھیار
ہو بزدل کا ہاتھ تو ، لکڑی کی تلوار
ہنرمند لوہار ، کیوں ناحق بدنام ہو

دُور دُور شہرت ہوئی ، ایسی کہاں شراب
یہاں ہیں خُم کے خُم بھرے ، اور جگہ نایاب
زہر پئیں مے جان کر ، کھلا طلب کا باب
کوئی نہیں حساب ، ساغر پر ساغر چلے

جس کو سمجھے شراب ہم ، وہ شے تھی کچھ اور
مے خواروں کے طور ، بدل گئے اک جام سے

جام بھرا موکھی[1] نے جب ، چھایا ایک سُرور
دل سے متواروں[2] کے ، ہوئے رنج و غم سب دُور
ہوئے نشے میں چُور ، پی کر [illegible]

---

[1] موکھی۔ ساقیہ جس کے میخانے کی دھوم تھی۔ [2] متوارے۔ ساٹھ جواں مرد جو موکھی کے میخانے میں آکر شراب کے طالب ہوئے۔

جام وہی ، مے بھی وہی ، رند وہی ، وہی پیاس
نشہ نہ آیا راس ، فکر "متاروں" کو ہوئی

ایسا نشہ چاہئے ، دل کا دُھلے غبار
اک اک گھونٹ سے روح تک ہو جائے سرشار
جو کچھ ہے دشوار ، رندوں کو آسان کر

ایک جام ایسا ملے ، اپنا ہو عرفان
قابو میں اپنے رہے ، نفس نجس نادان
خوفِ سود و زیان ، لحظے میں مفقود ہو

صوفی کے ساغر میں ہو ایسی حیات شراب
جس کے ایک ہی گھونٹ سے ، اٹھنے لگیں حجاب
جو رشکِ تعبیر ہوں ، ایسے دکھائے خواب
سارے عذاب ثواب ، غرق مے صافی میں ہوں

صوفی " لاکوفی " رہا ، کوئی نہیں مذہب
سنی ، اہل حدیث وہ اثنا عشری کب
بھٹکے نہ سیدھی راہ سے ، اس سے راضی رب
راتوں کو سونے نہ دے ، اس کو دل کی طلب
ساتھ گواہی دیں سدا ، اس کے قلب اور لب
کوئی نہ ہو مطلب ، اس کو فرقے فساد سے

کثرت وحدت جان ، عشق کا مسلک یہی
خود اپنا عرفان ، ہے خالق کی معرفت

عشق ہے وہ میدان ، جس کا انت کوئی نہیں
بھٹکا جو انسان ، کھو جاتا ہے سراب میں

قدم قدم ہے عشق میں ، اک پُر ہَول سراب
اس کے لئے عذاب ۔ راہ سے بھٹکے جو کوئی

چمکے چاندنی دُور سے ، اُجلا اُس کا رنگ
پھر بھی گورا انگ ، میلا ہو اس کے نور سے

دونوں پانی میں پلیں ، نرسل[1] اور کماد[2]
ایک ہے عسل نہاد ، دوسرا اندر سے تہی

ایک جنگل میں دو ہرن ، فرق مگر ہے صاف
مشک ایک کی ناف ، ایک سے حاصل کچھ نہیں

کثرت وحدت جان ، یہی رمز یہی راز
وحدت کی آواز ، قول ہے لعل لطیف کا

کثرت وحدت جان ۔ قول لطیف[3] پہ غور کر
اس کو احول جان ، جو کثرت میں اسیر ہے

کثرت وحدت جان ، یہی رمز ۔ یہی راز
وحدت کی آواز حاصل قول لطیف ہے

کثرت وحدت جان ، غور سے رمز لطیف سُن
مکڑی کا جالا نہ بُن ، جس میں آپ اسیر ہو

کثرت وحدت جان ، سچا قول لطیف کا
وحدت پر ایمان ، ہے تو بیڑا پار ہے

---

[1] نرسل : گنّے کی شکل کی ایک قسم کی نباتات جس کی ڈنڈیاں اندر سے خالی ہوتی ہیں [2] کماد : گنّا جو شیرینی سے پُر ہوتا ہے [3] لعل لطیف : شاہ عبداللطیف بھٹائی جن کے رسالے کی پیروی میں یہ مجموعہ ترتیب دیا گیا ہے ۔ جس طرح شاہ لطیف نے اپنے رسالے کے سُر یمن کلیان میں چند ابیات میں رومی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اسی طرح اس سُر میں شاہ لطیف کی خدمت میں عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔

کثرت وحدت جان ، دے یہ لطیف خبر
احول اس کی نظر ، جو کثرت میں اسیر ہے

"وائی"

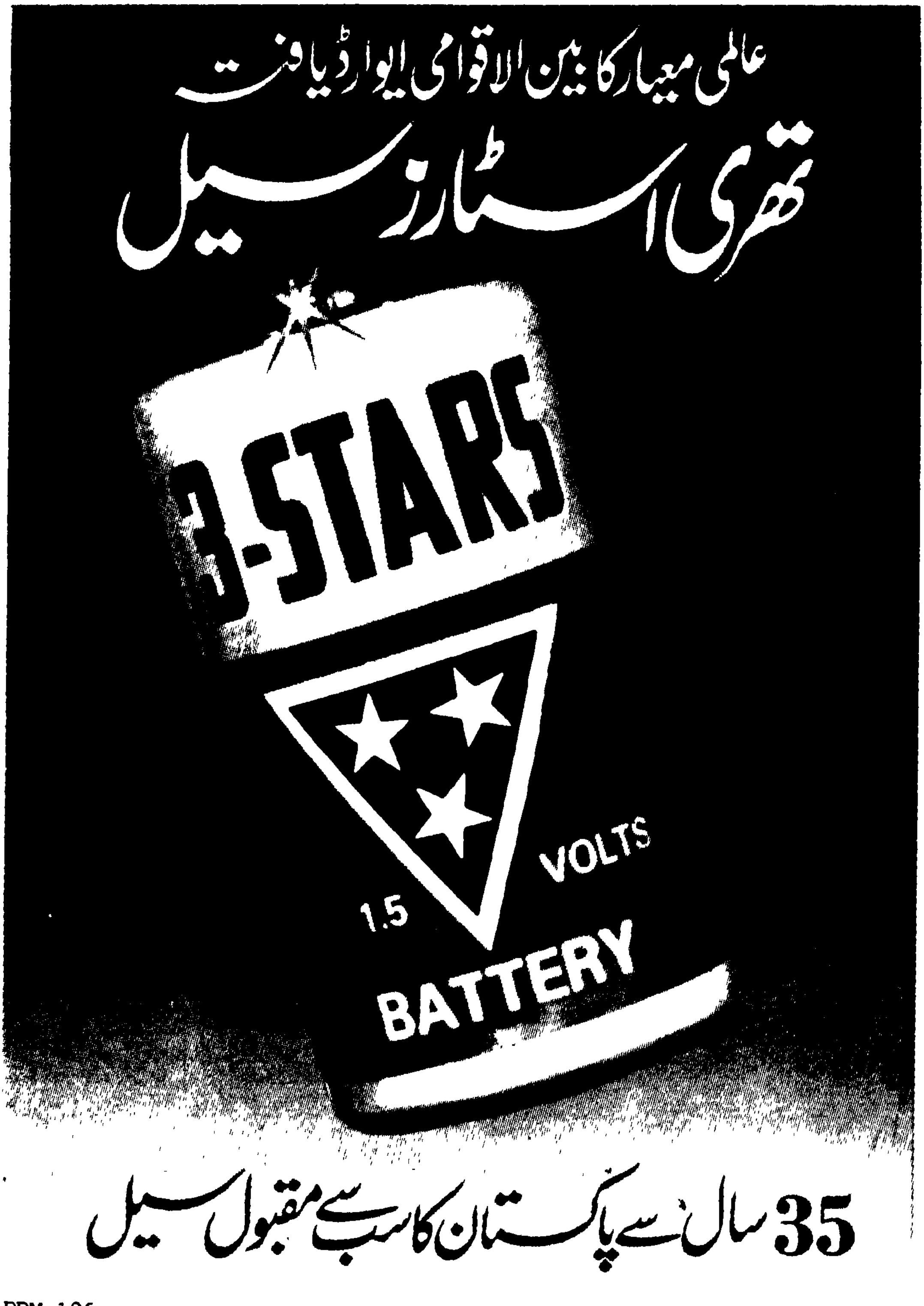
سوچ سمجھ کے گزار ، تیرے جوبن کے دن چار
طعنے مہنے دنیا بھر کے ، جینا ہے دشوار
سُولی پر ہر لمحہ گزرے ، دل میں خوف ہزار
سوچ سمجھ کے گزار ، تیرے جوبن کے دن چار

چاہت ہاٹ پہ بکنے آئی ، لاج سر بازار
ساجن کوڑی مول بھی لے تو ، بکنے کو تیار
سوچ سمجھ کے گزار ، تیرے جوبن کے دن چار

ہمت پست ہے منزل کھوٹی ، رستہ ہے پُرخار
دل میں پریت کا دیا ہے روشن ، پھر بھی گھور اندھیار
سوچ سمجھ کے گزار ، تیرے جوبن کے دن چار

جسم نڈھال ہے، دل درماندہ ، جی کو نہ آزار
پھر بھی وصال کی آس بندھی ہے ، جینا ہے لاچار
سوچ سمجھ کے گزار ، تیرے جیون کے دن چار

ناؤ ہے ڈانوا ڈول بھنور میں ، ٹوٹ گئی پتوار
قسمت ہیٹی، دُور کنارا ، بے بس کھیون ہار
سوچ سمجھ کے گزار ، تیرے جیون کے دن چار


عالمی معیار کا بین الاقوامی ایوارڈ یافتہ
تھری اسٹارز سیل
3-STARS
1.5
VOLTS
BATTERY
35 سال سے پاکستان کا سب سے مقبول سیل
PBM-186
ARGUS



ڈاکٹر انور سدید

اردو کے عصری تقاضے

ادب میں عصری تقاضوں کا سوال سامنے آئے تو سب سے پہلے یہ مسئلہ سر ابھارتا ہے کہ :

کیا ایک تخلیق کار کی حیثیت میں ادیب نے اپنی ادبی ذمہ داری پوری کی ہے ؟

اور جو ادب وہ تخلیق کر رہا ہے کیا اس میں عصری آگہی کے عناصر موجود ہیں ؟

اور کیا یہ ادب عصری تقاضوں کو پورا کرتا ہے ؟

یہ سوالات بظاہر متضاد نوعیت کے ہیں لیکن ان سب میں "ادب" اور "عصر" دو ایسی اقدار مشترک موجود ہیں جو تخلیقی عمل میں لازم ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چناں چہ اس مسئلہ کا ایک رُخ ادیب کے داخل میں برپا ہونے والے تخلیقی عمل کی طرف ہے اور دوسرا عصر کی طرف جو ادب کی تخلیق کے لئے خام مواد فراہم کرتا ہے اور عصری تقاضوں کے حوالے سے تکمیل شدہ ادب پارے سے کچھ توقعات بھی وابستہ کر لیتا ہے۔

بادی النظر میں عصری تقاضا وہ خارجی قوت ہے جو ادیب کے داخل کو نہ صرف برانگیختہ کرتی ہے بلکہ عمل اور ردِ عمل کی صورت پذیری پر بھی منتج ہوتی ہے۔ عصری آگہی سے اگر مراد کسی عہد میں معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رُونما ہونے والے واقعات، افکار، اذکار اور انکشافات سے آگہی ہے تو میں بلا توقف کہوں گا کہ اس کے بغیر ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ کہ ادیب اپنے عصر کا جز بھی ہے اور آئینہ بھی ادیب جب تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو اس کی تخلیق میں لازماً وہ لرزشیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جو اس عہد کی معاشرتی، تہذیبی اور فکری سطح پر رُونما ہو رہی ہوتی ہیں۔ اور جن سے ادیب پہلو تہی اختیار نہیں کر سکتا۔

ادیب کو یہ منفرد حیثیت بھی حاصل ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے لرزیدہ نقطے پر زندگی بسر کرتا ہے اور بقول علامہ اقبال وہ چشمِ برعہدِ کہن بھی رہتا ہے اور موجود کے آئینے میں فردا کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ چنانچہ ادیب اس پُل کی طرح ہے جس نے ایک کندھے پر ماضی کو اور دوسرے پر مستقبل کو تھام رکھا ہے اور وقت اس پُل کے نیچے سے آبِ رواں کی طرح لمحہ بہ لمحہ گزرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ ادیب اپنے شعور ماضی سے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو ہی پیشِ نظر نہیں رکھتا بلکہ وہ مستقبل میں رونما ہونے والے تقاضوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ ادیب ماضی اور حال دونوں زمانوں کے تجربات کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بناتا اور اس سب کو تخلیقات کی صورت دے کر آئندہ نسلوں کے لئے بصیرت اور آگہی بھی فراہم کرتا ہے۔ ادب میں شخصیت کا اظہار ہو یا عصری آگہی کا ـــــ ادیب کا اساسی مقصد رُوحِ عصر کی تلاش ہے جو صداقت پر مبنی ہوتی ہے۔

اور ہمیشہ حق کی قدروں کو سربلند کرتی ہے۔ اس قسم کا تجربہ موجود لمحے میں وارد ہونے کے باوجود قائم بالذات اور اپنی تخلیقی صورت میں زمانۂ حال کی قید سے آزاد ہے۔ تخلیق کرنے کی یہ قوت ہی ہے جو ادیب کو دوسرے معاشرتی انسانوں سے ایک الگ نوع کا فریضہ ودیعت کرتی اور اُسے تخلیق کار کا اعلیٰ منصب عطا کرتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ

" ادیب جب معاشرے کا ذمہ دار اور سب سے باشعور فرد ہے اور جسے فطرت کی لطیف ترین لرزشیں سننے کی صلاحیت بھی حاصل ہے تو کیا اس کا سماجی فریضہ یہ نہیں کہ وہ ادب میں عصری تقاضوں کی پیروی کرے ؟"

سخن گسترانہ طور پر عرض ہے کہ اس سوال میں ادیب کو معاشرے کا ہی نہیں عصری تقاضوں کا بھی غلام بنا دیا گیا ہے۔ عصری تقاضے مقاصد کے مخصوص دائروں میں گردش کرتے اور وقتاً فوقتاً صورت تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر زمانۂ امن میں صلح و آشتی اور محبت و یگانگت کی فضا پیدا کرنا اہم ترین عصری تقاضا ہے لیکن ملک پر جنگ مسلط کر دی جائے تو وطنیت کے جذبات اُبھارنا اور دشمن کے خلاف عصبیت پیدا کرنا بالکل دوسری نوعیت کا تقاضا ہے۔ ملک میں جمہوریت ہو تو عصری تقاضے اپنی صورت گری مختلف انداز میں کرتے ہیں لیکن آمریت کی حکمرانی ہو تو عصری تقاضوں کی جہت یکسر منقلب ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا بھر کے ادیب اس قسم کے متضاد حالات سے گزرتے اور ان سے نبرد آزما ہوتے ہیں لیکن اس صورتِ حالات میں ادیب ادیب نہیں رہتا بلکہ ایک عام شہری بن جاتا ہے اور دستور کے مطابق ودیعت شدہ فرض ادا کرنے میں ہی اس کی قومی فلاح مضمر ہے لیکن جب وہ تخلیق کے مرحلے سے گزرتا اور ادیب کا منفرد کردار ادا کرتا ہے تو وہ ایک ایسا آزاد فرد ہے جو پورے معاشرتی عمل کو ایک منصف مزاج، حق پسند اور غیر جانبدار دیدہ ور کی نظر سے دیکھتا اور آلائشوں سے ملوث زندگی سے صادق قدروں کو اجاگر کرتا ہے۔ ادیب کا فریضہ عصری تقاضوں کی پیروی یا سماجی ضرورتوں کے مطابق ادب تخلیق کرنا نہیں بلکہ حقیقت اور صداقت کی جستجو ہی اس کا مقصدِ اولیٰ ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے ادیب کو اکثر مضبوط اور ایماندار حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ادیب اپنی ادبی حیثیت میں عصری تقاضوں کا غلام نہیں ہوتا بلکہ یہ فرض معاشرے کا ہے کہ وہ ادب کی آزادانہ تخلیق کے لئے سازگار ماحول پیدا کرے۔ اور ادیب کے فکر و خیال پر شب خون مارنے یا کم ظرف اور بے بضاعت عصری تقاضوں کی اطاعت کرنے پر مجبور نہ کرے۔

اس نظری اجمال کے بعد اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اُردو ادب عصری تقاضوں سے کس طرح نبرد آزما ہوا ہے۔ اور زمانۂ حال میں اس کی صورت کیا ہے ؟

اس ضمن میں یہ حقیقت شاید آپ کو چونکا دے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی درباری فضا میں ادیب کو معاشرے میں کچھ زیادہ باعزت مقام حاصل نہیں تھا۔ اس دَور کے سازشی ماحول میں ہمہ اقسام کی سماجی اور سیاسی ریشہ دوانیاں پروان چڑھ رہی تھیں اور ادیب ان کی براہِ راست زد میں تھا۔ البتہ یہ ہوا کہ اُس دَور کا ادیب صرف شعر تخلیق کر سکتا تھا اور تعلّی بگھار سکتا تھا۔ لیکن جہدِ للبقا میں وہ کچھ زیادہ فعال نہیں تھا۔ اُمرا، رؤسا اور بادشاہوں کے توسل نے خوشامد، ہجو، درباراری، لطیفہ بازی اور فحش گوئی کو فروغ دیا تھا۔ اس سے آوارگیِ خیال پیدا ہوئی۔ دشنام طرازی کو فروغ ملا۔ اس دور کا ادیب اس میں ملوث تھا۔ ان میلانات کے تحت اس عہد کا ادیب معاشرے میں خاصا بدنام ہوا۔ "آبِ حیات" میں محمد حسین آزاد نے شعرا کے جو قلمی مرقعے پیش کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرفا ادیب اور شاعر کو ایک اچھا شہری قرار دینے سے ہچکچاتے تھے اور ہمارے زمانے میں اس دَور کے شعرا کو مقامِ امتیاز عطا کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب عصری فضا تبدیل ہو چکی ہے، جذبات کی حدت ختم ہو چکی ہے اور وہ گرد چھٹ چکی ہے جو شعرا کی شخصیت کے گرد اُن کے اعمالِ حیات نے جمع کر دی تھی۔ چنانچہ اب ہمارے سامنے صرف اُن کی

تخلیقات ہیں اور ان میں ہم شاعر کا چہرہ دیکھنے کے بجائے اس صداقت کی جستجو کرتے ہیں جو زمانے کی چھلنی سے مقطر ہو کر سلسلہ در سلسلہ ہم تک پہنچ رہی ہے۔ اور جس کی حیثیت وقتی نہیں بلکہ دوامی ہے۔

عرض کرنے کا مقصود یہ ہے کہ قدیم ادبا نے اپنی شعری حیثیت پر تفاخر کا اظہار تو فراوانی سے کیا لیکن اپنی سماجی حیثیت کا ادراک پوری طرح نہیں کیا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس دور کے شعرا عصری تقاضوں سے متغافل یا عصری آگہی سے ناآشنا تھے قطع نظر اس کے کہ اردو شاعری کے بیشتر علائم و رموز فارسی شاعری سے حاصل کئے گئے تھے اور غزل ایرانی مرغزاروں کی سیر کررہی تھی حقیقت یہ ہے کہ اس دور کی شاعری میں عصری تقاضوں کے زائیدہ تجربے اور مشاہدے شامل تھے۔ اور ان میں ماضی کی بازگشت اور عہد حاضر کا کرب ہی شامل نہیں تھا بلکہ مستقبل کی طرف پیش قدمی کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ خواجہ میر درد، میرزا رفیع سودا، میر تقی میر، مومن خاں مومن اور اسداللہ خاں غالب اس دور کے چند ایسے نامور شعرا ہیں جن کی تخلیقی صورت گری میں تینوں زمانوں کی روح موجود ہے اور ان شعرا کی تعبیر عہد حاضر میں کی جاتی ہے تو یہ شعرا گلشن نا آفریدہ کے عندلیب نظر نہیں آتے، ان کے اشعار ہماری روح کے تاروں کو ہلا دیتے ہیں۔ اور ان کے اشعار میں آج کے زمانے کی چاپ بھی سنائی دینے لگتی ہے۔ غزل چوں کہ شخصی اظہار کو بھی عمومی صورت دے دیتی ہے اور مخصوص صورت واقعہ اس کے معنوی تجربے میں اپنی مخصوص داخلی کیفیت گم کردیتی ہے اس لئے اکثر اوقات غزل کا شعر ایک ایسی تجریدی صورت کو جنم دے دیتا ہے جس میں شاعر کا مخصوص ذاتی تاثر نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ قدیم اردو شاعری کے ساتھ بھی یہی المیہ ہوا۔ چنانچہ اس دور کے عصری تقاضوں کو "شہر آشوب" کی صنف نے جس خوبی سے آشکار کیا ہے اس خوبی سے غزل شاید پیش نہیں کرسکی۔ اور اس کی ایمائیت اور عمومیت اس کی راہ میں آڑے آئی ہے۔ "شہر آشوب" میں اس دور کی سماجی کیفیت مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجئے اور اس کا موازنہ موجودہ دور کے معاشرتی حالات سے کیجئے۔

آرام سے کٹنے کا سناتو نے کچھ احوال — جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے؟
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام — عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے — سودا

بخیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول — وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول — اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول — سودا

خوش نما کب ہے ایسی قال و مقال — ہے کڈھب چرخ زرد سیاہ کی چال
مصلحت ہے کہ رہیئے ہو کر لال — فائدہ کیا جو راز کریئے فاش — میر تقی میر

کیا قضا چھوٹی سی اک بستی کی جس پر کہ کوئی — ننگ رتبے کو سمجھ کر نہیں کرتا پے شتاب — قائم
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کبھو کج طینت — تیر بنتے ہیں کبھو شاخ کماں سنتے ہو

کیا چھوٹے کام والے کیا پیشہ ور نجیب — روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب — نظیر اکبر آبادی

اور اب تغزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں اس دور کی رُوحِ عصر سمٹ آئی ہے۔ اور دور کی ہر مستقبل کی طرف بھی پیش قدمی کر رہی ہے

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا	مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی	سراج اورنگ آبادی
اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم	مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم	مظہر جانِ جاناں
غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی	دوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری	رام نرائن موزوں
شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی	انہیں کی آنکھ میں پھرتی سلائیاں دیکھیں	میر تقی میر
چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا	ہم نے جانا تھا کہ بس میر یہ آزار گیا	"
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر	مرے لہو کو تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا	سودا
وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں	اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں	"
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے	خواجہ میر درد
آگے جو بلا آئی تھی سو دل پہ ٹلی تھی	اب کے تو مری جان ہی پر آن بنی ہے	"
واعظِ احمق اس نے ٹھہرایا	آیتوں سے، روایتوں سے مجھے	ذوق
اب بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں	اٹھیے کہ اب وہ لذتِ خوابِ سحر گئی	غالب
لکھتے رہے جنوں میں حکایاتِ خوں چکاں	ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	"
حسرت اے طاقتِ پرواز کہ ہم اڑ نہ سکے	گر کے پھڑکا کیے دیوارِ گلستاں کے تلے	ظفر

خواجہ منظور حسین نے اپنی کتاب "تحریکِ جدوجہاد بطور موضوعِ سخن" میں متعدد ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے جو اس دور کے شعرا نے تحریکِ سید احمد سے متاثر ہو کر لکھے تھے اور ثابت کیا ہے کہ اس دور کے شعرا اپنے قومی اور عصری تقاضوں سے غافل نہیں تھے۔ چند اشعار حسبِ ذیل ہیں جن سے سید صاحب اور ان کی تحریک سے ارادت کا اظہار نمایاں ہے۔

آخر کو فیضِ بیعتِ دستِ سبو سے آج	پیرِ مغاں کے میں بھی مریدوں میں مل گیا	ذوق
شوقِ بزمِ احمد و ذوقِ شہادت ہے مجھے	جلد مومن لے پہنچ اس مہدیِ دوراں تلک	مومن
ہر خار و خس میں وجد ہے ہر سنگ و خشت مست	کیا مے کشوں نے آ کے کہا خانقاہ میں	شیفتہ
بس کہ تھی اس سے عیاں سینۂ عارف کی صفا	چہرۂ یار کو میں نے دلِ روشن سمجھا	آتش
زندۂ جاوید ہیں قربانیانِ راہِ عشق	سر کا کٹنا جانتے ہیں پھوٹنا نکسیر کا	"
حشر میں ناسخ یہی اپنا کہوں گا سلسلہ	میں اسیرِ حلقۂ گیسوئے سید زادہ ہوں	ناسخ
اپنی برقِ نگاہ سے تم نے	شجرِ طور کر دیا ہم کو	"

۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی ہوا تو یہ بہادر شاہ ظفر کی تخت و تاج سے محرومی کا محض تاریخی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس سے ایک طویل عہد کی شکست و ریخت کی داستان بھی وابستہ تھی اور اس میں ایک مضبوط معاشرے کے مسلسل زوال کی حقیقت بھی موجود تھی۔ چنانچہ اس کے تہذیبی اثرات دُور رَس تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شکست سے ایک نئے عہدِ غلامانہ کی ابتدا ہوئی تو عصری تقاضوں کی نوعیت بھی بدل گئی۔ دردناک حقیقت یہ بھی کہ مغلوں کے آخری دور کی طوائف الملوکی، انتشار اور بدنظمی کے مقابلے میں انگریزوں کے استحصالی نظام میں عوام الناس کو عافیت محسوس ہونے لگی۔ اور حکومت نے نئی معاشرتی آسودگیوں کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا تو عام لوگوں میں ان سے استفادہ کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ انگریزوں سے

نجات حاصل کرنے کی آخری کوشش ۱۸۵۷ء میں ناکام ہو چکی تھی۔ ہندوؤں نے انگریزی سامراج کو قبول کر لیا تھا اور راجہ رام موہن رائے نے علوم نو کی تعلیم کے لئے ایک باقاعدہ تحریک کو جنگ آزادی سے بہت عرصہ پہلے فروغ دے دیا تھا۔ اور خدشہ یہ پیدا ہو گیا کہ شکست کے بعد کہیں احساس شکست بھی زائل نہ ہو جائے۔ طمانیت کی بات یہ ہے کہ ان عصری تقاضوں کا ادراک اس دور کے ادبا نے سب سے پہلے کیا اور سرسید احمد خاں کی قیادت میں حالی، نذیر احمد، شبلی، ذکاء اللہ، محسن الملک اور وقار الملک جیسے لوگوں کی ایک جماعت مجتمع ہو گئی جو ادیب بھی تھے اور قوم کے مصلح بھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید تحریک کا روحانی زاویہ کمزور تھا اور اس تحریک کے سب ثمرات شیریں نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خلاف شدید ردعمل بھی مسلمانوں کے طبقے سے ہی پیدا ہوا۔ تاہم سرسید کی اس خدمت سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے ایک شکست خوردہ قوم کو دوبارہ معاشرے میں بحال کیا۔ اس کے وقار اور عزت میں اضافے کے لئے علوم نو کی تحصیل کے وسیلے فراہم کئے اور انگریزوں کے دلوں سے تعصب اور کدورت صاف کرنے کی کوشش کی۔ ان کی ایک اور بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کی سیاسی پیش قدمی کی چاپ سنی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت میں اردو زبان کو ایک اہم عنصر کی حیثیت دی لیکن ان کی مغربیت پسندی کو اس دور کے مسلمانوں نے قبول نہ کیا۔ اکبر الٰہ آبادی جیسے زیرک اور روشن خیال شاعر بھی ان کے خلاف صف آرا ہو گئے اور " اودھ پنچ " کے صفحات سے ادیبوں کی ایک ایسی جماعت بھی ابھری جس کے قلم سے دشنام تیروں کی طرح برستے تھے۔ برصغیر کے ایک خاصے بڑے طبقے نے اس قسم کے ردعمل میں نہ صرف دلچسپی لی بلکہ اس نوع کی مختلف تحریکوں میں شرکت بھی کی۔ اس سب کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی صورت حال تبدیل ہوئی تو اس تبدیلی کا ادراک اس دور کے ادیبوں نے سب سے پہلے کیا اور عصری حقیقت پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ یہ ادبا عصری تقاضوں کا تجزیہ اپنے اپنے انداز میں کرتے تھے لیکن قوم کی فکری راہ نمائی میں سب پیش پیش تھے چنانچہ سرسید اور اکبر الٰہ آبادی کے راستے اگرچہ الگ الگ تھے لیکن قومی مقاصد مختلف نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی نے طعن و تعریض کے باوجود سرسید کو خراج تحسین بھی پیش کیا۔ ہو لکھا کہ

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا ہے نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
صدمے اٹھائے، رنج سہے، گالیاں سنیں لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
واہ رے سید، پاکیزہ گہر کیا کہنا! یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا!

عہد مغلیہ کے زوال سے سودا، میر، درد، مومن، ذوق، غالب جیسے شعرا پیدا ہوئے تھے جن کی شاعری میں درد کی ایک زیریں لہر موجود ہے اور عصری تقاضوں پر ردعمل بالواسطہ اور عمومی ہے۔ تصوف اس دور کے شعرا کی سب سے بڑی پناہ گاہ تھی اور زمانے کے حوادث میں بھی عافیت طلبی کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ انگریزی دور میں سرسید، حالی، اکبر اور اقبال پیدا ہوئے جو زوال کے بجائے اسباب زوال دریافت کرنے کے خواہاں تھے اور علوم نو کی تحصیل کو نئے دور کا اہم ترین عصری تقاضا شمار کرتے تھے۔ اقبال کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے تہذیب مغرب کو شاخ نازک کا آشیانہ قرار دیا۔ اور اس کی قبولیت کو قومی خودکشی کے مترادف قرار دیا۔ اس لحاظ سے یہ بات درست ہے کہ سرسید کے حوالے سے اقبال علوم نو کے حصول کے داعی تھے لیکن تہذیبی لحاظ سے وہ اکبر الٰہ آبادی کے ہم نوا تھے چنانچہ سرسید تحریک سے روحانیت کا جو زاویہ غائب ہو گیا تھا وہ اقبال کی صورت میں بازیافت ہوا۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں اردو ادب کی بیشتر سربرآوردہ شخصیات نے عصری تقاضوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ شوکت رفتہ اور گم شدہ تہذیب کے تصورات اور افکار اسلامی کو اپنی ایمانیات کا جزو بنایا۔ اور ایسی تخلیقات پیش کیں جن کا جمالیاتی زاویہ اور فنی اسلوب ایک مخصوص فکری سمت کی طرف راہ نمائی کرتا تھا۔ اس کی سب سے روشن مثال اقبال ہیں جنہوں نے ایک دیدہ ور کا کردار

ایا۔ اور اپنے عہد کو حالتِ خواب سے جگا کر نئی حقیقتوں سے آشنا کیا اور عصری تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کی دعوت دی۔ مولانا ظفر علی خاں لانا محمد علی جوہر، غلام بھیک نیرنگ، حفیظ جالندھری، احسان دانش، خوشی محمد ناظر، شیخ عبدالقادر، فلک پیما، عبدالمجید سالک، شاہ دین ہمایوں م رسول مہر، چودھری فضل حق اور متعدد دوسرے ادبا نے اپنے مضامین اور تخلیقات سے یہی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔

ایک طویل سیاسی، فکری اور اعصابی جنگ کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ آزادی کے حصول کے بعد اس دور کو لازماً ایسا دور ہونا چاہیئے تھا جس میں عظیم ادب تخلیق کیا جاتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں اگرچہ عوام کو غلامی سے نجات مل گئی اور مسلمانوں نے نوتے سال کے بعد خطۂ پاک حاصل کر لیا لیکن آزادی کا نتیجہ حسبِ توقع نہیں نکلا۔ عوام و خواص نے منظر بدلتے ہی لوٹ کھسوٹ، زر اندوزی پروری اور منصب و اقتدار پرستی اختیار کر لی۔ اور ان میلانات نے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔ ذاتی مقاصد کو قومی مقاصد قیت ملنے لگی۔ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد قوم ایک عظیم رہنما سے ہی محروم نہیں ہو گئی تھی بلکہ اس کا رابطہ ایک بڑے سرچشمۂ فیض سے بھی ٹوٹ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی استحکام کے اداروں کو مضبوط کرنے اور ان کا رُخ عوام کے اجتماعی بہبود کی طرف موڑنے کے بجائے ان اداروں کو سیاسی عدم زن پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ سیاسی سطح پر ایک تو زائیدہ چھوٹے ملک کو پڑوس کے بڑوں ملکوں سے جو تعاون فراہم ہونا چاہیئے ادہ بوجوہ دستیاب نہیں ہوا بلکہ نفرت کی دیوار کو روز بروز مضبوط کیا جانے لگا۔ بقائے باہمی کی فضا استوار نہ ہوئی۔ پاکستان کو زندگی کے ابتدائی ۲۵ شیں سالوں میں تین جنگوں میں شریک ہونا پڑا۔ آخری جنگ میں اس ملک کا مشرقی حصہ الگ کر دیا گیا۔ اس تمام عرصے میں ہنگامی تغیرات رونما آتے ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قومی فلاح کے اداروں کا مزاج تبدیل ہو گیا اور یہ با اقتدار طبقے کے ساتھ عملی تعاون اور اس کے ذاتی استحکام میں شریک ہو گئے۔ ں وفاداریوں کے برعکس مضمحل اور متزلزل سیاسی وفاداریوں کی صورت پیدا ہوئی۔ اس زبوں حالی کو مزید اضافہ عالمی انتشار اور دو بڑی عالمی طاقتوں سرد آویزش نے بھی کیا اور یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ تیسری دنیا کے بیشتر ترقی پذیر ممالک اس عالمی آویزش ہی کا شکار ہیں اور کسی ایک گروہ سے بگی ان کی بقا اور ارتقاء کی ضامن ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال سے پاکستان ابتدا میں ہی دوچار ہو گیا تھا اور قرض کی مے میسر آنے لگی تو یہ ساس بھی زائل ہو گیا کہ

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پاکستان کے گزشتہ چالیس سالوں کا تجزیہ کیجیئے تو وطنِ عزیز اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد کے ہندوستان سے مختلف نظر ں آتا۔ اورنگ زیب کی طرح قائدِ اعظم کو بھی اچھے جانشیں نہیں ملے۔ خود قائدِ اعظم کو احساس تھا کہ ان کی دونوں جیبیں کھوٹے سکوں سے بھری ہوئی ں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام اپنے وطن سے پیار کرتے ہیں اور اس کے لئے نقدِ جاں پیش کرنے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ گوناگوں ائل کے اسیر بھی ہیں اور ان کے حل کے لئے وہ سفارش اور رشوت کا سہارا لیتے ہیں اور پلاٹ، زمین اور وظیفے کے لئے ہر اقدام عمل میں لانے بائل ہو جاتے ہیں۔ دولت اس دور کی سب سے بڑی مشکل کشا ہے اور اس کا حصول اعلیٰ ترین نصب العین بن چکا ہے۔

اس معاشرتی اجمال کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آزادی کے بعد نہ صرف ہماری قومی اور معاشرتی زندگی تغیر آشنا ہوئی بلکہ اس کے ساتھ عصری تقاضوں کی نوعیت بھی تبدیل ہو گئی۔ زمانے کی اس نئی چاپ کو اس دور کے ادیب نے بھی سننے کی کوشش کی۔ اور شاعری اور ادب میں متعدد اقسام کے رجحانات کو فروغ دیا۔ لیکن بیسویں صدی کے نصف اوّل کے ادیب اور نصف آخر کے ادیب میں بنیادی طور پر یہ فرق وجود ہے کہ اوّل الذکر نے اجتماعی جذبہ پیدا کیا اور قومی تقاضوں کو فوقیت دی جب کہ مؤخر الذکر کی آواز میں اس کا ذاتی آہنگ زیادہ نمایاں ہے اور نئے عصری تقاضوں کی طرف پیش قدمی انفرادی اور ذاتی نوعیت کی ہے۔ اس اجمال کی روشنی میں سب سے پہلے یہ بات قابلِ ذکر ہے

کہ حصولِ آزادی کے بعد ادبا کے ایک طبقے میں پاکستان کے لئے محبت اور احسان مندی کا جذبہ مثبت صورت میں ابھرا اور آزادی کے استقبال میں ان کا والہانہ جذبہ یوں نمایاں ہوا۔

عجب تازگی چار سُو جی اُٹھی — دلِ مُردہ کی آرزو بھی اُٹھی
نکھر آیا کیا عالمِ رنگ و بُو — چمن موجِ گُل ہے افق سُرخرو
سحر کے تقاضے بدلنے لگے — امنگوں کے سانچے میں ڈھلنے لگے
نئی منزلوں کے ٹھکانے ملے — ہوا کے لبوں پر ترانے ملے

قیوم نظر (۱۹۴۸ء)

آنکھ جمتی نہیں لہرائے ہوئے قدموں پر — کسی نغمے کا تلاطم ہے کہ رفتار تری
رقص انگڑائیاں لیتا ہے تری باہوں میں — حیرت آثار ہے کیوں چشمِ فسوں بار تری

سیف الدین سیف (۱۹۴۸ء)

یاس کی بے رنگ مخروطی چٹانوں سے پرے
آس کی وادی کے پاس ــــ ناگہاں کوئی سوار
برق پا رخشِ جنوں کو جذبۂ کامل کی مہمیزیں لگاتا
نیند میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈیوں کے پیچ و خم پر مسکراتا
مضمحل خاموشیوں کو گدگداتا ــــ آگیا ــــ
قرمزی مشعل کو تھامے ہاتھ میں

مبارک احمد (۱۹۴۸ء)

رفتہ رفتہ اک نئی صورت نظر آنے لگی
اک نئی صورت، مگر کچھ نقش نامانوس ہیں
اور ہر لمحے سے، ہر آنسو سے ــــ قصرِ نیلگوں استادہ ہے
دُور ــــ اس کی چھت میں دو فانوس ہیں

میراجی (۱۹۴۸ء)

چُنے میں نے موجوں سے موتی، جواہر سے جیوتی، بہاروں سے راگ
لئے میں نے خوشبوؤں سے خوشبو کے توشے
الٹ کر نگاہوں سے راہوں کے گوشے
بڑھا میں، چلا میں، لئے ساتھ ساون کی پُروا، چناروں کی آگ
بہاروں کے راگ

یوسف ظفر (۱۹۴۸ء)

دوسری طرف جب توقعات اور نتائج میں تضاد پیدا ہوگیا تو ایک مخصوص سیاسی بصیرت کے شعرا نے مایوسی اور قنوطیت کو ہوا دینے کی کوشش کی اور اس قسم کی نظمیں پیش کیں۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

فیضؔ (۱۹۴۷ء)

سحر کی حسینہ ہے آلودۂ خوں ـــ تمہیں اس سے مطلب ؟
سحر کی حسینہ کے سینے میں پیوست ہیں تین خنجر ـــ تمہیں اس کا غم کیا ؟
تمہیں بھی سحر کی حسینہ کی حسرت ـــ سو وہ آ گئی ہے !

عارف عبدالمتین (۱۹۴۷ء)

تیری اور میری آرزوؤں کا مدفن ـــ یہ افسردہ لمحے
جو اک جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں تیری اور میری زندگی سے
تیرے اور میرے خوں سے شاداب ہونے پہ بھی جو شگفتہ نہیں ہیں
تیرا اور میرا خوں اکارت گیا ہے۔

احمد راہی (۱۹۴۸ء)

منتشر تتلیاں خیالوں کی ــ پیچ کھاتی ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح چرخ کے تمام نجوم ــ یک بیک اڑ چلیں خلاؤں میں
کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے ــ جن کی حدت سے بجھ رہے ہیں چمن
بُن رہے ہیں گلے سڑے پتے ــ کتنی جامد حقیقتوں کے کفن

نظم۔ آزادی کے بعد
احمد ندیم قاسمی (۱۹۴۸ء)

متذکرہ بالا قسم کی مبرم مایوسی نے خوف اور انتباہ کا لہجہ بھی پیدا کیا۔ تیسرا بڑا رجحان جو سامنے آیا اس میں فرد کو تحفظ فراہم کرنے کی روش نمایاں ہے۔ اس رجحان کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

تیرے ماتھے کی شکن صاف کہے دیتی ہے
آج طوفان کی زد پہ ہے سفینہ اپنا
آج پھر تیز ہے احساسِ غمِ ناداری

یوسف ظفر

اسمِ سبز باب کا ــ پُرفریب بن میں ہے
نقش اک شباب کا ــ سایۂ گہن میں ہے
اک پکارتی صدا ــ جبر کے گھن میں ہے

منیر نیازی

جنوں کے منازل پہ بیگانہ ہے — رہِ عشق میں فکرِ فرزانہ ہے
خزاں سے ہے خائف بہار آزما — قرار آشنا ہے، شرار آزما
قیوم نظر

منزلوں کا غم شکستِ آرزو سے کم نہیں
ہیں کئی معمار جن کا کوئی بھی عَلَم نہیں
دیوتا ہیں بے شمار ایک بھی صنم نہیں
شہزاد احمد

۱۹۶۵ء پاکستان کی تاریخ میں ایک موڑ بن کر سامنے آیا۔ اس سال ستمبر کی جنگ نے عصری تقاضوں میں ایک نئی اور ہنگامی تبدیلی پیدا کی۔ قوم بیرونی خطرے سے دوچار ہوئی تو ارضِ وطن ایک قیمتی اور مقدس اثاثہ نظر آنے لگی جس کے لئے نقدِ جاں پیش کرنا معمولی بات تصور کی گئی اور شعراء نے اس جذبے کو زندہ اور بیدار رکھنے کی کوشش کی۔ اس لمحۂ تابندہ کے نقوش اس دور کی شاعری میں محفوظ ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

صبح دم میں نے دیکھا تو ہر راستہ کرک کی مانند آباد تھا
راہ چلتے ہوئے لوگ مٹی کی عظمت کو محسوس کرنے لگے تھے
ایک ہی رات کی نیرگی وہموں کو بہا لے گئی تھی۔
شہزاد احمد

یہاں عقیدت کی گرم جوشی کے ساتھ آؤ
یہاں کی مٹی میں حریت کا جہاں نہاں ہے
زمیں کا یہ تابِ دار ٹکڑا ابد نشاں ہے
قیوم نظر

سنو سے ساکنانِ خطہ ہائے مشرق و مغرب
مرا یہ خطہ بھی اب فطرتِ جاں آفریں کا نور دیدہ ہے
عرش صدیقی

وہ لمحۂ شعور جسے جاں کنی کہیں — چہرے سے زندگی کی نقابیں اُلٹ گیا
شکیب جلالی

کانٹوں سے بھرے بَن میں رستے کی بنا ڈالی — دے دے کے لہو طرحِ نقشِ کفِ پا ڈالی
خورشید رضوی

قومی زندگی کا یہ تابندہ لمحہ جس میں خطۂ پاک کی محبت کا جذبہ بے اختیارانہ جاگ اٹھا تھا کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ جنگ کے بادل چھٹتے ہی عصری تقاضوں میں بھی ہمہ جہت تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوگئیں۔ مارشل لا کے مختلف اَدوار میں عصرِ فراموشی کا رویہ پیدا ہوا۔ بے یقینی کی کیفیت نے لب بستگی اور اخفا کو فروغ دیا۔ خاموشی کو ضبطِ عشق کا نام دینے کی سعی کی گئی۔ چنانچہ شاعری میں علامتوں کا نیا نظام در آیا اور افسانے میں سے حقیقی کردار غائب ہوگئے۔ تجرید نے ہیولوں کی اور عصری آگہی نے استعاراتی اظہار کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ خارج کے مشاہدے کو ایسے علائم و رموز میں پیش کیا جانے لگا جو حقیقت کی پردہ پوشی کر دیتے تھے۔

گونگے شہر کے اس مرقد میں ہر شے ڈوب گئی
اپنے ہی سائے میں ڈر کر خود میں سمٹ گئی
سونی منڈیریں، چُپ دیواریں، دروازوں پر قفل
سناٹے کے سیل رواں میں، ہر شے ڈوب گئی
دل کہتا ہے کاش کہیں سے پنچھی آ جائے
چاند کا کنگن کالے بھیانک پربت پر گر جائے — وزیر آغا

اور غزل میں اس کی صورت پذیری یوں ہوئی :

وہ آندھیاں چلیں کہ شجر کانپنے لگے	لگتی ہے صحنِ گل کی ہر اک شے ڈری ڈری	سلیم شاہد
سر چھپائیں گے کہاں، سر پہ عذاب آنے کو ہے	اب تو ہر ٹیلہ یہاں کا زیرِ آب آنے کو ہے	مرتضیٰ برلاس
اپنا گھر بھی کھول کر تاراج کرنا تھا ہمیں	اپنے ہاتھوں خود ہمیں مسمار ہونا تھا ہوئے	محسن احسان
اندر سے رہ کسی نے دکھائی غنیم کو	پھر میں تھا اور سامنے گرتا ہوا حصار	خالد اقبال یاسر
یہ کیا ہوا کہ اک آکاش بیل کا سایہ	بھرے بھرے سے ہرے گلشنوں میں پھیل گیا	انور مسعود
بساطِ وقت کہ سیتی میں بادشاہ بھی	گھرا ہوا ہوں کئی طرف سے پیادوں میں	بشیر سیفی
تم مر گئے، حوصلہ تمہارا	زندہ ہوں، یہ میرا حوصلہ ہے	عبید اللہ علیم
اب اپنے حال پہ ہم دھیان ہی نہیں دیتے	نہ جانے بے خبری ہے کہ آگہی، کیا ہے	انور شعور
مکینوں پر بھی لازم ہے مکانوں کی نگہ داری	جو کڑیاں چھت کی ٹوٹیں، شکوۂ بنیاد مت کیجے	مرتضیٰ برلاس

متذکرہ بالا اجمال سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو ادب نے عصری تقاضوں سے اغماض کبھی نہیں برتا۔ اس زبان کے شعراء نے عصری آگہی کو اپنی تخلیقات کی بُنت میں نہ صرف شامل کیا بلکہ اپنے عہد کی مزاج سازی میں بھی حصہ لیا۔ ادب کا عمل بالواسطہ ہے اور اس بالواسطہ عمل میں بھی معاشرے کی فلاح، ارتقا، بہبود اور اصلاح ادیب کا مطمحِ نظر ہوتی ہے۔ چنانچہ ادیب پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ جس بلند نصب العین یا آدرش کی تبلیغ کر رہا ہے اس پر خود بھی عمل کرے اور نہ صرف اچھا ادیب ثابت ہو بلکہ ایک عظیم انسان بھی ثابت ہو تاکہ معاشرے میں عام شہری کی حیثیت میں بھی اسے باوقار مقام حاصل ہو سکے۔ یہ تقاضا محض عصری ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق ادبی اور تہذیبی معاشرے سے کُل ہے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دور کے بعض بڑے ادیبوں کو جب تنقید کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اپنا توازن اور اعتدال برقرار نہ رکھ سکے اور ادیب کے منصب کو تج کر غیر ادبی ذرائع استعمال کرنے اور منفی سیاست کے حربے استعمال کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادیبوں کی پوری برادری کو تضحیک اور تشنیع کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ صورتِ حال اب بھی جاری ہے اور میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں ؟



قمر جمیل

شاعری ساختیت کے نقطۂ نظر سے

نئی تخلیق کو سمجھنے کا ایک راستہ لسانیات ہے۔ ماہرین نے بھی فراہم کیا ہے۔ وہ ہر نئے ادب پارے کو زبان اور اُس کی روایت کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال اس سے آج ہم انکار نہیں کر سکتے کہ ساختیت کے ماننے والوں نے نئی تخلیقات کو سمجھنے میں ہمیں ایک نیا زاویہ ضرور مہیا کیا ہے اور نئی تنقید کو ایسی آگہی مہیا کی ہے جس کے بغیر ہم روایت کا بھی صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔

ہمارے عہد میں شعری دانش کی بنیاد مابعد الطبیعاتی حقیقتوں تک پہنچ گئی ہے۔ انسان کے لئے اس صداقت میں جسے وہ صداقت سمجھ کر قبول کرتا ہے اور اس صداقت میں جو وہ خود تخلیق کرتا ہے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

اس صورتِ حال میں صناعی یا اسٹرکچر بنانے کا عمل جو بنیادی طور پر ایک شعری عمل ہے اس کا مطالعہ بے حد اہم ہو جاتا ہے۔

یہ دوہرا عمل ہے اور پیچیدہ بھی۔

انسان نے قدیم ترین زمانے میں بھی دیومالا تخلیق کی تھی۔ یہ دیومالا کہانی کے علاوہ اسٹرکچر بھی ہے، مذہبی علامتوں کا سلسلہ بھی ہے اور اس عہد کی سیاسی زندگی کا آئینہ بھی۔ ایتھنز کے رہنے والے ساطر (SATYR) کہتے تھے اس دیوتا کو جس کے کان اور دُم گھوڑے کی اور چہرہ انسان کا ہوتا تھا۔ یونان میں ایک دیوی سائرن (SIREN) بھی تھی جو آدھی عورت اور آدھی پرندہ تھی۔ ایسا پرندہ جو اپنے دلکش نغموں سے ملاحوں کو سلا دیتا تھا اور ان خوابیدہ ملاحوں کے سر قلم کر دیئے جاتے تھے۔ یونان کے ایک ہیرو یولیسس (ULYSSES) اور اس کے ساتھیوں کو ایک دیوی سرسی (CIRCI) اپنے نغمے سنا کر بھیڑوں میں تبدیل کر دیتی تھی۔ اور اگر ان کہانیوں میں اُس دور کی سیاسی زندگی جھلکتی ہے تو اس کے معانی یہ ہوئے کہ جہاں گرد قسم کے کردار، ملّاح اور اجنبی مسافر شکست خوردہ سپاہیوں کی علامت ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کہانیوں کی بنیاد عمومی نوعیت کے سچے تجربات پر رکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہانیاں اس زمانے کے انسانوں کو نفسیاتی طور پر مطمئن بھی کر سکتی تھیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان دیومالائی کہانیوں میں اس عہد کے انسان کی شعری دانش کا اظہار ہوا ہے۔ مظاہر کائنات اور تخلیقِ کائنات کا شاعرانہ جواز بھی ان کہانیوں میں پیش کیا گیا ہے۔

خود انسان ان دیومالائی کہانیوں کو تخلیق کرتا ہے اور پھر خود انسان کی تخلیق میں یہی دیومالائی کہانیاں حصہ لیتی ہیں۔

انسان کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی شعری دانش ہے یعنی وہ صلاحیت جو دیومالا تخلیق کرتی ہے، استعارے کو جنم دیتی ہے۔ حقیقت سے انسان براہِ راست نہیں ملتا بلکہ اپنے اور حقیقت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ بنیادی طور پر یہی وہ صلاحیت ہے جسے

ہم شعری صلاحیت کہتے ہیں۔

یہی شعری صلاحیت انسانی معاشرے کی ترتیب و تنظیم کا کام بھی کرتی ہے۔ اس ذہنی عمل کا اظہار اسٹرکچر کے عمل میں ہوتا ہے۔ یہی ذہنی عمل خود انسانی فطرت کو اس اسٹرکچر کے مطابق ڈھالتا رہتا ہے۔ اسٹرکچر بنانے کا یہ عمل ادارے بھی تخلیق کرتا ہے۔ انسان نہ صرف اپنے سماجی اداروں کی تشکیل کرتا ہے بلکہ یہ سماجی ادارے بعد میں خود انسان کی تشکیل کرتے ہیں یعنی وہ انسان جو ادارے تخلیق کرتا ہے وہی انسانیت کے تصور کو جنم بھی دیتا ہے۔ چنانچہ انسانیت کا تصور انہی سماجی اداروں کی تشکیل کا لازمی نتیجہ ہے۔ پہلے آدمی اپنی دنیا تخلیق کرتا ہے، پھر اپنی بنائی ہوئی دنیا کا عادی ہوتا ہے اور آخر میں اسے فطری سمجھنے لگتا ہے۔

تمام آفاقی اداروں کی تشکیل میں یہی ذہنی عمل حصہ لیتا ہے۔ یہ عمل آفاقی ہوتا ہے اور تمام قوموں میں مشترک۔ ہر اسٹرکچر کے لئے تین باتیں ضروری ہیں۔ پہلی یہ کہ اسٹرکچر اپنی جگہ جامع اور مکمل ہونا چاہئے۔ جامع اور مکمل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے عناصر آپس میں ہم آہنگ ہوں۔ دوسری یہ کہ اسٹرکچر میں قلب ماہیت کی صلاحیت موجود ہو اور تیسری یہ کہ اسٹرکچر اپنے آپ کو بدل بھی سکتا ہو۔ ہاں مختلف ٹکڑوں یا حصوں کے مجموعہ کو اسٹرکچر نہیں کہتے اور نہ کسی اسٹرکچر کے حصے آزاد یا خود مختار ہوتے ہیں۔ اسٹرکچر کے ہر حصے میں ایسا قانون جاری رہتا ہے جو اس کے مختلف ٹکڑوں کی نوعیت یا فطرت کو متعین کرتا ہے۔ یہ اسٹرکچر ہمیشہ تغیر پذیر رہتا ہے، ساکت کبھی نہیں ہوتا۔ اسٹرکچر میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نئے مادے کو قبول کرکے اپنی ساخت میں ڈھالتا رہے۔

زبان بھی انسان کا تخلیق کیا ہوا ایک اہم اور بنیادی اسٹرکچر ہے۔ زبان میں لفظوں اور جملوں کو ڈھالنے کی حیرت ناک صلاحیت ہوتی ہے، زبان کا اسٹرکچر اپنی تشکیل آپ کرتا رہتا ہے، اپنے قانون آپ بناتا رہتا ہے، اسے باہر سے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح اسٹرکچر ایک طرف خود کو بھی مکمل کرتا رہتا ہے اور دوسری طرف دوسرے ہر اسٹرکچر سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھتا ہے اور ممتاز۔ جملوں کی تشکیل زبان کے اپنے اندرونی اور خود مکتفی قوانین کی بنیاد پر ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً کسی لفظ کو لیجئے، اس کے استعمال کا انحصار اس کی اندرونی ساخت اور مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے۔ شے کی حیثیت پر اس کا انحصار نہیں ہوتا۔

اشیا خود مختار طور سے موجود نہیں ہیں بلکہ خود دیکھنے والا ہر چیز کے ادراک میں شامل ہوتا ہے۔ دیکھنے والے اور اس چیز کے درمیان جسے وہ دیکھ رہا ہے جو تعلق ہے وہ بہت اہم ہے۔ اہم ہی نہیں ہے بلکہ یہ تعلق خود ایک حقیقت ہے۔ یعنی چیزوں کی حقیقت اشیا میں نہیں ہوتی بلکہ ان رشتوں میں ہوتی ہے جو انسان تخلیق کرتا ہے اور چیزوں کو ان رشتوں کے درمیان رکھ کر دیکھتا ہے۔

زبان ایک نظام کی حیثیت سے ہر وقت مکمل رہتی ہے چاہے چند لمحے پہلے اس میں کوئی تبدیلی ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔ ساشیور نے زبان کے دو تصور پیش کئے تھے۔ ایک لانگ (LANGUE) یعنی زبان اور دوسرے پیرول (PAROLE) یعنی بولی، اسپیچ، تقریر یا کوئی تحریر۔ زبان اور بولی یا اسپیچ کا آپس میں وہی تعلق ہوتا ہے جو شطرنج کے قوانین اور شطرنج کے کھیل میں ہوتا ہے۔ اشیا اور لفظوں کے درمیان رابطہ منطقی یا فطری نہیں ہوتا بلکہ بے قاعدہ ہوتا ہے۔ نشانیوں کے بے قاعدہ ہونے سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ زبان آسانی سے تبدیل نہیں ہوتی۔ چوں کہ لفظوں کا وجود عقلی یا منطقی نہیں ہوتا اس لئے ان لفظوں کو عقل یا منطق سے بدلا بھی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ کسی ایک لفظ کی بجائے ہم دوسرا لفظ رائج بھی کر دیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ زبان کا اسٹرکچر لفظوں کو ان کے معانی بھی عطا کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی دو زبانیں ایسی نہیں ہیں جو کسی سماجی حقیقت کی یکساں نمائندگی کرتی ہوں۔ دراصل مختلف معاشرے مختلف قسم کی دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ہر معاشرے کی مخصوص لسانی عادتیں مختلف انداز سے سوچنے کا رجحان پیدا کر دیتی ہیں۔ ہر شخص اپنے کلچر کے مخصوص انداز سے حقیقت کو گرفت میں لاتا ہے۔ چنانچہ حقیقت کو مختلف کلچر کے لوگ مختلف انداز میں محسوس کرتے ہیں۔ کلچر بھی زبان کے ذریعے

[redacted]

حقیقت تک پہنچتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ غلط نہیں ہوگا کہ کلچر خود ایک زبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ رُوس کے ہیئت پرستوں پر ایک زمانہ ایسا گزرا تھا کہ انہیں بھی اسٹرکچر میں دلچسپی ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ شکلوسکی (SCHKLOVSKY) کا خیال تھا کہ آرٹ ہمیشہ زندگی سے آزاد ہوتا ہے اور آرٹ میں کبھی اس پرچم کے رنگ کی جھلک نظر نہیں آتی جو شہر کی فصیل پر لہراتا رہتا ہے یعنی آرٹ کی تشریح صرف آرٹ ہی کے قانون سے ممکن ہے۔

ایمج، بحر، آہنگ اور قافیہ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ لفظوں کو متحیر کرنے والی کیفیت کا حامل بنا دیں یعنی شاعری سننے والے کے لئے حیرت انگیز ہو۔ شاعری کا کام یہ ہے کہ وہ روزمرّہ کے ادراک کے طریقوں اور اس ROUTINE سے جو ذہنی اور فکری عادتیں پیدا ہوتی ہیں انہیں توڑ دے۔ ذہنی اور فکری عادتوں میں پھنس کر انسان زندگی کو دیکھنا اور محسوس کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ شاعری اس ROUTINE کو توڑ دیتی ہے بلکہ بعض اوقات اسے منقلب کر دیتی ہے۔ مانوس چیزوں کو نامانوس عالم میں دکھانے کا نام شاعری ہے۔ دوسرے لفظوں میں شاعری چیزوں کی شکل بدل کر رکھ دیتی ہے اور ہمارے اندر کائنات کا ایک معصوم وژن پیدا ہو جاتا ہے شاعری روایتی اندازِ فکر اور عمومی ردِ عمل کو ختم کر دیتی ہے اور انسان میں احساس اور خیال کی سطح پر ایک شدید بیداری پیدا کر دیتی ہے۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری ہمارے رویّہ کی دوبارہ تشکیل کرتی ہے۔ اس طرح شاعری سے دلچسپی رکھنے والے لوگ دنیا کے بارے میں بے حس رہنے کی بجائے دنیا کو ایک نئے سرے سے دیکھنا اور محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ رُوس کے ان ہیئت پرستوں میں جن میں شلوسکی (SCHKLOVSKY) بھی شامل تھا یہ اندازِ فکر مقبول تھا کہ آرٹ کا مقصد ہی یہ ہے کہ آرٹ اپنے دیکھنے والوں میں یہ احساس بیدار کر دے کہ جو ادارے اور سماجی فارمولے ہمیں موروثی طور پر ملے ہیں وہ فطری نہیں ہیں، ابدی نہیں ہیں، انہیں بدلا جا سکتا ہے۔

روزمرّہ کی زبان کے مقابلے میں ادبی زبان نہ صرف چیزوں کو عجیب بنا دیتی ہے بلکہ خود بھی عجیب اور اجنبی رُوپ میں ظاہر ہوتی ہے عجیب بنا دینے کا یہ عمل مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے اور ادبیت تخلیق کرتا ہے۔ لیکن ادبی ہیئت پرستوں کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ شاعری کا کوئی عملی مقصد ہوتا ہی نہیں۔ کیوں کہ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ شاعری انسانی شعور کو روشن ضرور کرتی ہے۔

شاعری میں لفظ جب حوالے سے آزاد ہو جاتے ہیں تو ان میں بے شمار حوالوں سے منسلک ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نامانوس بنانے کے لئے پہلے مانوس چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ناول بھی اپنی آمد کا اعلان اس وقت کرتا ہے جب وہ بظاہر کسی اور چیز کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہوتا ہے یعنی صرف شاعری ہی نہیں آرٹ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ مانوس چیزوں کو نامانوس بنا کر پیش کرے۔ جدید لسانیات کے ماہرین مثلاً جیکسن (JACKSON) کا خیال ہے کہ شاعری روزمرّہ کی زبان کو جان بوجھ کر مسخ کرنے اور تبدیل کرنے کا نام ہے۔

زبان کی طرح ادب بھی ایک اسٹرکچر ہے جو اپنی جگہ مکمل بھی ہے، اپنی ہیئت بدل بھی سکتا ہے، خودمختار بھی ہے اور اپنے راستے خود متعین بھی کرتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہر زبان کا ادب باطنی طور پر ہم آہنگ ہوتا ہے۔ فارم اور نئے اسٹائل سامنے ضرور آتے ہیں مگر پرانے اُسلوب اور فارم سے بغاوت کے طور پر نہیں اور نہ ان کی ضد کے طور پر اُتنا جتنا کہ دوبارہ تشکیل کے طور پر، انہی عناصر کی تشکیلِ نو کے طور پر۔ ادب ہونے کا تعلق اس کے اسٹرکچر سے ہے یعنی اپنے عہد کے غیر ادب سے اس کی ضد ہونے میں۔ جہاں تک ناول کا تعلق ہے پلاٹ کے ذریعے کہانی کو عجیب بنا دیا جاتا ہے۔ یعنی اس کی شکل بدل دی جاتی ہے، اُسے نامانوس بنا دیا جاتا ہے۔ جس طرح غزل میں بحر، ردیف، قافیے اور نثری نظم میں آہنگ فارم کا ایک زندہ اور نامیاتی حصّہ ہوتا ہے اور وہی ناول کی تشکیل کرتا ہے۔
زبان کا شاعرانہ یا جمالیاتی استعمال وہ ہے جس میں زبان اپنے نارمل استعمال سے زیادہ دور ہو جاتی ہے۔ جب اظہار

اس پر حاوی ہو جاتا ہے، جب زبان صرف ابلاغ کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ بیان یا زبان کو بجائے خود اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ نثر اور شاعری میں بنیادی فرق کیا ہے، تو اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہمیں زبان کا وجود دو جہتوں میں نظر آتا ہے۔ ایک تلازماتی جہت یعنی SYNTAGMATIC DIMENSION اور دوسری ASSOCIATIVE DIMENSION۔ تلازماتی جہت سے استعارہ پیدا ہوتا ہے مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ سڑک پر کار رینگ رہی ہے تو یہ استعارہ ہے۔ اور اگر جزو سے کُل مراد لی جائے تو اسے مجازِ مرسل کہتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ ۱۰۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ سے برطانیہ کو حکم دیا گیا ہے تو یہ مجازِ مرسل ہے اور نثر ہے۔ مجازِ مرسل نثر کی اور استعارہ شاعری کی خصوصیت ہے اور ان دونوں کا تعلق ایک بڑی روایت یعنی ادب سے ہوتا ہے۔ ادب زبان کی ایک بڑی روایت LANGUE سے ظہور کرتا ہے۔ یہ لانگ (LANGUE) یہ زبان شطرنج کے کھیل کے قواعد کی طرح ہوتی ہے۔ اس کی قواعد لی ہیں۔ ہر شطرنج کا کھیل جاری رہتا ہے اور اس طرح ہر نئی تخلیق شطرنج کے ایک نئے کھیل کی طرح ہوتی ہے مگر یہ کھیل صرف کھیل نہیں ہوتا۔



مجنوں گورکھپوری

دشتِ زرفشاں

صبا اکبرآبادی میرے بہت قدیم اور مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ میری اور ان کی دوستی اور تعلق پچاس برس سے زیادہ کا ہے۔ اب جب کبھی میں صبا اکبرآبادی کا نام سنتا ہوں تو مجھے شاعروں کے ایک گروپ کا خیال آتا ہے جو سب اکبرآباد کے ہیں۔ وہ زیادہ تر اکبرآباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ صبا میں اکبرآبادیت پوری طرح رچی بسی ہے۔ اکبرآبادیت سے میری مراد وہ خصوصیات ہیں جو غالب اکبرآباد سے دہلی لے کر گئے۔

میں ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ جب کبھی آگرہ جاتا تو ہمیشہ میکش اکبرآبادی کے یہاں ٹھہرتا۔ یہاں میرے دوستوں میں مخمور، صبا، امام اور دوسرے کئی اہم لوگ شامل تھے۔ پورے اکبرآباد میں صبا اکبرآبادی کے نام کا شہرہ تھا۔ ان میں ایک دیئے رہنے والی کیفیت بھی تھی لیکن مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی آگرہ گیا ہوں اور صبا مجھ سے نہ ملے ہوں۔ ہم لوگوں نے بہت ...

صبا کا کلام جب شروع شروع میں منظرِ عام پر آرہا تھا۔ اور لوگوں کی زبان پر چرچا تھا تو فراق بھی تہِ دل سے ... میں ایک بات بھی کہ اگر کوئی انہیں چڑاتا تو وہ آستین چڑھا کر مقابلے پر آجاتے تھے اور نہ جانے کیا کیا کرتے تھے لیکن عام حالات میں نہایت سنجیدہ اور سنکر و تامل سے فیصلہ کرنے والے شخص تھے۔ میرا خیال ہے کہ لکھنے کی نوبت تو شاید نہیں آئی لیکن جب ... تو وہ صبا کی بڑائی کو تہِ دل سے مانتے تھے۔ مجھے فراق اور صبا میں جو قدرِ مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ فراق نے اپنی انگریزیت اور دنیا بھر کی شاعری سے، جو انہوں نے پڑھی اور اپنے آپ کو ENRICH کیا اور صبا نے زیادہ تر کلاسیکل اور مشرقی شاعری کو ... کیا۔ اس کے باوجود ایک دور کی روح دونوں میں مشترک ہے ـــــ THE SOUL OF THE AGE IS THE SAME دونوں کا فرق ان دونوں کا اپنا پن یا اپنی اپنی انفرادیت ہے۔ ایک ایسا اپنا پن جو شاعر کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا ... اس ذات کا تشخص قائم ہوتا ہے۔

جب میں نے صبا اکبرآبادی کی کتاب "دستِ زرفشاں" پڑھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس بات پر سب ہی متفق ہیں کہ رباعی کی ... موسیقیت قائم رکھنا بڑا مشکل کام ہے اور ان ترجموں کی پہلی امتیازی بات تو یہ ہے کہ ان ترجموں میں بے حد موسیقیت ہے۔ دوسری بات ... فارسی کا نہ صرف لحاظ رکھا گیا ہے اور اصل کی خوبی بھی قائم رہی ہے بلکہ ترجمے کے باوصف ان رباعیات کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ ... رباعیات میں ان کا فن بھی نظر آتا ہے کہ اگر فارسی رباعی کے ساتھ اردو کو دیکھیں تو بظاہر تو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہوا ہے لیکن اس رباعی کو صبا صاحب نے

اپنا کر لیا ہے۔ یعنی ترجمہ کو پڑھ کر آپ کو یہ محسوس ہو گا کہ یہ صبا صاحب کی اپنی تخلیق ہے۔ یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ یہ خیام کی رباعی کا ترجمہ ہے ترجمہ کی خوبی بھی یہی ہے کہ اصل کی طرف ذہن تو جائے لیکن شاعر کا اپنا پن بھی اس میں شامل ہو۔ جب میں صبا اکبر آبادی کے اپنے پن کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ہوتی ہے صبا اکبر آبادی کا وہ مخصوص اندازِ بیان جو رباعی کے مصرعوں میں غزل کی لطافت اور شیرینی پیدا کرتا ہے۔

اس رباعی کو دیکھیں :

خیام اگرچہ خرگہہ چرخ کبود ۔۔۔ دو خیمہ دو در بستہ در گفت و شنود
چوں شکل حباب بادہ در جام وجود ۔۔۔ ساقیٔ ازل ہزار خیام نمود

صبا صاحب نے "ساقیٔ ازل ہزار خیام نمود" کا ترجمہ "خیام سے لاکھوں ہوئے ساقی کو پسند" کہہ کر اس کا بے مثل ترجمہ کیا ہے کیوں کہ یہاں ساقی بمعنیٰ خدا مُراد ہے۔ ساقیٔ ازل میں نثریت آگئی ہے اور صبا صاحب نے صرف ساقی لکھ کر ایک پردہ رکھ لیا ہے اور زیادہ شعریت پیدا کی ہے جو مجھے بہت زیادہ پسند آئی۔ بہت سی جگہ انہوں نے قدیم محاوروں کو اتنی خوش اسلوبی سے برتا ہے کہ جیسے زندہ کر دیا ہے۔

مے پی کہ غمِ کثرت و قلت مٹ جائے ۔۔۔ اندیشۂ قوم و نسل و ملت مٹ جائے
پرہیز نہ کر، یہ کیمیا ایسی ہے ۔۔۔ اک گھونٹ پئیں، ہزار علت مٹ جائے

"علت" کا لفظ اتنی بلاغت کے ساتھ یا تو ان کے وہاں ہے یا مولانا رومؒ کے وہاں سے

ہر چہ گیری علتی علت شود ۔۔۔ کفر گیرد حاصل ملت شود

اس طرح صبا صاحب کے ترجموں کو دیکھیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ انہوں نے ترجمہ کیا ہے لیکن فارسی کی عظمت اور اوّلیت کو بھی اُردو میں بھرپور طریح سے قائم رکھا ہے۔ اور اپنی انفرادیت بھی شامل کر کے ترجمے میں بھی ذاتی تخلیق کی طرح پوری ندرت اور انفرادیت پیدا کی ہے۔ اور ان رباعیات کو پڑھنے سے یہ بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ خیال کسی اور کا ہے بلکہ یہ بالکل ORIGINAL معلوم ہوتی ہیں۔ اصل GENIUS وہ ہوتا ہے جو مواد جہاں سے چاہے لے لیکن اس میں اپنے ذاتی تجربے کی رُوح بھر دے۔ صبا اکبر آبادی نے ان ترجموں میں یہ کام بہ حسن و خوبی کیا ہے۔ صبا اکبر آبادی بنیادی طور پر چوں کہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی منزل کو کامیابی سے سر کرنا ہی کسی شاعر کی پہچان ہے۔ صبا اکبر آبادی کی غزل میں ہمیں ان کی شخصیت، تجربے اور زمانے کی رُوح بھری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور غزل کے حوالے سے صبا کی شخصیت کو دیکھیں تو تہذیب کے تمام عناصر صبا کی ذات میں مجتمع نظر آئیں گے۔ صبا اکبر آبادی کی شاعری میں تغزل کے ساتھ خوبصورت زبان اور تازگی بھی ملتی ہے، عصرِ موجود کا شعور بھی اور مستقبل کا امکان بھی۔ یعنی اگر یہ کہا جائے تو شاید میرا بیان مکمل ہو کر صبا صاحب کی شخصیت INFINITE PAST لا متناہی ماضی کی رُوح کو لئے ہوئے اور سب کی خوبیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے اور سموئے ہوئے، اپنے دور کی خصوصیت اور اپنے دَور کی رُوح کو بھی سمیٹے ہوئے اور سب کو ایک آہنگ بنائے ہوئے ہے یعنی HARMONY بنائے ہوئے ہے ایسی HARMONY یا آہنگ جس سے کائنات کا ڈھانچا تیار ہوا ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے جو محض کسب سے نہیں ہوتا۔



ڈاکٹر حنیف فوق

کیمیا گر

اُردو میں حکایتوں اور داستانوں سے لے کر افسانوں اور ناولوں تک کا سفر دلچسپ بھی ہے اور بدلتے ہوئے ادبی تصورات کی آئینہ داری بھی کرتا ہے۔ اس میں حقیقت اور تخیل کے کتنے ہی مدھم اور شوخ رنگوں کی جلوہ آرائی تو ملتی ہی ہے لیکن ان دونوں کے امتزاج کے مختلف تناسبات سے ادبی صورتوں میں اختلافات و امتیازات بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ نذیر احمد اور پریم چند سے حقیقت پرستی کی جو روایت استوار ہوئی تھی، اُسے شوکت صدیقی نے نئے سماجی حالات کا شعور بخشا ہے۔ دیکھا جائے تو فسانۂ آزاد کا تہذیبی پس منظر اور کرداری اختراعات ہوں یا امراؤ جان ادا کی بے لاگ مرقع کشی دونوں میں حقیقت اور تخیل کی مختلف مناسبتیں ملتی ہیں۔ کہیں حقیقت کا عنصر غالب ہے اور کہیں خیال نے بزم سجائی ہے۔ مفر دونوں سے نہیں۔ پھر حقیقت اور تخیل کے تناسب امتزاج کی تشکیل میں لکھنے والے کے فنی تصورات کا بڑا دخل ہے۔ چنانچہ شوکت صدیقی نے حقیقت نگاری کے راستے پر آگے بڑھتے ہوئے اپنے فنی تصورات ہی سے روشنی پائی ہے۔ یہ فنی تصورات زندگی کے مشاہدے سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے انسانی افکار کی تحسین اور غیر انسانی اقتدار کی تردید کو اس کی ارتقائی منزلوں کے نشانات جانتے ہیں۔ چنانچہ شوکت صدیقی کے افسانے نہ خیال سے خالی ہیں اور نہ حقیقت سے دُور۔ ان کے افسانوں میں حالات کی نامطلوب قباحت اور کرداروں کے ناپسندیدہ انحراف کے ساتھ ساتھ انسانی بینش و بضاعت کی روشن فکری بھی ملتی ہے۔ اس تصور اور حقیقت کے امتزاج نے زندگی کی وسیع شاہراہوں اور تنگ گلیوں میں انسان کے اختیار و بے اختیاری کو جس انداز سے دیکھا اور دکھایا ہے، اسی کو شوکت صدیقی کا فن کہا جا سکتا ہے۔

شوکت صدیقی کے فنی تصور میں ہیئتِ اجتماعی اور ہیئتِ افسانہ دونوں کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کا افسانہ افراد کے ذہنی علائم کو نہیں ان کے سماجی علائق کو پیش کرتا ہے۔ اسی طرح وہ افسانوی ہیئت کی صورت نمائی کرتا ہے، بے صورتی کو اپنا اسلوب نہیں بناتا۔ شوکت صدیقی کے افسانے معاشرت و تمدن کے جغرافیہ کو سماجی نظام کے تاریخی شعور کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کا افسانہ ماجرائے افسانہ کی روداد سے منسلک ابتدا، وسط اور اختتام کی منزلوں سے گزرتا ہوا ایک تراشیدہ صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ ان کے کرداروں کی سرگشتگی و سرگردانی بھی اپنے عہد کی سرگزشت بن جاتی ہے۔ وہ اپنے عہد کی سماجی صورتِ حال کو تو پیش کرتے ہیں لیکن اس کو پیش کرتے ہوئے افسانوی ہیئت کی تشکیل سازی سے غافل نہیں ہوتے۔ چنانچہ جہاں ان کا افسانہ ہیئتِ اجتماعی کے شعور کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہاں اس میں بیانِ واقعات کا جو انداز ملتا ہے، وہ زندگی کے ایک ماجرائی جزو کو تفصیل، ترتیب، تنظیم اور تشکیل کی مختلف منزلوں سے گزارتے ہوئے سرانجامی تفہیم تک

لے جاتا ہے۔ اسے بندگی تک نہیں پہنچاتا۔ یہ افسانے لاطائل خیال سازی، لاخیر فیہ لفاظی اور لایعقلانہ صورت پرستی سے دور ہیں ان میں عقلیت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ عقلیت خوابوں کی تکریم سے بے نیاز تو نہیں لیکن اس میں حقیقت کی تلخی و ترشی کا رنگ غالب ہے۔ اسی طرح ان افسانوں کی فنی ہیئت میں ناہنجار صورت گری اور ناکارہ صورت پرستی نہیں ملتی بلکہ ادراکِ حقیقت کی ترکیب و ترسیل پر توجہ دی گئی ہے۔ البتہ حسن و ملاحت سے زیادہ ان افسانوں میں ہیبت و ہیجان کے عناصر گوندھے گئے ہیں لیکن یہ عناصر ایک نیا فنی نشان بننے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صورت میں خیر و جمال کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔

شوکت صدیقی کا فن اپنے عہد کے جس شعور کا احاطہ کرتا ہے وہ اپنے گرد و پیش میں خوبی کو سرنگوں اور خرابی کو گردن فرازہ پاتا ہے اس فنی امکان ہیں، ایسے سے دوچار ہیں اس میں عظمت کے نقوش بھی مٹتے جا رہے ہیں۔ اور انسانیت کی شکست و ریخت کے اس سانحے کے عمل میں تکمیل کے بجائے تناقص کے آثار نمایاں ہیں۔ کل انسان اپنی شکستوں کے درمیان بھی اپنی بڑائی کا اثبات کرسکتا تھا۔ لیکن آج خود بڑائی شکستگی سے دوچار ہے۔ شوکت صدیقی کے افسانے جو رومان پرستی اور سستی جذباتیت سے دور ہیں اپنے عصر کی اس صورت حال کو فنی آگہی کے نئے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے کرداروں کا غیر متوقع عمل، جس میں خوبی و خرابی دونوں کے پہلو نکلتے ہیں عظمت کی جگہ انسانی بے چارگی کی دلالت کرتا ہے۔ لیکن اپنی بے چارگی اور نتیجہ کے اعتبار سے شاید اپنی بے مصرفی کے باوجود اس غیر متوقع عمل میں انسانیت کے اوصاف ملتے ہیں۔ اور خیر و شر کی یکجائی ہی اسے بعض اوقات زیادہ قابلِ قبول بنا لیتی ہے اور وہ جوہر توسیع عطا کرتی ہے جو بڑائی سے مختلف ہے لیکن جس سے انسانی اعمال کی مختلف سمتوں کا احساس ہوتا ہے۔ شوکت صدیقی کے افسانوں میں کرداروں کا یہ غیر متوقع عمل نہ بذاتِ خود خیر انگیز ہے اور نہ تزکیاتی طور پر الم انگیز۔ لیکن خیر و جمال کا سراغ ضرور دیتا ہے۔ اس عمل کی توجیہ نہ خیر کے ضابطۂ اخلاق سے ہوتی ہے اور نہ اس کے نتیجے میں حزن کو حسن کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ کردار اسی طرح بدی سے بدصورتی اور دہشت کا اسیر رہتا ہے لیکن احوال و مقامات میں تبدیلی کا وہ احساس ضرور ہونے لگتا ہے جو خیر و جمال کے سفر کا آغاز ہے۔ شوکت صدیقی کے افسانوں میں کردار کا غیر متوقع عمل اور رونما ہونے والی صورت حال انسانی اختیار و بے اختیاری کی ایک نئی سمت کا ادراک ہے اور اسی کو شوکت صدیقی کے تصورِ افسانہ نگاری کا فنی نکتہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

شوکت صدیقی نے معروضی حقیقت سے سروکار رکھا ہے لیکن ان کے فن میں یہ معروضی حقیقت نئی صورتوں میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں سے نہیں جو سنگ کو تراش کر اندر سے چھپی ہوئی ہیئت کو برآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ وہ حقیقت کی چٹانوں کو اپنی ضربوں سے چکنا چور کرکے اسے نئی شکل و صورت دیتے ہیں۔ ان کی افسانوی منطق اجزا کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں زندگی کی شیرینی سے زیادہ اس کی تلخی، اس کی مسرت سے زیادہ اس کے کرب اور اس کے حسن سے زیادہ اس کی بدصورتی کو پیش کرتی ہے۔ وہ ایک کج رو معاشرے میں انسانی اعمال کی مختلف کج رویوں کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ شوکت صدیقی کے فن کی خوبی یہ ہے کہ وہ دہشت، تاراج، بدصورتی، ظلم اور شقاوت کے درمیان نہ صرف کہیں نہ کہیں انسانی رویے کا سراغ لگا لیتے ہیں بلکہ بدصورتی اور دہشت سے صورت و حیرت کا جادو جگاتے ہیں وہ جذبات پرستی سے بچتے ہیں منظم رقیق القلبی اور غیر منظم حساسیت سے دامن بچاتے ہوئے شوکت صدیقی کے افسانے اپنی حقیقت نگاری کا جو نقش ثبت کرتے ہیں، اس میں سماجی رنگ اور سماجی جہت تو ہے لیکن ان کو شائستگی کی صیقل کاری اور آرزومندی کی خوش بینی سے الگ کرکے دیکھا جاسکتا ہے۔

شوکت صدیقی کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے بعض اوقات عمل کے سلسلے مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ سماجی صداقتوں کی ترجمانی کے لئے کرداروں کو بعض صورتوں میں اصل سے کم یا زیادہ کرکے افسانوی سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ لیکن یہ فن کے وہ

وسیلے ہیں جو حقیقت کو اس کی سماجی اور انسانی جہتوں کے ساتھ پیش کرنے کے لئے مختلف افسانہ نگار مختلف صورتوں سے کام میں لاتے رہے ہیں۔ اوران کے پردوں سے ان کے تصورِ زندگی کے مختلف جلوے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شوکت صدیقی ان فنی وسیلوں کے ساتھ جس حقیقت کو پیش کرتے ہیں وہ غیر مرصع لیکن پرزور انداز میں زندگی کی بالادستی کا اثبات ہے۔ زندگی جو منفی رویوں سے گزر کر خود بھی کوشش کی آگ میں جلتی اور ہیزم ناکارہ کو جلاتی رہتی ہے، ہر تخلیقی تجربہ کی بنیاد ہے۔ تخلیقی کوشش کی اس آگ نے کھردری حقیقتوں کو افسانوی قالب میں پگھلا کر اور نئی شکل دے کر جو کیمیا سازی کی ہے وہی شوکت صدیقی کے فن کی خصوصیت ہے اور کیمیا گر کے افسانوں کی فنی کارسازی اسی کیمیائی عمل سے عبارت ہے۔

'کیمیا گر' میں ڈھپالی ایک کردار کی پرواز و افتاد کے دائرہ کو جس خوب صورتی سے مکمل کرتا ہے، وہ مختلف افسانوی موڑوں کو تو پوری مہارت کے ساتھ پیش کرتا ہی ہے، فنِ موسیقی کے اسرار و رموز سے زندگی کے اسرار و رموز تک کئی پرمعنی خطوط بھی کھینچ دیتا ہے۔ اس طرح "خفیہ ہاتھ" غیر معمولی کرداروں کو استحصالی پس منظر کی ایک غیر معمولی صورتِ حال میں پیش کرتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ پس منظر ہی ان کرداروں کو وہ غیر معمولیت بخشتا ہے جو اس افسانہ کی پیش کردہ پر حدت صورتِ حال میں نمایاں ہوتی ہے کہ جہاں صحافی، وڈیرا، اس کا ملازم اور عشوہ فروش حسینہ سب ایک دوسرے کے استحصال کے درپے ہیں۔ لیکن اس صورتِ حال کی گرمی میں بھی جن کا خون سرد رہتا ہے۔ خونِ گرم کا کوئی اشارہ ہے تو وہ چور یا نقب زن جو اس پُراسرار رات میں خاموشی سے داخل ہوتا اور پھر باہر نکل جاتا ہے۔ لیکن اس کی خیرہ سری جو اپنے پیشہ کا بھرم رکھنا جانتی ہے صحافی کا دل بھی گرما دیتی ہے اور وہ صحافیانہ ہتھکنڈوں سے زراندوزی کو جائز سمجھتے ہوئے بھی رنڈیوں کی کمائی اور چوری کے مال میں حصہ لینے کو ناجائز سمجھنے لگتا ہے۔ دراصل اس خیمۂ شب بازی کے کرداری پتلوں کو جو خفیہ ہاتھ اپنی چھپی ہوئی ڈوری سے حرکت دے رہا ہے۔ اس کا نام نظامِ استحصال ہے۔ 'کیمیا گر' میں مادی احتیاج اور اخلاقی زوال کی مرقع کشی میں طنز یہ سفاکی ملتی ہے۔ "خداداد کالونی" ایک بیانیہ کہانی ہے۔ لیکن اس کی تعبیر ایک سے زیادہ سطحوں پر کی جا سکتی ہے اور اس میں شوکت صدیقی کی کردار سازی ان کے زندگی اور فن کے تصورات کی آئینہ داری کرتے ہوئے سیاہ وسفید کی آمیزش کرتی اور قبیح میں غیر ملمع شدہ خوش نمائی کے پہلو نکال لیتی ہے۔ اس کے برخلاف "میموریل" ایسی کہانی ہے جس میں ملمع شدہ زندگی کی ہوس بیک وقت مینارِ اعزاز اور مزارِ ذلالت دونوں کی تعمیر کرتی اور سعئ دولت کی دو مختلف سطحوں کو پیش کرتی ہے۔ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں میں کامرانی اور ناکامرانی کا تجزیہ اس افسانہ میں کرداری حالتوں اور واقعاتی صورتوں دونوں کے پیشِ نظر کیا گیا ہے۔ اور نہاں کو عیاں کرنے میں جہاں تنوع کردار و تنوعِ حال سے کام لیا گیا ہے، وہاں توضیحِ امکان اور تسلسلِ عمل کو فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ افسانہ بھی اپنی افسانوی تکنیک کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہے۔

شوکت صدیقی کا افسانہ سوالات و مسائل کو پیش کرنے کی جگہ زندگی کی اس صورتِ حال کو پیش کرتا ہے جو سوالات و مسائل کی اساس ہے۔ اسی لئے ان کے فن میں حقیقت نگاری کو جو نئی توسیع ملی ہے اور ان کے تصورِ فن نے جس طرح زندگی کے حقائق و تصورات سے روشنی حاصل کر کے اردو افسانہ نگاری کی سرحدوں کو آگے بڑھایا ہے، اسے مواد اور ہیئت دونوں اعتبارات سے منفرد اہمیت حاصل ہے۔


ایک عورت کی جلد کس حد تک تکلیف برداشت کرسکتی ہے ؟
WAX
تھریڈنگ تکلیف دہ ہے اور بال نوچنے سے جلد کو نقصان بھی پہنچتا ہے۔
ویکسنگ کا نتیجہ درد اور تکلیف۔ بالوں کو کھینچ کر نکالنے سے جلد ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔
شیونگ غیر نسوانی طریقہ ہے، جلد کو بدنما کرتا ہے۔ بالوں کی نمو میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔
غیر ضروری بالوں کو صاف کرنے کا نسوانی انداز - این فرینچ
خواتین کی نازک جلد کو نرم برتاؤ کی ضرورت ہوتی ہے اور این فرینچ نرمی کے ساتھ جلد کو صاف و ملائم کر دیتی ہے۔
پُر اثر این فرینچ جلد کی تہہ تک پہنچ کر بالوں کو نفاست سے صاف کرتی ہے۔
این فرینچ کا استعمال نہایت آسان: کریم لگا کر کچھ دیر انتظار کیجیے اور پھر صاف کر دیجیے۔
این فرینچ لیجیے۔ کیونکہ اچھائی ہمیشہ بول اٹھتی ہے خصوصاً آپ کی جلد پر۔
Anne French creams away hair
FACIAL QUALITY Anne French lotion
NEW
Anne French cream hair remover
CREAMS AWAY HAIR FROM FACE, LEGS, ARMS AND UNDERARMS
25 gms
تین خوشبوؤں میں دستیاب - گلاب، لیمن، ہربل -



محمد افسر ساجد

اللہ میگھ دے

طارق محمود دنیائے ادب میں ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند وارد ہوئے۔ ابتدا میں انہوں نے افسانے لکھے جوان کے تجربہ، بصارت اور انسانی ابتلا کے ادراک کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "سہ حدہ" اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اپنی کہانیوں میں انہوں نے طنزیہ علامت نگاری (IRONICAL SYMBOLISM) کے ذریعے معاشرے میں انفرادی تشخص کے بحران کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

طارق محمود کا افسانے سے ناول کی طرف سفر جزو سے کُل کی جانب دوطرفہ مسافت پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں التباس (ILLUSION) کو حقیقت (REALITY) سے ممیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے انسانی خود پسندی کا نفسیات کے تناظر میں مطالعہ کیا ہے اور موجودہ اخلاقی انحطاط کا مروجہ قدروں کے پس منظر میں تجزیہ کیا ہے۔ یہ تجزیہ "اللہ میگھ دے" کی تخلیق پر منتج ہوا۔

طارق محمود نے قیامِ بنگلہ دیش سے قبل چار سال تک ڈھاکا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اس طرح انہیں نہایت قریب سے سقوطِ مشرقی پاکستان کے عوامل کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یہی تجربہ ان کے ناول کی اساس ہے۔ "اللہ میگھ دے" ان کے درد کا انتساب ہے۔ اس درد کا منبع محبتِ وطن ہے لیکن یہ ایک خالصتاً سیاسی ناول نہیں ہے۔

طارق محمود بنیادی طور پر استغراق پسند ہیں۔ دروں بیں نہیں۔ ان کا ناول ان کے فن اور شخصیت دونوں کو PROJECT کرتا ہے۔ وہ ایک خاموش طبع، دردمند اور صاحبِ ذوق انسان ہیں۔ ناول کا موضوع ان کی دردمندی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح فن اور فن کار باہم مخلوط ہو جاتے ہیں۔ ملک کے اُس وقت کے دونوں حصوں کے درمیان ثقافتی اور اقتصادی عدم آہنگ کو کرداروں کے تکلم کے ذریعہ زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ بارشوں کے دیس میں قطرۂ باراں کی دُعا انسان اور فطرت کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کی علامت ہے۔

ناول کا مرکزی کردار عُمر، طارق محمود کا پروٹوٹائپ (PROTOTYPE) نظر آتا ہے۔ سوانحی عنصر کی بنا پر ناول کی وقعت (AUTHENTICITY) میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ عُمر مغربی پاکستان سے انٹرونگ اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مشرقی پاکستان جاتا ہے۔ ماحول میں اضطراب ہے۔ قومیت پسندی کا پرچار بڑی شدومد سے کیا جا رہا ہے۔ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان

اقتصادی بُعد پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں پر سوار ہے۔ طلبا صوبائی خود مختاری کے نعرے پر فریفتہ ہیں۔ اساتذہ ان کی ذہنی تخریب میں مصروف ہیں۔ عام آدمی غربت کے ہاتھوں دَم کشیدہ ہے۔

طارق محمود کی علامتیں ناول میں ایک حُسن پیدا کرتی ہیں۔ ماحول کی بدصورتی میں "بیوٹی" کا وجود خاصا معنی خیز ہے۔ ناول کا پلاٹ تکنیکی اعتبار سے مربوط نہیں۔ مکالمے اختصار اور اشاریت سے عاری ہیں۔ کہیں کہیں ان پر تقریر (DEMAGOGY) کا گمان ہوتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ پراپیگنڈا کی ذیل میں نہیں آتا۔ فی الحقیقت "اللہ میگھ دے" کی اپیل ذہین طبقے کے لئے ہے ناول کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک طویل خود کلامی کی منقسم بیانیہ تشریح (FRAGMENTED NARRATION OF A LONG MONOLOGUE) ہے۔ عُمر ہیملٹ کی طرح استغراق کا شکار رہتا ہے تاہم وہ متذبذب نہیں نظر آتا۔ اس کی سوچ کشفِ حقیقت سے مملُو ہے۔ وہ اپنے ہی دیس کے باسیوں میں اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے لیکن وہ خود انہیں اجنبی نہیں سمجھتا۔ وہ ان کے درد سے آشنا ہے۔ IRONY یہ ہے کہ اپنوں میں چاہت کا فقدان ہے۔ حقیقت ناآشنائی اِس کرب کی شدت میں اضافہ کرتی ہے۔ کالرج کے بوڑھے کشتی بان کو چاروں طرف سے پانی میں گھرے ہونے کے باوجود بھی پینے کا پانی میسر نہ آیا۔ پانی سے محرومی کی یہ علامت "اللہ میگھ دے" میں بڑے مؤثر طریق سے استعمال کی گئی ہے۔

'بیوٹی' کا یہ جملہ اس پیش منظر میں بہت معنی خیز ہے:

"YOU WANT TO POSSESS ME WITHOUT OWING ME." گویا خواہشِ حصول اور احساسِ ملکیت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اس طرح 'بیوٹی' کے ذاتی المیے کو قوم کی اجتماعی ٹریجڈی میں MAGNIFY کر دیا گیا ہے۔

طارق محمود نے ایک ہنوز ناپختہ صورتِ حال پر بڑی پختگی سے تبصرہ کیا ہے جو اُن کی فنی بالیدگی کی دلیل ہے۔

طارق محمود کا اسلوب اُن کے لہجے کی سادگی اور طنز کی معنی آفرینی کا خوبصورت امتزاج ہے۔ وہ بات بڑے سلیقے سے کہتے ہیں۔ مطالعے، مشاہدے اور تجربے کو انہوں نے فن کے سانچے میں ڈھال کر "اللہ میگھ دے" کی تخلیق کی ہے۔

فن کار کا کرب ہی اس کی تخلیق کے وجود کا جواز یعنی (RATIONALE) ہوتا ہے۔ طارق محمود کے کرب کی تجسیم "اللہ میگھ دے" ہے اور ان کے درد کا انتساب بھی۔



شان الحق حقی

گیان درپن

"گیان درپن" جمیل عظیم آبادی کے گیتوں، اور دوہوں کا مجموعہ ہے جسے میں نے بہت لطف لے کر پڑھا اور ان کے سلیس اندازِ بیان، مدھر بانی اور رسیلے بولوں کی دل سے داد دی۔ اپنے ہلکے پھلکے انداز میں انہوں نے حمد و نعت سے لے کر فکری، رومانی، اخلاقی اور ناصحانہ مضامین تک بڑی خوبی سے نظم کئے ہیں۔ انہیں اس اسلوب پر۔ جو بلاشبہ اُردو ہی کا ایک رُوپ ہے، بے مثل قدرت حاصل ہے۔ دوہے اور گیت ہمارے اور شاعروں نے بھی لکھے ہیں اور بہت اعلیٰ درجے کے لکھے ہیں۔ میں سرِ دست شاعرانہ کمال کا ذکر نہیں کر رہا ہوں اور کوئی موازنہ مقصود نہیں۔ لیکن اس مجموعے کو پڑھ کر جو تاثر لازماً قائم ہوتا ہے وہ یہ کہ اس طرح کی زبان جس میں عربی فارسی کے الفاظ تقریباً غائب ہوں اور کوئی نامانوس ہندی لفظ بھی نہ آنے پائے اس تسلسل، بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے۔ پوری کتاب میں گنے گنائے کوئی آٹھ غیر ہندی لفظ مجھے ملے اور چند یورپی لفظ، ان کے علاوہ یعنی بنگلہ، نیلام (پرتگالی)، سوپ، وی سی آر، جیل، لاٹ (انگریزی)۔

ویسے تو انشا نے بھی "رانی کیتکی اور کنور اُدے بھان" ایک پوری کہانی ٹھیٹھ ہندی میں لکھ ڈالی تھی اور وہ اسی نیت سے لکھی گئی تھی، لیکن جمیل صاحب نے اس طرح کا کوئی التزام اپنے اُوپر واجب نہیں کیا۔ چنانچہ اسلوب میں آورد کا تاثر نہیں ملتا۔ ایک نیا پن ضرور محسوس ہوتا ہے کیوں کہ عام طور پر اُردو تحریروں میں، نظم ہو یا نثر، معمولی افعال و حروف کو چھوڑ کر عربی فارسی اصطلاحات حاوی ہوتی ہیں۔

ایک بات یہ بھی جتانے کے قابل ہے کہ اب یہ "ہندی" الفاظ جیسے کہ جمیل صاحب نے برتے، جدید ہندی میں مردود قرار دیئے جا چکے ہیں جو "تت سم" پر زور دیتی ہے۔ یعنی الفاظ کو شدھ سنسکرت شکل لچھن (لکشن)، جیٹھ (جیشٹھ)، جوت (جیوتی)، سنجوگ (سنیوگ)، سچ (ستیہ)، دیپ (دویپ)، بچن (وچن)، سپنا (سوپن)، بے کُل (ویاکُل)، بھاگ (بھاگیہ)، سہاگن (سوبھاگن)، راج (راجیہ)، درپن (درپنر)، دلدر (دلدر)، سورج (سوریہ)، دھنک (دھنش)، ریت (رتُو)، سیس (شیش)، میت (متر)، بپتا (وپتیہ)، انکھیا (اکشی)، لاج (لجا)، برہا (وِرہ)، سندیسا (سندیش)، وغیرہ۔ اب ان کو اُردو ہی کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے۔ جدید ہندی انہیں نہیں اپنائی۔

دورانِ مطالعہ کئی سوال ذہن میں ابھرے۔ اوّل یہ کہ گیت کی تعریف کیا ہے؟ کسی صنفِ سخن کی تعریف ہیئت کے لحاظ سے بھی کی جا سکتی ہے۔ اور موضوع کے لحاظ سے بھی۔ ہیئت جیسے کہ قصیدہ، غزل، رباعی، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ۔ اور موضوع جیسے کہ مناجات،

منقبت ، شہرآشوب ، مرثیہ ، ہجو ۔ کہیں کوئی خاص ہیئت کسی خاص موضوع کے ساتھ مخصوص بھی ہوگئی ہے اگرچہ لازم نہیں جیسے مرثیے یا واسوخت کے ساتھ مسدس ۔ جدید دور کی اختراعات میں "نظم معرّیٰ" اپنی بے قافیہ ہیئت کی بنا پر شناخت ہوتی ہے ، اگرچہ بحر کی پابندی کرتی ہے ۔ "آزاد نظم" بحر سے بھی آزاد ہے لیکن وزن سے آزاد نہیں ۔ جہاں تک نثری نظم کا تعلق ہے ۔ اسے نظم میں شمار کرنا درست نہیں معلوم ہوتا ۔ نظم و نثر میں موضوعات و معانی ، انداز و اسلوب کے لحاظ سے پہلے بھی فرق نہ تھا ۔ دونوں ادب کی تعریف میں آتی ہیں ۔

پابند نظم میں روایتی ہیئتیں بھی ملتی ہیں ۔ اور نئے تصرفات بھی ۔ یہی صورت گیتوں کی بھی ہے ۔ تو سوال یہ ہے کہ نظم اور گیت میں مابہ الامتیاز کیا ہے ؟

بظاہر گیت وہ ہے جو گانے کے لئے لکھا جائے یا گایا جا سکتا ہو ۔ لیکن غزل بھی گائی جا سکتی ہے اور گائی جاتی ہے ۔ بلکہ بعض اوقات گا کر سنائی جاتی ہے ۔ اسی طرح نظمیں بھی لحن کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں ۔ بلکہ بعض اوقات ساز و آہنگ کے ساتھ بھی ۔ ایک نئی صنف "غنائیہ" ہے جو موسیقی کی دھنوں ہی میں پیش کرنے کے لئے لکھا جاتا ہے ۔ جہاں تک میں جانتا ہوں پہلا غنائیہ میں نے لکھا تھا (تازہ بستیاں ۱۹۴۹ء) اور موسیقی کی دھنوں میں ریڈیو سے کئی بار پیش کیا گیا تھا ۔ چنانچہ یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ گیتوں کی ضمنی تعریف کیا ہے ۔

آیئے ، جمیل عظیم آبادی کے گیتوں کو دیکھیں ۔ تفاق سے یہ سب کے سب "ترجیع بند" کی صورت میں ہیں ، سوائے آخری گیت کے جسے "ایک مکالمہ" کا تحتی عنوان دیا گیا ہے اور سارا مکالمہ قطعات و ابیات کی صورت میں ہے ۔ یہ سب گیت گانے کے لئے ہیں ، خواہ خیالی طور پر گنگنائے جائیں یا ساز و آہنگ کے ساتھ ۔ ٹیپ کے مصرعے "استھائی" کا حکم رکھتے ہیں ۔

دوسری بات جو نمایاں ہے وہ یہ کہ سب موضوع کے لحاظ سے رومانی ہیں ۔ اور تیسری یہ کہ ان میں سلیس "ہندی" زبان برتی گئی ہے جس میں عربی اور فارسی کی آمیزش یا تو بالکل نہیں یا برائے نام ہے ۔ دس عنوانات کے تحت کوئی پونے دو سو مصرعوں اور کل ۱۳ صفحات میں گنے گنائے ۳۰ لفظ غیر ہندی ہیں ۔ یعنی اوسطاً فی صفحہ ایک لفظ سے بھی کم ، اور وہ لفظ یہ ہیں :

شور ، تیز ، بازو ، کمزور ، سفر ، یاد ، دور ، ابتر ، راہ ، بلبل ، نشیلے ، شہنائی ، جذبات ، گلابی ، ہزار ، باغ ، شفقت ، زور ، مہ پارہ ، اوج ، قدرت ، نظارہ ، راحت ، طاقت ، سنت ، قوت ، ایقان ، ایمان ، وحدت ، درد ۔

ایک لفظ "گرمانا" بھی ہے جس کی مصدری شکل (بطور فعل متعدی) تو ہندی ہے ہی ، اس کی اصل کی بابت بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاید ہندی ہی ہو کیوں کہ سنسکرت میں بھی "گھرم" انہی معنی میں موجود ہے ۔ اوپر کے الفاظ میں "گلابی" کی یہ شکل بھی ہندی ہے ۔ فارسی میں "گلاب گوں" ہوگا ۔

خلاصتہً کہا جا سکتا ہے کہ گیت وہ ہے جس میں یہ تین خصوصیات موجود ہوں :

غنائیت : گانے کے لئے لکھا جائے ۔

رومانیت : اس کی فضا رومانی ہو خواہ مطلب میں فکری گہرائی بھی موجود ہو جیسے کہ شاہ عبد اللطیف کی کافیوں میں جو در اصل گیت ہی ہیں ۔

ہلکی پھلکی زبان : جو غنائیت اور رومانی فضا دونوں سے میل کھاتی ہو ۔

جن نظموں میں یہ خصوصیات ہوں وہ گیت شمار ہوں گی جیسے کہ عظمت اللہ خاں ، مقبول حسین احمد پوری ، میرا جی ، جمیل الدین عالی ، پرتو روہیلہ اور جمیل عظیم آبادی کے گیت ۔ راقم الحروف نے اس اسلوب کو گیتوں کے علاوہ "کہہ مکرنیوں" میں برتا ہے کہ ان کا روایتی لہجہ یہی ہے ۔

عظمت اللہ خاں نے بحروں میں بھی تصرفات کئے تھے اگرچہ ان کا اتباع کسی نے نہیں کیا۔ سب سے بڑے گیت نگار آغا حشر کاشمیری تھے جنہوں نے اپنے گیت عروضی بحروں پر نہیں بلکہ موسیقی کے راگوں پر موزوں کئے۔ وہ گانے ہی کے لئے لکھے گئے تھے اور گائے بھی گئے۔ شاعری بنیادی طور پر الفاظ کا فن ہے۔ گیتوں کے لئے بول ضروری ہوتے ہیں۔ مگر وہاں موسیقی حاوی ہوتی ہے۔ اور بولوں کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ وہ گیت اپنے دُھنوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ اور دُھنوں کے ساتھ ذہن میں آتے ہیں۔ گیت کی اصل صورت یہی تھی۔ اور یہ عوامی ادب کا ایک حصہ تھے۔ مگر ہمارے دور میں یہ تخصیص مٹ گئی ہے۔ اب گیت کو صنفِ سخن میں شمار کیا جاتا ہے مگر اس کی یہ لازمی تعریف اپنی جگہ ہے کہ گانے کے لئے لکھا گیا ہو۔ اور گایا جا سکے۔ یہ ضرور ہے کہ آج کل کے گیت جو ادب پارے شمار کئے جاتے ہیں، الفاظ کے آہنگ پر مدار رکھتے ہیں۔ موسیقی کے ٹھیکوں پر نہیں۔ پہلے گیت کے لئے کوئی دوسرا عنوان بھی اسی لئے لازم نہ تھا کہ یہ موسیقی کے تابع تھا۔ اور گیت لکھنے والے کے لئے ماہرِ موسیقی ہونا بھی لازم تھا۔

جمیل صاحب نے اپنے سب گیتوں کو مخصوص عنوان بھی دیئے ہیں۔ پہلے کوئی عنوان اگر ہوتا تھا تو عمومی قسم کا جیسے بھجن، پرارتھنا، گانا، ساکھی، دوہا۔

آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ یہ صرف زبان اور اسلوب کے تجربے نہیں بلکہ ان گیتوں اور دوہوں میں سچی شاعری ملتی ہے۔ ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو یہ لہجہ یا اسلوب نامانوس معلوم ہو لیکن یہ عام کتابی اردو سے زیادہ پُرتکلف نہیں جیسا کہ جمیل صاحب نے کہا ہے۔

رنگ برنگے جھوٹ سے کب تک دل اپنا بہلائیں
سچ کا روپ بھی دھاریں تو ہم جھوٹے ہی کہلائیں

کتاب کے مطالعے سے یہی تاثر ملتا ہے کہ یہ لہجہ شاعر کے لئے غیر فطری یا اجنبی نہیں۔ اس کے نطق میں رسا بسا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا یہ الفاظ جنہیں ہندی کہا جاتا ہے ٹھیٹھ اُردو میں جنہیں ہندی نہیں اپنائی۔ اب یہ اُردو ہی کے دامن میں سرسبز ہو سکتے ہیں، اُردو ہی کے کھلے آنگن میں لہلہا سکتے ہیں۔

"قرآنِ حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی ﷺ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔"

غزلیں

سبب، کراچی

ظہیر کاشمیری

کربِ ہجر کے لمحے، خود بخود گزر جائیں
دیکھ لو اگر ان کو، قسمتیں سنور جائیں

جس طرف نظر ڈالو، پیاس کا سمندر ہے
خشک لب جزیروں سے بھاگ کر کدھر جائیں

شاید اپنی خاکستر حشر کر سکے برپا
زندگی کی خواہش میں، آؤ آج مرجائیں

یہ خروشِ بے معنی، یہ ہجومِ ناپرساں
ہر طرف ہے تنہائی، بھاگ کر کدھر جائیں

خوفِ نارسائی بھی، اک عجب تماشا ہے
ساتھ ساتھ چلتا ہے، ہم جدھر جدھر جائیں

عشق کی اداؤں کا دادگر نہیں کوئی
بس نگار کو پوجیں، کس حسیں پہ مرجائیں

جذبۂ طلب میں بھی کچھ نہ کچھ کمی ہوگی
ورنہ سب مناجاتیں، یوں نہ بے اثر جائیں

بستیوں میں گھٹ مرنا، کیا یہی مقدر ہے؟
ہم بھی رفعتیں دیکھیں، ہم بھی دار پر جائیں

جمیل ملک

اپنی خاموش ریاضت کا اثر بھی دیکھو
رات دیکھی ہے تو اَب نورِ سحر بھی دیکھو

کیسی خوشبوئے محبت درودیوار میں ہے
صحنِ گُل دیکھ چکے ہو، مرا گھر بھی دیکھو

کوئی دستارِ فضیلت نہیں پہنی میں نے
پھر بھی اونچا ہی رہا، شوکتِ سر بھی دیکھو

حُسنِ فطرت میں اُبھر آئے گی تصویرِ کمال
ڈوب کر اس میں کبھی، حُسنِ بشر بھی دیکھو

لو لگائی ہے تو پھر آگ سے ڈرنا کیسا
عمر بھر خود بھی جلو، رقصِ شرر بھی دیکھو

اِتنی گہرائی تو قلزم بھی نہ رکھتے ہوں گے
آؤ، آجاؤ، مرا دیدۂ تر بھی دیکھو

داستانیں تو بہت عام ہیں فرزانوں کی
اَپنے دیوانوں کا اندازِ نظر بھی دیکھو

دل سے جو ہو کے گزرتی ہے وہ تاریخ ہوں میں
دوستو وقت کی یہ راہ گزر بھی دیکھو

اپنے ہاتھوں سے مجھے قتل کیا ہے تو جمیل
خون میں ڈوبا ہوا اپنا ہُنر بھی دیکھو

جمیل ملک

تری نگاہ نے بدلے ہیں فیصلے کتنے
ذرا سی دیر میں ٹوٹے ہیں سلسلے کتنے

جو ایک پل کو اُٹھی اور اُتر گئی دل میں
اُس اِک نظر سے ہیں پیدا مغالطے کتنے

چلا گیا ہے تو کیسا غـــرور ٹوٹا ہے
وہ ہمسفر تھا تو دل میں تھے حوصلے کتنے

اُدھر لبوں پہ نہ آیا مکالمہ کوئی
اِدھر نگاہ نے بھیجے مراسلے کتنے

محبتوں کا بھی دم گھٹ گیا تو کیا ہوگا
اُلجھ گئے ہیں دِلوں کے معاملے کتنے

جو بات کہہ نہ سکے بن گئی وہ انگارہ
پڑے ہیں گنگ زبانوں پہ آبلے کتنے

ہزار راہ میں ہوں نفرتوں کی دیواریں
دل و نگاہ میں قائم ہیں رابطے کتنے

سوال یہ ہے کہ کندن کوئی بنا کہ نہیں
جلی جب آگ، پتنگے تو جل بجھے کتنے

نہ کام آئیں جہاں خود پسند تلواریں
وہاں قلم نے دکھائے ہیں معجزے کتنے

اُنہیں کی خاک تو ہے منزلوں کا سرمایہ
لٹے ہیں راہ نوردوں کے قافلے کتنے

شکست کھا کے رہے اپنی خود کلامی سے
کئے ہیں یُوں تو غموں نے محاصرے کتنے

اُنہیں کا ہاتھ تو ہے وقت کی عنانوں پر
جو جانتے ہیں دلوں میں ہیں فاصلے کتنے

بس ایک پیار کی خوشبو ہے روشنی کی سفیر
لہو لہو ہیں بہاروں کے زائچے کتنے

ورق ورق مرے فن کے چراغ روشن ہیں
ہر ایک لفظ نے کاٹے ہیں مرحلے کتنے

جسے جمیلؔ شعورِ حیات کہتے ہیں
اُس ایک رہ سے نکلتے ہیں راستے کتنے

فارغ بخاری

ستم فصیلوں میں جھول کر بھی کوئی نبرد آزما رہا ہے
تمام طوفان تھم گئے ہیں مگر وہ محشر بپا رہا ہے

ہوائے غم نے تمام خوش فہمیوں کے سورج بجھا دیئے ہیں
مگر ابھی ایک ٹمٹماتا دیا ہے جو مسکرا رہا ہے

ملامتوں کے اس عہدِ بے آبرو میں بھی کوئی سرکشیدہ
لہو لہو ہے یہ خونچکاں انگلیوں سے تاریخ لکھ رہا ہے

کوئی تو منصور پیدا ہوگا، کوئی تو آئے گا ابنِ مریم
کہ جب بھی مقتل سجے، جیالا کوئی صلیب آشنا رہا ہے

دل کے گلدانوں میں یادوں کو سجا سکتے نہیں
آئینوں کو زخم ہم اپنے دکھا سکتے نہیں

شیشے کی دیوار میں آنسو کہ جن کے پار ہم
دیکھ تو سکتے ہیں ان کا روگ پا سکتے نہیں

ظلمتوں کی گود میں وہ سو رہے ہیں اور ہم
نیند کے ماتے سویروں کو جگا سکتے ہیں

اب انہیں بھی جستجو ہے، نیکیوں کے صید کی
بوجھ جو اپنے گناہوں کا اٹھا سکتے نہیں

کیا کریں اب ان سے فارغ بیوفائی کا گلہ
یاد آ کر جو کبھی دل بھی دکھا سکتے نہیں

سیپ کراچی

پرتو روہیلہ

اندھیرے رستوں میں رہنما ہو، مگر کہاں ہو
زمانہ کہتا ہے تم خدا ہو، مگر کہاں ہو

ہر ایک خوشبو سے مختلف ہے تمہاری خوشبو
تمام رنگوں سے تم جدا ہو، مگر کہاں ہو

مرے بدن میں رواں ہو میرے لہو کی صورت
دھڑکتے دل کی مرے صدا ہو، مگر کہاں ہو

مرے خیالوں میں بس رہے ہو مگر کدھر ہو
مرے خیالوں سے ماورا ہو، مگر کہاں ہو

ازل سے سانسوں میں گونجتی ہے صدا تمہاری
ہزاروں صدیوں کے آشنا ہو، مگر کہاں ہو

ابھر رہے ہو نوائے بیچارگاں کی صورت
مرے لبوں پر مری دعا ہو، مگر کہاں ہو

مری طلب کی تم ہی ہو منزل مگر کدھر ہو
مری محبت کا مدعا ہو، مگر کہاں ہو

جو میں گماں ہی کا پرتو حقیر مظہر
تو تم حقیقت کی انتہا ہو، مگر کہاں ہو

پ کراچی

جمیل

میں جہاں تھا ایک جنگل خوف سے لبریز تھا
اور اس جنگل کا سورج عشق شور انگیز تھا

مجھ سے زنجیروں کے غل میں بات کرتا تھا کوئی
اُن دنوں جب ظالموں کا نشہ بھی کچھ تیز تھا

ہم بھی پیتے تھے شرابِ ارغواں انگریز کی
جب ہمارے دیس کا حاکم کوئی انگریز تھا

ہر طرف آواز دیتے تھے درندے رات میں
شہر تھے ویراں مگر جنگل بہت زرخیز تھا

جن دنوں میں آگ بن کر رقص کرتا تھا جمیل
مجھ کو ظالم لڑکیوں کے پیار سے پرہیز تھا

صبح ناشاد کر رہی ہے ستاروں کے قریب
آہوئے بن کے اُترتی ہے چناروں کے قریب

غم کے ہمزاد نکل آتے ہیں ہر شاخ کے ساتھ
کچھ عجب پھول نکلتے ہیں بہاروں کے قریب

شہر بھی رنگ بدلتے ہیں ثمر کی مانند
منزلیں آتی ہیں جب شاہسواروں کے قریب

میری آشفتہ مزاجی کے دھندلکوں میں جمیل
ذوقِ ایجاد چمکتی ہے مزاروں کے قریب

مظہر امام

تاروں سے بھری راہ گزر لے کے گئی ہے
یہ صبح چراغوں کا نگر لے کے گئی ہے

تم کو تو پتہ ہوگا کہ ہمراہ تمہیں تھے
دُنیا مرے خوابوں کو کدھر لے کے گئی ہے؟

پیاسے تھے تو پانی کو پُکارا تھا ہمیں نے
ندی ادھر آئی ہے تو گھر لے کے گئی ہے

اک منزلِ بے مقصد و بے نام کی خواہش
کانٹوں کی سواری پہ سفر لے کے گئی ہے

بے بال و پری اب بھی سرِ دشت ہے محفوظ
آندھی تو فقط برگ و ثمر لے کے گئی ہے

شاید کہ اب آئے تری قربت کی نئی فصل
اس بار دُعا دستِ اثر لے کے گئی ہے

چمکے گا ابھی زیورِ شہزادیٔ مہتاب
اُس تک وہ مرے شب کی خبر لے کے گئی ہے

غلام محمّد قاصر

سیل در سیل ہم رواں ہی رہے
گھر سے نکلے تو بے اماں ہی رہے

جن سے دل کی زمین چھوٹ گئی
عُمر بھر زیرِ آسماں ہی رہے

تُو نے دیکھا تھا کس نظر سے کہ ہم
آج تک خود سے بدگماں ہی رہے

جھُوٹ کو خونِ دل سے سچ نہ بنا
داستاں ہے تو داستاں ہی رہے

تیر واپس گئے ہیں آتے ہی
ہر نشانے پہ کچھ نشاں ہی رہے

آ گیا ہے تو اب چمن سے نہ جا
بات پھُولوں کے درمیاں ہی رہے

کیسی بستی تھی آگ سے پہلے
اب تو بس ایک دو مکاں ہی رہے

کھڑکیاں دل کی بند رہنے دو
آگ تو بجھ گئی دھواں ہی رہے

خستہ خیمے کے روزنوں پہ بھی رات
کچھ ستارے سے مہرباں ہی رہے

کیفؔ انصاری

اگر چہ ، صاحبو ، غم باعثِ خانہ خرابی ہیں
انھیں ناکامیوں میں ہی رموزِ کامیابی ہیں

بدن ہیں منجمد پھر سے، چلاؤ اُس حُسن کی جانب
حرارت بخش دیتی ہیں ، وہ آنکھیں آفتابی ہیں

فشارِ موج کا منظر نہ کیوں دیکھے بھلا ساحل
نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن ، عزائم انقلابی ہیں

زمینِ دل ، خدا حافظ ، اگر یہ ٹوٹ کے برسے
میری پلکوں پہ جو آنسو ہیں، فطرت میں شہابی ہیں

گوارا کر سکیں اسراف خوشبو کا ، یہ ناممکن
ذرا محتاط اے پھولو ، ہوائیں احتسابی ہیں

کہاں جاؤں، بھلا کس سے ملوں ، تعبیر کی خاطر
مناظر میری آنکھوں میں ہیں جتنے ، نیم خوابی ہیں

ہوا ہے پانیوں میں ایک ہی مبعوث پیغمبر
یہاں جتنے بھی دریا ہیں ، سمندر کے صحابی ہیں

اگر شہرِ ستم سے کر چلا ہجرت ، تو اچھا ہے
چھٹی حِس کہہ رہی ہے آنے والے دن عذابی ہیں

بھلا نبضِ ادب ہو مضمحل اب کے نہ کیوں اے کیفؔ
کتابی ہیں اگر نقاد ، شاعر اکتسابی ہیں

صائمہ خیری

کب تک لکھا اور لکھو گی
کب تک تنہا اور چلو گی

کون ہے جو تم کو اپنائے
تم کس کس کو اپنا کہو گی

جس کو چاہا بچھڑ گیا وہ
تم بھی اک دن سپنا ہو گی

زخم جو اب کے برس ملے ہیں
کیا تم سچ مچ انہیں سہو گی

کون سے عالم میں زندہ ہو
روز جیو گی روز مرو گی

جانے کیا کیا وہ لکھے گا
جانے کیا کیا تم لکھو گی

کہاں جاؤں کہ میرا گھر کہاں ہے
کہ اب تو ذات بھی بارِ گراں ہے

بڑی مدت سے ڈر تھا پر کھلا اب
ہوا کی زد میں میرا آشیاں ہے

ہوئی اب شام سب جاتے ہیں گھر کو
مگر میرا ٹھکانہ ہی کہاں ہے

مسافر ہوں مجھے ڈھونڈے نہ کوئی
بہت پھیلا ہوا سارا جہاں ہے

دعائیں اس طرف بھی ہوں گی میری
جہاں تا حدِ امکاں آسماں ہے

شوکت مہدی

ہیبت میں زمیں پر یہ بلاؤں کی طرح ہیں
اِنساں کئی اب بھی خداؤں کی طرح ہیں

آواز کوئی دُور سے کیا اپنی سُنے گا
دیوار سے ٹکرائی صداؤں کی طرح ہیں

ہم لوگ نہیں کوئی خوشی دے نہ سکیں گے
ہم لوگ بھی ان سونی فضاؤں کی طرح ہیں

معتوب نہیں ہم ہی یہاں اے دلِ سادہ
موسم بھی درختوں پہ خزاؤں کی طرح ہیں

ہجرت بھی اکارت ہی گئی خیر سے مہدی
اَب شہر کے احوال بھی گاؤں کی طرح ہیں

رشتوں کی دُھوپ چھاؤں سے جب تک کٹے نہ تھے
آپس میں بھائیوں کے نوالے بٹے نہ تھے

برسوں کی دُشمنی نے پنپنے نہیں دیا
حائل تھے راستے میں جو پتھر ہٹے نہ تھے

سرما کی دُھوپ میں بھی چمکنا محال تھا
دل سے اُداسیوں کے دُھندلکے چھٹے نہ تھے

سیلاب بستیوں کو کنارے لگا گیا
اونچی عمارتوں کے غبارے پھٹے نہ تھے

مہدی کئی برس کی مُسافت کے باوجود
ہم تھے کہ ہجرتوں کے مقابل ڈٹے نہ تھے

کوثر صدیقی

تیرگی کے رُوپ میں پھیلے گی رُسوائی مری
آخرِ شب میں ڈھلے گی شامِ تنہائی مری

تو سمجھ لینا کہ تیرے دل میں بھی میل آ گیا
تیری آنکھوں میں اگر تصویر دُھندلائی مری

کس کو فرصت ہے کہ بن جائے مداوا درد کا
کس لئے دیکھے کوئی زخموں کی گہرائی مری

اوڑھ لوں گی میں ہمیشہ کے لئے تنہائیاں
کام گر نہ آسکے گی بزم آرائی مری

اُس سے ہی باتیں نہ ہوں تو پھر زباں کس کام کی
اُس کو نہ دیکھوں تو پھر بیکار بینائی مری

آگ تو مَیں نے جلائی تھی کہ جذبے راکھ ہوں
جل اُٹھی کوثر بھلا کیوں سوچ انگنائی مری

سجائے ہاتھوں پہ خواب ہم نے حِنا سمجھ کر
جلائی ہونٹوں پہ آگ ہم نے دُعا سمجھ کر

پہنتے ہیں چوڑیاں سمجھ کر ہم اُس کی یادیں
پہن لیا اضطراب اُس کی عطا سمجھ کر

تجھے اگر آج بُت سمجھ کر گرایا تو کیا
تری پرستش بھی کی ہے ہم نے خدا سمجھ کر

کوئی نہیں ہے بتلائے جو بوجھ آرزو کا
کہیں کیسے حالِ دل بھلا آشنا سمجھ کر

بچھڑنے والے بھلا تمری منتظر میں کب تک
یوں اشک پیتی رہوں گی آبِ بقا سمجھ کر

جو گردشِ وقت سر سے آنچل کو کھینچ لے تو
مَیں اوڑھ لیتی ہوں آسماں کو ردا سمجھ کر

گنوائی جاں مَیں نے جس کی معصومیت پہ کوثر
کیا ہے ہر ظلم اُس نے مجھ پر روا سمجھ کر

نسیم سحر

جب مجھ پہ عیاں ہوگا مری ذات کا جنگل
اُگ آئے گا کتنے ہی سوالات کا جنگل

اِک بھول بھلیاں کے مکیں ہم ہیں سدا سے
ہونا ہی نہیں ختم یہ دن رات کا جنگل

جب دل میں تری یاد کی پُروائی چلے ہے
آنکھوں میں اُتر آئے ہے برسات کا جنگل

بھولے سے کبھی ایک سوال آیا تھا لب پر
اَب چاروں طرف کتنے جوابات کا جنگل!

سچ یہ ہے کہ اس عہد میں دَم گھٹنے لگا ہے
یہ عہد کہ ہے کہنہ روایات کا جنگل

سورج نے بھی اس شہر سے مُنہ موڑ لیا ہے
اَب کیسے کٹے ایسی سیہ رات کا جنگل!

میں خواب نگر کا کوئی شہزادہ سفر پہ
وہ جسم، وہ خوابیدہ طلسمات کا جنگل

کہتے ہیں نسیم، ایسی غزل بھی کوئی شاعر
لگتی ہے جو بے معنی علامات کا جنگل

وہی، کہ دستِ خزاں میں ثمر گئے میرے
نسیم اُن پہ سخن بے اثر گئے میرے

یہ میری آنکھیں، یہ سیلاب کی گزرگاہیں
پڑی ہیں خشک، وہ دریا اُتر گئے میرے

اَب آنے والی بہاراں کے انتظار میں ہوں
گئی رُتوں کے دیئے زخم بھر گئے میرے

جو دشتِ شب نے سنوارے تھے اپنی محنت سے
سحر ہُوئی تو وہ سپنے بکھر گئے میرے

میں اپنی راہگذر خود بنا سکوں کہ نہیں
نہ جاؤں گا میں جدھر ہم سفر گئے میرے

متاعِ دل جو لُٹی ہے تو شاد کتنا ہوں!
نسیم گویا مقدر سنور گئے میرے

گلزار بخاری

سہیں کیوں رنج بخت آسماں تبدیل کرنے میں
ستارے محو ہیں اپنا جہاں تبدیل کرنے میں

پریشانی نہ تھی جب تک رہے ہم راز ہم اپنے
ہوئے ہیں خوار کتنے راز داں تبدیل کرنے میں

کیا ہوگا کسی آفت نے مجبور ہجرت پر
پرندے خوش کہاں ہیں آشیاں تبدیل کرنے میں

قفس میں اور تو کچھ بھی نہیں ہوتا اسیروں سے
لگے رہتے ہیں انداز فغاں تبدیل کرنے میں

خیال منزل مقصود ہی آیا نہ یاروں کو
رہے مصروف اتنے کارواں تبدیل کرنے میں

محلے کی فضا پر رنجشوں کا رنگ حاوی تھا
سو ہم نے عافیت سمجھی مکاں تبدیل کرنے میں

الجھنا ہے ہوائے تیز سے گلزار کشتی کو
برائی کیا ہے خستہ بادباں تبدیل کرنے میں

خیر کا اجر ترے شہر میں کیا دیتے ہیں
روشنی لے کے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں

تجھ میں کیا ہے کہ تجھے یاد کرے گا کوئی
اچھے اچھوں کو یہاں لوگ بھلا دیتے ہیں

اب کسی جرم پہ منصف نہیں کرتے ہیں گرفت
صرف ناکردہ گناہوں کی سزا دیتے ہیں

ہم نہیں چاہتے ہو جائے حقیقت ظاہر
اس لئے بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں

خوب انداز عداوت ہے تری بستی میں
ایک پتے کے عوض پیڑ جلا دیتے ہیں

کس نے مرہم سے نوازا ہے مگر ہم گلزار
جو بھی ملتا ہے اسے زخم دکھا دیتے ہیں

فاضل جمیلی

ہوا کے ساتھ پرندوں کے پَر نہیں آتے
لہو کی لہر تو آتی ہے سَر نہیں آتے

خیالِ یار کی آوارگی عجب شے ہے
گھروں کو لوٹ کے ہم رات بھر نہیں آتے

تُو آسماں کا ستارہ ہے، میں زمیں کا دُھواں
تری نظر میں مرے بام و در نہیں آتے

تمام شہر ہے مُردہ مری طرح لیکن
کسی بھی چہرے پہ کتبے نظر نہیں آتے

ہمارے ساتھ چلے ہو تو سوچ لو پہلے
یہ راہ وہ ہے کہ جس میں شجر نہیں آتے

مرا بدن بھی کوئی گہری جھیل ہے فاضل
کہ زخم لاکھ ہیں لیکن نظر نہیں آتے

ملتا ہے سکوں وصل کی باتوں میں زیادہ
ہوتی ہے خلش ہجر کی راتوں میں زیادہ

کچھ یادیں اندھیروں سے بھی وابستہ ہیں لیکن
یاد آتے ہو تم چاندنی راتوں میں زیادہ

جب تک کہ نہ دیکھے تھے کرشمے ترے ہم نے
اُلجھے رہے ہم لاتوں مناتوں میں زیادہ

مانا کہ سمندر بھی قریبِ لبِ جاں ہے
بڑھ جائے مگر پیاس فراتوں میں زیادہ

فاضل میں مُقدر کا سکندر بھی نہیں ہوں
پھر بھی ہیں لکیریں مرے ہاتھوں میں زیادہ

شمیم روش

خاموش تھا یہ بات مرے حوصلے کی تھی
پہچان ورنہ مجھ کو بھی کھوٹے کھرے کی تھی

اک شخص تیری بزم سے خاموش اٹھ گیا
شاید یہ بات تیرے لئے سوچنے کی تھی

ہر چند زندگی نے کنارہ کیا مگر
قسمت میں خاک لکھی اسی راستے کی تھی

ہم نے دیا جلا کے دریچے میں رکھ دیا
صورت بس ایک تجھ سے یہی رابطے کی تھی

بے شک تھی ہار میرا مقدر بنی ہوئی
بازی بساطِ جاں پہ مگر دیکھنے کی تھی

مرنا کسی بھی طور گوارا نہ تھا مگر
یہ آخری کڑی بھی ترے سلسلے کی تھی

مانا کہ اے روش وہ مخاطب تو ہم سے تھا
لیکن زباں دہن میں کسی دوسرے کی تھی

اس بار عجب کرب کا احساس ہوا ہے
دیکھوں تو مری ذات میں کیا ٹوٹ گیا ہے

آنکھوں میں دہکتے ہوئے سورج کو سمیٹے
اک شخص سمندر کی طرف دیکھ رہا ہے

اس شہر کی تقدیر میں لکھی ہے کڑی دھوپ
ہر شخص یہاں اپنے ہی سائے پہ کھڑا ہے

یہ کون ہے جو شب کی سیاہی کو لپیٹے
سنسان سی سڑکوں پہ یونہی گھوم رہا ہے

آہٹ ہے نہ جھونکا ہے نہ خوشبو ہے نہ دستک
پھر کس نے روش خواب سے بیدار کیا ہے

قیوم طاہر

وہ اک چراغ سا چہرا ہوا کو سونپ آئے
تمام لفظ ، ادھوری دُعا کو سونپ آئے

اُسی کے ہاتھ تھما دیں ہواؤں کی باگیں
ہم اپنا تخت بھی شہرِ سبا کو سونپ آئے

کبھی شناخت کریں گی سماعتیں اُس کو
فراقِ حرف کی خوشبو خلا کو سونپ آئے

بس ایک ہجر کے پل میں سفر کو اوڑھ لیا
نہ چاہتے بھی تجھے ہم خدا کو سونپ آئے

کوئی پھوار، نہ سوغات موسموں کی بنی
زمیں کی پیاس سُلگتی گھٹا کو سونپ آئے

وہ جس کی کھوج میں خود کو بجھا دیا قیوم
وہ ماہتاب، شبوں کی ردا کو سونپ آئے

آوازوں کی دُھند سے ڈرتا رہتا ہوں
تنہائی میں چُپ کو اوڑھ کے بیٹھا ہوں

اپنی خواہش ، اپنی سوچ کے بیج لیے
اک اَن دیکھی، خواب زمیں کو ڈھونڈتا ہوں

سامنے رکھ کر گئے دنوں کا آئینہ
اپنے دُھندلے مستقبل کو دیکھتا ہوں

ساحل ساحل بھیگی ریت پہ چلتا تھا
صحراؤں میں ٹانگیں توڑ کے بیٹھا ہوں

میری ساری ہمتیں رات کے گھیرے میں
میں صبحوں کی زخمی آنکھ کا سپنا ہوں

اب تو سورج اوڑھ کے بیٹھوں گا قیوم
میں اک ٹھنڈے، یخ دریا سے گزرا ہوں

دوہے، گیت

جمیل عظیم آبادی

دوھے

لاج تو ناری کا گہنا ہے۔ اس سے جو ہو خالی
جگ میں اس کا مان نہ ہو گا۔ لاکھ ہو گُن گن بالی

بادل جیسے بال گھنیرے، مکھڑا چندا روپ
گہری گہری چھاؤں کبھی ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ

من کا درپن ٹوٹ نہ جائے، بھید کو اپنے کھول
مکھڑا ترا بول رہا ہے، تو چاہے نہ بول

رم جھم پانی برسے، ساون کا سندیس
بھیگے چولی، انگ لہکائے، بھیگے ماتھا کیس

جل تھل جل تھل ندی نالے، جگمگ جگمگ ریت
جھوم رہی ہے بالی بالی، ہرے بھرے ہیں کھیت

اُڑتا بادل، رُت کا درپن، جائے دیس بدیس
روپ سروپ کے سپنوں میں وہ رہ رہ بدلے بھیس

چڑیا چہکے، پھول بھی مہکے، منوا اپنا بہکے
رت رچنا میں نیند کی ماری انکھیاں رہ رہ دہکے

کرتب کی ہے ندیا پیارے، جو کرنا ہے کر لے
ندیا ساگر سے تو چاہے۔ جتنی گگری بھر لے

پریت نگر کی "بجلی" ہے یا جگنو کی ہم ذات
آنکھ مچولی کھیل رہی ہے، ساری ساری رات

پیسے کی جب تنگی ہو، جب پیسے کا ہو چاؤ
سال گرہ جشن منا کر، بیٹھے کچھ دن کھاؤ

اصر شہزاد

گیت

چھنکے رے تو گجرے   آئیں جو سیاں سحرے
چھنکے رے تو گجرے

نیم پہ بیٹھے طوطا   چھیڑے، شور مچائے
ان کھل بھید بتائے

جھانکے پڑوسن چھت سے   سمٹوں لاج اور پیت سے
پٹ اس رت کو تج رے
چھنکے رے تو گجرے

لاٹھ سا میرا تجبیا   پائل سے ڈر لاگے
پاؤں پڑیں ۔ آکے

بستی کے سارے ناسی   پکڑیں بات ذرا سی
کچھ تو سوچ سمجھ رے
چھنکے رے تو گجرے

نیلا، یکخت سمندر   پیڑ ہرے ہریالے
نین اُس کے متوالے

چنداں، پھول، ستارے   سجنا، سکھی کے دوارے
چھوڑ اب لول نہ تج رے
چھنکے رے تو گجرے

ناصر شہزاد

گیت

• ——— کھیلو دھمار

سیاں جی کے دوار
کھیلو دھمار

پہنو بسنتی رنگ کے بانے
برسے نین پر

چھیڑو سجن کے مست افسانے
دُکھ بھرے مَن پر
رُوپ سروپ کی پھوار
کھیلو دھمار

تیاگ کے دھرم، اشلوک، شِوالا
لوبھ کے پھندے

ڈالو گلے میں پریت کی مالا
دُھن کے دھندے
رنگ، رنگ پتوار
کھیلو دھمار

پھینکو گُلال، بھرو پچکاری
پی کے سر پہ سی

رنگ لو چولا، چُندری، ساڑھی
مہکے عبیر سی
سمے کی سندر دھار
کھیلو دھمار

• ——— مندل کی گت

گھنگھر کی دُھن
چھن چھن

دھگ تٹ دھن، تاگے تن
سُر منڈل، چھمٹے، کھڑتالیں
نوبت کے رس بول کا پھیرا
بنسی میں سُر گم

بجیں دُرت لے میں، دیپ تالیں
سنکھ کی اُونچی تان کا گھیرا
میٹھے، مدھم
سُر میں سبھی اسرار
کھیلو دھمار

ناصر شہزاد

گیت

سکھی میں اِک اور کی منگ[1] رے — سیاں جادو ڈار گیا
کیسے جاؤں میں اُس کے سنگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
سکھی میں اک اور کی منگ رے
باٹ چلوں تو کھیہ کر گزرے
تم میری ہو کہہ کر گزرے
تڑپے تانگھ، ترنگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
سکھی میں اِک اور کی منگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
رُوح میں چھنتا جسم میں دُوری
آن بھئی آگے مجبوری
آنگن بیچ ہیں اَنگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
سکھی میں اِک اور کی منگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
سانس کی پھانس تلک مہکاریں
سینوں میں چڑیاں، چہکاریں
پران دیئے سب رنگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
سکھی میں اِک اور کی منگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
کیکر منڈھ[2] چڑھتا کر کیلا
دیکھ سکھی وہ کھُل کر کھیلا
چھد گئی آس، اُمنگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
سکھی میں اِک اور کی منگ رے — سیاں جادو ڈار گیا
ڈال کے نتھنی، کنگن توڑے
ڈھونڈیں اُسی کو نین نگوڑے
اَنگ لئے یوں ونگ[3] رے — سیاں جادو ڈار گیا
سکھی میں اِک اور کی منگ رے — سیاں جادو ڈار گیا

---

[1] منگیتر [2] تنا [3] کس

صائمہ تیری

گیت

او ساجن رے نا جا رے پردیس
میں بھی چلوں تیرے دوار
او ساجن رے نا جا رے پردیس
اس بستی میں جی ناں لاگے سونے پڑے ہیں سب بازار
کس سے کہوں میں من کی بتیاں کون اُتارے دریا پار
پاپی دُنیا کچھ نہ مانے رکھ دے کلیجے پہ تلوار
او ساجن رے نا جا رے پردیس
میں بھی چلوں تیرے دوار
مجھ پر ہوا ہے خالی سجنا، آنسو آتے نین میں
آگ لگی ہے سینے اندر، آگ لگی ہے تن من میں
زہر بھرے کچھ کانٹے چُبھ گئے پھول کے پیارے درپن میں
او ساجن رے ناں جا رے پردیس
میں بھی چلوں تیرے دوار
تُو بھی اگر نہ مجھ سے بولے، کس کو پکاروں سانوریا
بابل مورے ایسے سوئے، امّاں موئیں باوریا
اللہ تجھ کو زندہ رکھے نا جا نا جا سانوریا
او ساجن رے ناں جا رے پردیس
میں بھی چلوں تیرے دوار
او ساجن رے ناں جا رے پردیس۔

رُباعیات

ساجد امجد

قانع ہیں قناعت سے اَٹے بیٹھے ہیں
نیرنگیِ دُنیا سے کٹے بیٹھے ہیں
ہر ایک یہاں ہے آرزوؤں کا شکار
اک ہم کہ نشانے سے ہٹے بیٹھے ہیں

سب لوگ رَواں دَواں ہیں رستے کے بغیر
آنکھیں ویران ہیں تماشے کے بغیر
اس دَور کے انسان کی تنہائی نہ پُوچھ
آئینہ رکھا ہُوا ہے چہرے کے بغیر

جھُولے کی طرح جھوم رہے ہیں بندے
اسمائے خدا چوم رہے ہیں بندے
گُفتار کے شہ زور، عمل سے عاری
تسبیح لیے گھوم رہے ہیں بندے

دامانِ خرد کو پارا پارا کر لے
تخریبِ بُتِ جہل گوارا کر لے
ہر حال سے ماورا بنا لے حالت
ہشیاری و غفلت سے کنارا کر لے

تحریکے یہ چاک کب ہیں سلنے والے
آنکھوں ہی میں رہ جاتے ہیں ملنے والے
تھمتے ہی نہیں دستِ حوادث کے ستم
رہتے ہی نہیں شاخ پہ کھلنے والے

یہ ربط جو آئینے سے انسان کا ہے
ہر چند بڑے فخر بڑی شان کا ہے
آئینے کی آواز پہ لبیک نہ کہہ
یہ عکس نہیں، فیصلہ نادان کا ہے

سر سنگِ خوشامد پہ رگڑنے سے رَہا
بننے کی تمنا میں بگڑنے سے رَہا
محرابِ شب و روز سجے یا نہ سجے
تجھ مجھ کے میں پاؤں تو پکڑنے سے رَہا

کس بَل قسمت کے آزمانے نکلی
کُشتوں کے نصیب جگمگانے نکلی
حالات کی سرکشی گوارا نہ ہُوئی
تدبیر کی فوج سینہ تانے نکلی

رہ رہ کے ابھارا بزدلی نے مجھ کو
مایوس بنا دیا اسی نے مجھ کو
آرام اجل سے زندگی مشکل ہے
یہ راز بتایا خودکشی نے مجھ کو

منشائے دلی کو بھول جانے والے
سر حکم پہ فطرت کے جھکانے والے
غنچے کی طرف دیکھ کے ہمت پکڑو
ناپید نہیں ہیں مسکرانے والے

تمثیل کو انسان صداقت سمجھا
سائے کی جھلک کو قد و قامت سمجھا
کیا خوب کہ دھوکے کو حقیقت سمجھا
کیا خوب کہ آئینے کو صورت سمجھا

مطلب کے جو بندے ہیں کد رکھتے ہیں
لالچ پہ ملاقات کی حد رکھتے ہیں
آنکھوں میں مسرت کی سند رکھتے ہیں
سینے میں دل نہیں حسد رکھتے ہیں

خورشید ابھر رہا ہے دیکھو دیکھو
اس نور، فلک، صبا، سحر کو دیکھو
معشوق ہے کائنات میں جو کچھ ہے
تم ہاتھ سے آئینہ رکھو تو دیکھو

بازار میں شیطان کا رقصِ مذموم
اذہان میں رم خوردہ ہیولائے مسموم
ویران حویلی میں بلاؤں کا نزول
دہلیز پہ دنیا کی فقیروں کا ہجوم

عنقا کو ظہور کون دے سکتا ہے
پتھر کو سرور کون دے سکتا ہے
عاقل ہی اہلِ علم کی کرے گا قدر
جاہل کو شعور کون دے سکتا ہے

مایوس رہوں مری طبیعت میں نہیں
یہ کارِ زبوں مری طبیعت میں نہیں
اس کوچۂ خیر و شر کے پیچ و خم میں
گر گر کے چلوں مری طبیعت میں نہیں

اقلیم بدوش ہے فقیری میری — صد مژدۂ آزادی اسیری میری
صحبت سے بچا ہوا ہوں نا اہلوں کی — آباد ہے یہ گوشہ گیری میری

دریائے تخیل کو روانی دیدے — تو عمر خیالوں کو جوانی دیدے
اِک بُت سے مکالمہ ہوا ہے درپیش — اللہ مجھے کفر بیانی دیدے

پہنچے گا بلندی پہ یہ زینہ کیسے — بدلے گا یہ ماحول کمینہ کیسے
پتوار ندارد ہے بھنور حاضر ہیں — اُترے گا کنارے پہ سفینہ کیسے

چاہت نہ پرستش نہ عبادت کرتے — دُنیا سے نہ اس درجہ محبّت کرتے
دل پھینک چکے تو یاد آیا ہم کو — اس قیمتی سکّے کی حفاظت کرتے

غافل آدابِ شب کا قائل ہوگا — نیندوں کا کوئی خواب کا سائل ہوگا
ہم سوئے بغیر کاٹ دیتے ہیں رات — یہ لطف کسی کسی کو حاصل ہوگا

کچھ راہ نما نہ راہ بر سے ہوگا — تقدیر سے کچھ نہ بال و پر سے ہوگا
طے ہوگا جو مرحلہ سفر کا ساجد — یہ طے ہے کہ جرأتِ سفر سے ہوگا

شائستۂ آدابِ محبت ہم تھے — لب بستہ و صاحبِ مروّت ہم تھے
ہوتیں نہ اگر پاؤں میں یہ زنجیریں — اے پست قدو اقدِ قیامت ہم تھے

باتوں کا وہ اعجاز کہاں سے لاؤں — وہ طور وہ انداز کہاں سے لاؤں
بالفرض یہ اوصافِ حمیدہ مل جائیں — وہ فتنہ گرِ ناز کہاں سے لاؤں

فاطمہ حسن

ہائیکو

گملے میں ایک پودا ہے
جس کی شاخوں پر اب تک
میرا بچپن اُگتا ہے۔

اُگنے دو انہیں آنگن میں
شاید بھر دیں یہ پودے
خوشبو سب کے دامن میں

ہائیکو (ترجمے)

دریا جانے نہ ہی کھویا
دن کا اور کہاں
ساحل سے پوچھے یہ نیا
(اشیکی)

دُور کہیں لہرائی جھیل
بارش کی آواز سے ٹوٹی
جنگل کی خاموشی
(ابوسن)

ساتھ ساتھ آتا ہے
ایک اجنبی سا یا
دُور سے ڈراتا ہے
(سیسن ان)

مینڈک کودا پانی میں
ہلکا سا اک شور اٹھا
صدیوں کی ویرانی میں
(باشو)

نرم کونپل نکلے کی شاخ سے
کاش میں پونچھتی آ کے آنسو
تیری آنکھ سے۔
(باشو)

سلمان سعید

ہائیکو

موت، مجھ سے یہ رو رو کہتی ہے
آ میرے ساتھ دور چل پیارے
ترا غم دیکھ میں نہیں سکتی!

کوئی آس نہیں
ویراں ویراں ہے دل میں،
تو جو پاس نہیں!

مجھے اُس سے نفرت رہے گی
ہم ایک دوسرے سے بچھڑ کے بھی اس دارِ فانی میں زندہ رہیں گے
مگر ایک حسرت رہے گی!

آتی جاتی ہوئی ہر اک رُت میں
اُس کی صورت نظر میں رہتی ہے
ایک حسرت سی دل میں رہتی ہے

قیوم طاہر

ہائیکو

اب کس جاپ کے پھول چُنیں
اُجڑے گھر اور بنجر گلیاں
بانجھ آندھی کے بین سُنیں

اِک سفر روز دائروں کا ہے۔
ہم کہ پل بھر کو رُک نہیں سکتے۔
وقت چابک ہے سر پہ لٹکا ہے۔

شب کی لَے ہے کہ ٹوٹتی ہی نہیں
اِس اُفق سے ہے اُس اُفق تک رات
روشنی ہے کہ پھوٹتی ہی نہیں

چاند، جگنو، دیا بجھا آئے۔
اِک نیا گھر تلاشنے نکلے۔
اپنی دہلیز بھی گنوا آئے۔

جل گئی اَبر کی ہر ایک دُعا
اَب کسی بوند کی تلاش نہیں۔
دُھوپ سے سیپ ٹوٹ ٹوٹ چُکی۔

ہر سماعت میں زہر اُترا ہے
کون سُنتا ہے کون سمجھے گا۔
زخمی لہجے کی تشنہ باتوں کو۔

غزلیں

صبا اکبر آبادی

مئے تلخِ ضعیفی پی رہا ہوں
جوانی کی سزا میں جی رہا ہوں

جہاں میں کیا خوشی سے جی رہا ہوں
یہاں تو میں بہ مجبوری رہا ہوں

ابھی پھولوں کا ہنسنا کون دیکھے گا
ابھی تو زخم دل کے سی رہا ہوں

یہی ہے کارنامہ زندگی کا
رضائے دوست پر راضی رہا ہوں

غمِ انسانیت رکھا ہے دل میں
نظامِ جبر کا باغی رہا ہوں

مرے بس میں نہیں پرہیزگاری
پلاتا ہے کوئی تو پی رہا ہوں

تمہیں بچھڑے ہوئے اک عمر گزری
مجھے دیکھو کہ اب تک جی رہا ہوں

سجائی بزم بھی تنہائیوں میں
بھری محفل میں تنہا بھی رہا ہوں

میسّر کب ہوئی منزل جنوں کی
خرابِ ہوش و آگاہی رہا ہوں

مئے کوثر میں آئے گا مزا کیا
شرابِ تلخ کا عادی رہا ہوں

فضائے خلد ہے دیکھی ہوئی سی
یہاں تو غالباً میں بھی رہا ہوں

زمانے نے مجھے بدلا نہیں ہے
کہ میں جیسا تھا ویسا ہی رہا ہوں

بزرگوں کی روایت کو بچانے
شکستہ قلعہ کا فوجی رہا ہوں

نظیر و میر اور غالب کی شہ پر
حریفِ طالب و عرفی رہا ہوں

فضا دیکھی ہے ہر اک سرزمیں کی
ہمیشہ اکبر آبادی رہا ہوں

گدائی کر کے بابِ مصطفےٰؐ پر
صبا دنیا سے مستغنی رہا ہوں

سبب کراچی

جگن ناتھ آزاد

اس زمانے کے علاوہ بھی زمانے ہیں بہت
دِل ہو مُشتاقِ تماشا تو نشانے ہیں بہت

مرے مُرشد نے یہ آخر میں بتایا مجھ کو
کہ حقیقت ہے فقط ایک فسانے ہیں بہت

بعد میں خواب کا ہوتا ہے جو انجام نہ پوچھ
اِبتدا میں تو سبھی خواب سہانے ہیں بہت

ترے در پر گزر اوقات کی ہے بات کچھ اور
یُوں تو ہم خاک نشینوں کے ٹھکانے ہیں بہت

جو سُنا بزم نے وہ ایک جھلک بھی تو نہ تھی
مرے احساس میں خوابیدہ ترانے ہیں بہت

مَیں نے خوشیوں کو نہ للچائی نظر سے دیکھا
کہ مرے پاس غمِ دل کے خزانے ہیں بہت

سخت جانی کا نہیں کوئی علاج اے آزاد
ورنہ اس دَور میں مَرنے کے بہانے ہیں بہت

جوہر سعیدی

اُس کا جوبن تھا غضب، رات گئے
تھا عجب عالمِ شب، رات گئے
میری بانہوں سے نہ ہوتی تھی جُدا
میری سلمائے طرب، رات گئے
نغمگی، کیف، کشش، رنگ، ترنگ
ایک ہی صف میں تھے سب، رات گئے
یُوں لگا جیسے زمیں جاگ اُٹھی
رقصِ دُردانۂ شب، رات گئے
کس قدر کیف کی، برسات ہُوئی
سو گئی جیسے طلب، رات گئے
ایسی سوئی کہ نہ جاگی شب بھر
شورشِ نام و نسب رات گئے
گرمیٔ بادِ نفس میں تھی مہک
تھا عجب موسمِ شب، رات گئے
دیکھ کر گردشِ دوراں کو خجل
تھی فضا خندہ بلب رات گئے
سامنے جو بھی تھا منظر جوہر
تھا وہ انصاف طلب رات گئے۔

والبستگانِ دامنِ شب ہو گئے خموش
دیکھی سحر قریب تو سب ہو گئے خموش

اے چشمِ نیم باز، ترے رقص و رم کی خیر
جتنے زباں دراز تھے سب، ہو گئے خموش

کیا کیا بیاں ہوں، جوشِ جنوں کی کرامتیں
گویا ہوئی وہ آنکھ، وہ لب ہو گئے خموش

جو آج بولتے ہیں، وہ چُپ سادھ لیں گے کل
جو کل تھے نغمہ سنج، وہ اب ہو گئے خموش

ہر بے ہُنر کے سر پہ ہے تاجِ ہُنروری
اور صاحبانِ علم و ادب ہو گئے، خموش

اے بادِ تُند و تیز جنوں، کُچھ خبر بھی ہے
کتنے چراغِ راہِ طلب ہو گئے خموش

جوہر تمام نغمہ سرایانِ بزمِ شب
پڑھ کر سلامِ آخرِ شب، ہو گئے خموش

شبیر افضل جعفری

ان کے سیماب رنگ سیپارے
لوحِ محفوظ کے ہیں گہوارے
جشنِ دیوانگی میں پچھلے پہر
پھوٹتے ہیں شعور کے دھارے
خامشی ہے وہاں بھی نکتہ سرا
کہ جہاں بات حوصلہ ہارے
شالامارِ حیات میں اکثر
چھوٹتے ہیں لہو کے فوّارے
تند ہو کر مزاجِ غم زدگاں
کند کرتا ہے وقت کے آرے
چشمِ طنّاز کے اشاروں پر
بارہا رُک گئے ہیں سیّارے
آرزو جب طلوع ہوتی ہے
موت چُھپتی ہے شرم کے مارے
آدمی کے عروج نے افضل
پھول ہنس ہنس کے عرش کو مارے

سرشکوں کا پانی دُھواں بن گیا ہے
دُھواں پھیل کر آسماں بن گیا ہے
کبھی جو سرِ شاخ، برقِ تپاں تھا
وہ کوندا مرا آشیاں بن گیا ہے
دمِ آخریں، تیر کی طرح نکلا
رگِ جاں کا تنکا کماں بن گیا ہے
ہوئی گردِ آلام، ظلِّ الٰہی
مصائب کا نرغہ اماں بن گیا ہے
ملنگِ رضا جُو، تہی دست ہو کر
زمانے میں شاہِ جہاں بن گیا ہے
نشہ نہرِ نہج البلاغہ سے پی کے
قلم کار، شیرِ جہاں[1] بن گیا ہے
مرے عزم کے چاند کی چاندنی میں
غرورِ غنیماں کتاں بن گیا ہے
غزل مست مولا علیؑ کی مدد سے
سرِ بزم قرآں خواں بن گیا ہے
یقیں سا مؤثّر نہیں کوئی کُشتہ
توکّل سے افضل جواں بن گیا ہے

---

[1] چناب

ضیار علیگ

ہو گئی عام محبت کی کہانی کتنی
خاک لوگوں نے ترے شہر کی چھانی کتنی

اک محبت کے حوالے سے سُنی ہیں ہم نے
داستانیں تری آنکھوں کی زبانی کتنی

تم نہیں تھے تو کھٹکتے تھے اِن آنکھوں میں چراغ
تم جو آئے تو ہُوئی رات سُہانی کتنی

آئے وہ اور گئے دِل میں چراغاں کر کے
ایک لمحے میں ہُوئی بات پُرانی کتنی

بارہا سِلسلۂ عہدِ بہاراں کے حضور
غنچہ و گل پہ ہُوئی فاتحہ خوانی کتنی

جان ہتھیلی پہ لئے ہم نکل آئے ہیں ضیا
دیکھیں بازار میں اَب کے ہے گرانی کتنی

بس یہی زندگی کی ہے پہچان
آدمی آدمی کی ہے پہچان

وہ نظر اُٹھ کے دِل میں ڈوب گئی
روشنی روشنی کی ہے پہچان

آنکھ اُن سے ملی تو دِل دھڑکا
آگہی آگہی کی ہے پہچان

ہم اُنھیں جانتے ہیں بے دیکھے
اجنبی اجنبی کی ہے پہچان

دل سے ہوتا ہے دِل کا اندازہ
دوستی دوستی کی ہے پہچان

حسن آنکھوں میں آب چہرے پہ
سادگی سادگی کی ہے پہچان

لفظ سے لفظ کا ہے رابطہ ضیا
شاعری شاعری کی ہے پہچان

حاصلؔ مرادآبادی

آئینہ ذہن کو ماضی کا دکھا دیتی ہے
زندگی یوں ہمیں جینے کی سزا دیتی ہے

فطرتاً جرأتِ اظہار کے حامل ہیں مگر
بے زبان مصلحتِ وقت بنا دیتی ہے

دوستو فصلِ بہار آئی ہے آتی ہوگی
یہ بھی زخموں کے علاوہ ہمیں کیا دیتی ہے

اب وہ اشکوں کی روانی ہے نہ جذبات کی رَو
دل جواں ہو تو محبت بھی مزا دیتی ہے

ہر عقیدے میں نمایاں ہے محبت کا مقام
یہ صفت وہ ہے جو انسان بنا دیتی ہے

میں تری ذات کو کس طرح فراموش کروں
دل کی دھڑکن ترے ہونے کا پتہ دیتی ہے

کیسے مہکائے گی حاصلؔ وہ شبستانوں کو
جو ہوا گھر کے چراغوں کو بجھا دیتی ہے

بے نیازی جو ترے حسن کا انداز رہا
وحشتِ عشق پہ ہم کو بھی بڑا ناز رہا

جیب و داماں جو دریدہ ہیں تو حیرت کیا ہے
ہم جہاں ہیں وہاں موسم ہی جنوں ساز رہا

حسن کو داغِ ندامت سے بچانے کے لئے
میں سرِ بزمِ طرب نغمۂ بے ساز رہا

ہو گیا ربط یہی باعثِ تشکیلِ حیات
تو مری روحِ رواں میں ترا ہمراز رہا

بے زبانی کا بھرم کھول دیا اشکوں نے
راز جو دل میں نہاں تھا وہ کہاں راز رہا

زندگی کیسے گزاری یہ الگ بات رہی
دلِ بہ حالِ مرا آپ کا غمّاز رہا

شہرِ خوباں میں روایات کے باغی تھے بہت
احتیاطاً میں یہاں دُور کی آواز رہا

وقت کے ساتھ بدلتی رہیں قدریں حاصلؔ
اپنے اسلوبِ سخن کا وہی انداز رہا

وفا براہی

ابتدا ہی میں انتہا گم ہے
ابنِ آدم کا حوصلہ گم ہے
راہ خاموش رہنما گم ہے
دشتِ حیرت میں قافلہ گم ہے
ساکنانِ حرم پشیماں ہیں
عالمِ کُن کا ارتقا گم ہے
بود نابود ہو گئی کیسے
فلسفی کا بھی فلسفہ گم ہے
شدتِ تشنگی سے ثابت ہے
آبگینہ حیات کا گم ہے
روز و شب کے قیود میں رہ کر
آگہی کا بھی مدعا گم ہے
جس سے چہرے کی ہو صفت ظاہر
سُن رہا ہوں وہ آئینہ گم ہے
چشمِ خود بیں کو کیا خبر اس کی
حدِ منزل میں نقشِ پا گم ہے
دھند چھایا ہے، کس قیامت کا
اجنبی گم ہے، آشنا گم ہے
برق و باراں کو زندگی دے کر
وہ جمالِ نظر وفا گم ہے

کاوشِ خود سری نہیں ہے ابھی
خود سروں میں خودی نہیں ہے ابھی
روئے روشن ابھی نقاب میں ہے
چاند ہے، چاندنی نہیں ہے ابھی
دیدنی گرچہ ہے ترا جلوہ
دیدۂ دیدنی نہیں ہے ابھی
تم جو آؤ تو زندگی آئے
زندگی زندگی نہیں ہے ابھی
اپنی ہستی سے دشمنی کیوں ہو
موت سے دوستی نہیں ہے ابھی
رو براہی بھی پیچھے پیچھے ہے
گمرہی گمرہی نہیں ہے ابھی
رہبرانِ کہن مبارک ہو
عزمِ نو کی کمی نہیں ہے ابھی
وہ مزاجِ صبا کو کیا سمجھے
جو شگفتہ کلی نہیں ہے ابھی
میکدے والوں سے کوئی کہہ دے
کہ وفا مولوی نہیں ہے ابھی

سبب کراچی

احمد شریف

منجمد شب سے جگا دے مجھ کو
صبح کا گیت سُنا دے مجھ کو

اَب حصارِ غمِ دُنیا میں ہُوں میں
جانِ مَن، دل سے بھلا دے مجھ کو

ناخُدا، بات نہ کر ساحل کی
اِنہیں موجوں میں بہا دے مجھ کو

تشنگی یُوں نہیں مِٹنے والی
مے نہیں، زہر پلا دے مجھ کو

حُبس کا اندھیر ہے چاروں جانب
روشنی! تُو ہی صدا دے مجھ کو

اَب فقیروں کا چلن بھی دیکھو
پاسباں! شہ سے ملا دے مجھ کو

کوئی دَروازہ، دریچہ نہ سہی
ایک روزن ہی دکھا دے مجھ کو

دیکھنی ہے مری پرواز اگر
ذرا صیّاد اُڑا دے مجھ کو

رَنجِ دُنیا سے آشنا نہ رہا
دلِ انسان کام کا نہ رہا

زندگی بھی فدا اُسی پہ رہی
میرا سایا تلک مرا نہ رہا

دلرُبا کام کر گیا آخر
دِل کا اِغوا ذرا بُرا نہ رہا

شادماں ہُوں کہ رہ گئے ہیں داغ
میرے سینے میں دِل رہا، نہ رہا

معجزہ بھی خزاں کا دیکھ لیا
زخم کوئی مرا ہرا نہ رہا

کیسی آہٹ کہیں سے آئی تھی!
شہر کا کوئی دَر کھُلا نہ رہا

کِس قدر سہل تھا وصال اُس کا
کیُوں تخاطب کا حوصلہ نہ رہا

سہیل غازی پوری

جانے یہ کیسا شور اُٹھا ہے پسِ غبار
کہتے ہیں لوگ تیز ہوا ہے پسِ غبار

مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہے اُدھر میرِ کارواں
کوئی ضرور چھُوٹ گیا ہے پسِ غبار

برق تپاں سے اور ہواؤں سے بچ کے
کس کس کا گھر اجاڑ گیا ہے پسِ غبار

تنہائیوں کے شہر میں جب سے مقیم ہوں
صحرائے عشق ڈھونڈ رہا ہے پسِ غبار

کس کے لئے ہیں خارِ مغیلاں بھی مضطرب
دیکھو تو کون آبلہ پا ہے پسِ غبار

آندھی کی زد پہ آ کے سبھی اُڑ گئے مگر
سُوکھا سا ایک پیڑ بچا ہے پسِ غبار

چشمِ طلب کو کیسے بتائیں سہیل ہم
منظر جو ہے حسین چھپا ہے پسِ غبار

مشعلِ درد جب ہے رخشندہ
کیوں نہ ہو بزمِ روح تابندہ

کیوں مجھے اجنبی سمجھتے ہو
میں اِسی شہر کا ہوں باشندہ

اُس نے اک بار چھُو لیا تھا مجھے
میں اُسی لمس سے ہوں تابندہ

گردشِ وقت خوب واقف ہے
حوصلہ ہے تبھی تو ہوں زندہ

موسمِ گُل یہ کہہ گیا آخر
مجھ کو پاؤ گے اب نہ آئندہ

وہ طلب گار ہیں معافی کے
کون ہوتا ہے ایسے شرمندہ

لب کُشائی اگر ہے جرم تو ہو
اے سہیل آپ ہوں نہ شرمندہ

رئیس احمر

اس کارگہِ شوق میں یہ میرا ہنر تھا
بے سایۂ اشجار میں بھی گرم سفر تھا

دیکھا تھا کھلی آنکھ سے جب شہرِ طلب میں
ہر موڑ پہ رستے میں کوئی شعبدہ گر تھا

اُتری تھی کبھی کاہکشاں جس کی چھتوں پہ
اس شہرِ تمنا میں وہ گھر میرا ہی گھر تھا

پابندِ سلاسل تھا کوئی قافلہ یوں بھی
ہر نالۂ دل نعرۂ صد فتح و ظفر تھا

اک لفظ کہ تھا معجزۂ نطق و بیاں میں
وہ صورتِ صد شعبدہ تا حدِ نظر تھا

اب جس کا بہت شور ہے شوریدہ سروں میں
اے تاجورِ دہر میں وہ میرا ہی سر تھا

ہے پیشِ نظر ہم سفرو پھر وہی صحرا
دریا سے جہاں دور کوئی خاک بسر تھا

رستہ میں تم ہی صورتِ دیوار کھڑے تھے
ورنہ تو سفر میں نہ کبھی ہم کو حذر تھا

پتھراؤ میں کیا گل سخنی پھول کھلاتی
احمر ہمیں خود اپنے ہی مر جانے کا ڈر تھا

صیقل کروں لہو سے تو دل آئینا بنے
پر کیا خبر اس آئینہ دل کا کیا بنے

زخمی بدن پہ اب تو قبا بھی ہے تنگ رنگ
پرچم عطا ہوں میں، کوئی پرچم کشا بنے

بے کیفیاں بکھر بھی چکیں کائنات میں
اب میں نہیں تو مجھ سا کوئی دوسرا بنے

دو گام ہی چلے تھے کہ ہم تھک کے رہ گئے
اب کیا خبر کہ قافلہ والوں کا کیا بنے

پھر سر ہی کیا تمام بدن تھا رہینِ سنگ
شہرِ خرد میں ہم جو جنوں آشنا بنے

اب دوستوں سے عرضِ تمنا کریں تو کیا
جو اپنے مہرباں تھے وہ اپنے خدا بنے

احمر ہر ایک رنگ میں اپنا وجود ہے
بکھرے جو اپنی خاک تو موجِ صبا بنے

شجاعت علی راہی

ہم چکوروں کو کوئی خواب دکھایا جائے
چاندنی رات کی اگنی میں جلایا جائے
دودھیا چہرے کو گلنار بنایا جائے
کسی دوشیزۂ گل گوں کو ستایا جائے
خشک آنکھوں میں کوئی عکس سجایا جائے
جھیل آنکھوں سے کوئی خواب چرایا جائے
جذبۂ شوق کو آنچل کی ہوا دی جائے
روح و دل میں کسی خوشبو کو بسایا جائے
جلتے ماتھے پہ کوئی برف کا پھاہا رکھ دے
قرصِ خورشید سمندر میں بجھایا جائے
پھر کوئی تازہ ملامت کوئی دکھ کوئی عذاب
پھر سبک شانوں پہ اک بوجھ اٹھایا جائے
کون کہتا ہے ہرے پتے جلانے کو مگر
زرد پتوں کو بھی سینے سے لگایا جائے
ایسا خوش عکس تو پہلے کبھی دیکھا نہ سنا
دلِ خوش فہم کو آئینہ دکھایا جائے
لمس کی ریشمی باہیں ہوں کہ ہو سنبلِ حرف
دلِ وحشی کو کسی طور سدھایا جائے

ہم نے اک کرمکِ شب تاب کو مہتاب لکھا
تو کہ تھا ایک حقیقت، تجھے اک خواب لکھا

تشنگی نے بھی عجب جبر کا دفتر کھولا
کیکٹس کو مرے خامے نے گلِ آب لکھا

استعاروں میں لکھی ساری حکایت ہم نے
دل کو اک ساز لکھا، درد کو مضراب لکھا

مطمئن کب تھا کوئی ہم سا مگر اے جاناں
تجھ کو پایا بھی تو دل کو دلِ بے تاب لکھا

پڑھنے والوں نے اسے زلفِ طرح دار پڑھا
لکھنے والے نے اسے ریشم و کمخواب لکھا

بارہا ہم نے کہا آب کو زمزم راہی
ہم نے اک نام کئی بار سرِ آب لکھا

گفتارِ خیالی

اس دُنیا میں لوگو، ہم نے کیا سوچا کیا دیکھا ہے
ایسا سمجھا جس کو ہم نے، وہ احساس پرایا ہے
اپنے زیست کے ہر کونے پر رقصاں ہے مایوسی سی
درد و غم کے شعلوں میں ہر موڑ پہ دل ہی جلتا ہے
خوشیوں کا مقتل ہے دُنیا، کس کو آس ہے جینے کی
امن و سکوں کے ہر طالب نے ہر دم خون ہی تھوکا ہے
زخموں کے گرداب میں پھنس کے ہم نے صدیاں کتنی دیں
نفسا نفسی کا عالم ہے سب نے رشتہ توڑا ہے
شہر میں جا کے کتنا ہی احساس ہوا تنہائی کا
لوگوں کی اس بھیڑ میں اب کے خود کو تنہا پایا ہے
پیار کے اِن دو نو رستوں پر ہم نے عمر گزاری ہے
ہجر تو ہے سنگین بہت ہی، وصل بھی تو اک دھوکا ہے
کیسا سچ محسوس کریں گے، سطحِ آب پہ جا کے ہم
جب بھی پانی میں دیکھیں گے، عکس بھی اپنا اُلٹا ہے
صدموں کے کہسار میں ٹوٹے جس پر ہر اک لمحے میں
ہم نے ایسے شخص کو دیکھا جو ہنستا نہ روتا ہے
پہلی بار گفتار سے مل کر اپنی رائے قائم نہ کر
غور سے جب بھی سوچے گا تو آدمی کتنا گہرا ہے

خود فراموشی کا ہر اِک زاویہ اچھا لگا
مجھ کو اپنی زندگی کا تجزیہ اچھا لگا
جاگتی آنکھوں نے تیری یاد کے سپنے بُنے
کس قدر سنگین تھا یہ المیہ اچھا لگا
چاہتوں کا رنگ کتنا اور گہرا ہو گیا
آنسوؤں کی بھیڑ میں وہ بے وفا اچھا لگا
دیر تک منظر رہے آنکھوں میں اپنی پیار کے
چلمنوں کی اوٹ سے وہ جھانکتا اچھا لگا
میں نے خود کو دشمنوں کی دسترس میں دے دیا
اپنی ساری عمر کا یہ واقعہ اچھا لگا
پیار میں اپنا ہی اِک انداز ہونا چاہیے
نیم وا آنکھوں سے مجھ کو جاگتا اچھا لگا
خوف جس کو ٹوٹنے کا ایک پل ہوتا نہیں
پتھروں کے شہر میں بھی آئینہ اچھا لگا
جب تلک الفاظ میں تاثیر کا فقدان ہے
میں تو اپنے آپ کو بھی بے صدا اچھا لگا
آگہی کے رُوپ میں پہچان اپنی ہو گئی
ہر کوئی گفتار کو اپنے سوا اچھا لگا

سیپ کراچی

عابدہ کرامت

بچھڑتے وقت فقط میں نے اتنا سوچا تھا
یہ شخص کتنی محبت سے مجھ سے ملتا تھا

میں آپ ٹوٹ رہی تھی مگر نگاہوں میں
بکھرتے وقت کئی دوستوں کا چہرہ تھا

اسی کی سمت ہے جواب مری کمان میں ہے
یہ تیر وہ ہے جو اس نے ہی مجھ پہ پھینکا تھا

ہر اک شخص سے ملنا ہر اک کا دل رکھنا
یہ رکھ رکھاؤ اسی سے تو میں نے سیکھا تھا

وہ پھول توڑ کے پتے بکھیرتا ہی گیا
یہ ایک دوست جو سائے میں میرے ٹھہرا تھا

میں ایک قطرہ سہی۔ وہ مگر سمندر تھا
یہ فیصلہ نہ ہوا کون کتنا گہرا تھا

شعور فکر نے ٹھنڈک بھی دی ہے سینے کو
مجھے جھلس نہیں پایا یہ اب شعلہ تھا

تیری طرح سے تجھے میں بھی بھول سکتی تھی
کہ ایسا شخص تو مجھ میں بھی ایک رہتا تھا

ہے دو تہائی تو پانی تیرے جہاں میں مگر
لب فرات بھی اک شخص آکے پیاسا تھا

اب ایسے رازوں کو تاریخ بھی اگل نہ سکی
سخن کے دار پہ کس کس نے کس کو کھینچا تھا

چھین کے لے گیا وہ جب سے خدائی میری
ریزہ ریزہ ہے اسی دن سے اکائی میری

پھول کھلتے بھی اگر مجھ میں تو کھلتے کیسے
میرے صحراؤں نے پی لی ہے ترائی میری

شہر لب بستہ میں کیا کوئی گواہی دیتا
میرے ناکردہ جرائم تھے صفائی میری

میری منزل تو میری ذات کے اندر گم ہے
کون کر سکتا ہے پھر راہ نمائی میری

جو گرہ کھولتیں وہ انگلیاں زخمی نکلیں
ورنہ مشکل تو نہیں عقدہ کشائی میری

فیصلہ جس نے جدائی کا کیا تھا مجھ سے
چین لینے نہیں دیتی ہے جدائی میری

وہ تو مدت ہوئی ہتھیار کہیں رکھ آیا
مجھ میں جاری ہے مگر مجھ سے لڑائی میری

اس کے میں نام سے احوال سے واقف تو رہی
جانتی تھی کہ کہاں تک ہے رسائی میری

شرافت عباس

فراقِ یار کا موسم گزر نہ جائے کہیں
یہ آرزو کا نشہ بھی اُتر نہ جائے کہیں

ہر ایک لمحہ یہی احتمال رہتا ہے
جو خواب دیکھ رہا ہوں بکھر نہ جائے کہیں

اسے سنبھال کے رکھنا امانتوں کی طرح
یہ زخم تحفۂ یاراں ہے بھر نہ جائے کہیں

کبھی کبھی تری خواہش بہت ستاتی ہے
کبھی کبھی کی یہ خواہش بھی مر نہ جائے کہیں

یہ شہرِ کم نظراں ہے ذرا خیال رہے
یہاں یہ آہ تری بے اثر نہ جائے کہیں

گریز پا ہیں مگر لن ترانیاں کیا کیا
عقیدتوں نے تراشیں کہانیاں کیا کیا

کسی کے کوچے میں شب بھر تمام دیوانے
تلاش کرتے ہیں اپنی جوانیاں کیا کیا

غُبارِ وقت نے چہرے چھُپا دیئے کتنے
سماعتوں کو ملی ہیں سُنانیاں کیا کیا

ابھی ابھی ترے تیور بدل گئے کیسے
ابھی ابھی تھیں تری مہربانیاں کیا کیا

کوئی حرُوف شناسا ملے تو پڑھوائیں
کتابِ دل میں لکھی ہیں کہانیاں کیا کیا

قبا کا چاک جُدائی کے رنگ درد کے پھُول
بہار چھوڑ گئی ہے نشانیاں کیا کیا

اے نازؔ پھر کوئی پارینہ زخم تازہ ہوا
نئی غزل میں ہیں باتیں پُرانیاں کیا کیا

سیپ کراچی

پنہاں

نہ جانے کیوں مری آنکھوں سے اکثر روٹھ جاتا ہے
وہ میٹھی نیند کا جھونکا جو اُس کے خواب لاتا ہے

یہ کیسی آگ بھڑکائی کسی خوشبو نے رگ رگ میں
کوئی بارش کی رم جھم میں یہ کیسے گیت گاتا ہے

خزاں کی زد میں آ کے زرد ہو جاتا ہے جو پتا
صبا کی نرم سی تھپکی سے بھی وہ ٹوٹ جاتا ہے

نہ جانے کون سی محرومیاں ہیں میرے ماضی میں
نہ جانے کیوں مجھے رہ رہ کے بچپن یاد آتا ہے

اسی احساس نے مسرور رکھا ہے مجھے پنہاں
غزل کہتی ہے مجھ کو شعر مجھ کو گنگناتا ہے

حاصلِ ادراک احساسِ زیاں
زندگی ہے اک مُتاعِ رائیگاں
دھوپ کا چاروں طرف اک سائباں
کھو گیا ہے اپنا سایہ بھی یہاں
خود کو دیکھیں خواب میں شہزادیاں
کس قدر نادان ہیں یہ لڑکیاں
ہے عجب بے نام موسم روح میں
کس خزاں کا رزق ہے یہ شاخِ جاں
بحرِ ہستی کے جدا آداب ہیں
ڈوبتی ہیں ساحلوں پہ کشتیاں
ابرِ آوارہ کو کب احساس ہے
پیاس کی شدت سے دل ریگِ تپاں
خواب کے تابندہ موتی کھو گئے
اَب مری آنکھیں ہیں خالی سیپیاں
یہ کھنڈر ہے یا کسی کا انتظار
گر گیا گھر رہ گئی ہیں کھڑکیاں
جانے کیا کہتی رہیں قدموں تلے
گھاس کی کچھ نرم و نازک پتیاں
مٹ گیا تو اس میں حیرانی بھی کیا
کس نے پانی پہ بنایا ہے نشاں
سوچ کی زد میں مرا احساس ہے
رُوح پہ گرنے کو ہیں پھر بجلیاں

تبصرے



تبصرے

ہر کتاب اور رسالے کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

چہار خواب

شاعر : قمر جمیل
ناشر : مکتبۂ آسی، اے-۵۱، یوکے پلازہ، کراچی

یہ شاعری ہماری عنصریوں کا گھر نہیں　　جبریل کا مکان ہے اس کا خیال کر

اس شعر میں جو حقیقت پسندانہ دعویٰ کیا گیا ہے اس کا ثبوت پیش نظر کتاب کے ایک ایک صفحے پر نظر آتا ہے۔ ہماری مراد قمر جمیل کے مجموعۂ کلام "چہار خواب" سے ہے۔ قمر جمیل کا نام شہر ادب میں کئی حیثیتوں سے معروف ہے۔ وہ نقاد بھی ہیں، کالم نگار بھی، غزلیں بھی لکھتے ہیں نظمیں بھی اور نثری نظموں کے ابتدائی علم برداروں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ اور مصور بھی ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ وہ مرکز ہے جس میں ان کی تمام خوبیاں یکجا ہو کر سامنے آئی ہیں۔ "چہار خواب" کی ترکیب بڑی معنی خیز ہے۔ یہ "چہار درویش" سے مستعار نہیں بلکہ "چہار خواب" دراصل وہ چار اصناف ہیں جو اس مجموعے میں موجود ہیں۔ شاعر نے کچھ خواب دیکھے ہیں۔ ان خوابوں کو مختلف اصناف کے لباس پہنائے ہیں۔ آزاد نظم، غزل، ثلاثی اور نثری نظمیں ان خوابوں کے اظہار کا ذریعہ بنی ہیں۔ خواب دیکھنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ لیکن عام آدمی اور شاعر میں فرق یہ ہے کہ شاعر ان خوابوں کو صرف دیکھتا ہی نہیں ہے، انہیں دوسروں کو دکھا بھی سکتا ہے۔ قمر جمیل نے بھی کچھ خواب دیکھے ہیں جو تمثالی پیکر، استعاراتی زبان اور علامتوں کے ذریعے انہوں نے ہمیں دکھائے ہیں اسی کا نام "چہار خواب" ہے۔

"چہار خواب" کی غزلیں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے جدید عصر کی آئینہ دار اور اس دور کے لکھنے والوں کی ہم رکاب ہیں۔ مگر باعتبار اسلوب قمر جمیل کی منفرد آواز میں امیجری (IMAGERY) کی جو شان ان غزلوں میں نظر آتی ہے وہ اردو غزل کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سمعی، بصری اور حسی کی تمثالیں جتنی ممکن ہو سکتی ہیں ان غزلوں میں نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری ایک بلند آہنگ مکالمہ ہے جو کبھی وہ اپنی ذات سے کرتے ہیں، کبھی کائنات سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اور تخیل کے کیمیاوی عمل سے تصویریں بناتے ہیں۔ یہ تصویریں بے جان اور بے حس نہیں ہیں بلکہ جذبے کی زبان سے لکھی گئی ہیں اور جذبات کو حرکت میں لانے کا سبب بنتی ہیں۔ گویا قمر جمیل اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ "شاعری جذبے سے پیدا ہوتی ہے اور جذبات پیدا کرتی ہے"۔ وہ شاعری کی پُراسراریت کے قائل ہیں۔ لہٰذا ایک ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جو داستانی مزاج سے قریب ہے ہمارے لئے دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔ اور اس طرح ہم شاعری کے دام میں آکر اس کی تخلیق پڑھے بغیر نہیں رہتے اور یہ جادو ہم پر چل ہی جاتا ہے۔ ان غزلوں میں یہ احساس ملتا ہے کہ شاعری محبت کی زبان میں بات کرنے کا نام ہے۔ انہوں نے زمانے سے شکایت بھی اس طرح کی جیسے محبوب کا

گلہ کررہے ہوں۔ جھنجلاہٹ، نفرت، مایوسی اور کلبیت نظر نہیں آتی۔

پختہ کاری ان غزلوں کا ایک اور بڑا وصف ہے۔ لفظوں کا استعمال، مصرعوں کی ساخت اور آرائش، چستی اور بندش، رمزیت، ایمائیت، سادگی اور روانی ان غزلوں کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں۔ وہ صرف بات کہنا نہیں چاہتے۔ کس ڈھب سے کہی جائے یہ بھی جانتے ہیں۔ مصرعوں میں خوش گوار موسیقیت کا اضافہ کرتے ہیں۔ کبھی بحروں کے چناؤ سے، کبھی قافیوں کے اچھوتے پن سے، کبھی مصرعوں کو ہم وزن ٹکڑوں میں بانٹ کر۔ غرضیکہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں " ہم کہ آرائش فن جانتے ہیں "

اس مجموعے میں نظمیں بھی شامل ہیں۔ نثری نظموں کو چھوڑ کر یہی اوصاف ان نظموں پر بھی صادق آتے ہیں۔ نظموں کے کینوس کی وسعت نے انہیں اپنے ان اوصاف کو اور زیادہ ابھارنے کا موقع دیا۔ "دجلہ کے خواب"، "ایک منظر"، "نیل کا سیلاب" ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں وہ تخیل کی آنکھ تمثالی پیکر تراشتے ہیں۔ "بن مانس" جدید عہد کا نوحہ ہے "گنگا ندی کی متی زال" زمینی رشتے اور موسیقیت سے قمر جمیل کا رشتہ ثابت کرتی ہے۔

—— —— ڈاکٹر ساجد امجد ——

آئینے کے اس طرف

شاعر : عالمتاب تشنہ
ناشر : ایوانِ ادب، سی ۵۳۔ بلاک ۹ گلشن اقبال، کراچی

پیش نظر کتاب عالمتاب تشنہ کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کا پہلا مجموعہ موسوم بہ "موج موج تشنگی" شائع ہوکر اہل ادب میں اعتبار قائم کرچکا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا مجموعہ شائع کرتے ہوئے شاعر پر بڑی ذمہ داری یہ آن پڑتی ہے کہ وہ اس دوسری اشاعت کی ضرورت کو ثابت کرے۔ وہ ثابت کرے کہ اس کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ وہ اپنے آپ کو دُہرا نہیں رہا ہے۔ اس کے تخیل کی سیپوں میں ابھی اَن دیکھے موتی موجود ہیں۔ اور عالمتاب تشنہ نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی قبول کیا ہے۔ اب ان کے یہاں کیف ومستی اور نشاط انگیزی ہی نہیں بلکہ فکر کی گہرائی، موضوعات کا تنوع اور ذہنی بالیدگی ابھر کر سامنے آئی ہے۔

"آئینے کے اس طرف" کا نام اپنی خوبصورتی سے قطع نظر مصنف کی ذہنی ساخت کی غمازی بھی کرتا ہے۔ آئینہ حیرت کا استعارہ ہے اور آئینے کے اس طرف اک جہانِ حیرت آباد ہے۔ اس جہانِ حیرت کی سیر کرتے رہنا اہل دانش کا شیوہ رہا ہے۔ حیرت بغیر تجسس کے ممکن نہیں۔ اور تجسس ہی وہ قوت ہے جو سوال اٹھانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ ان سوالوں کے جواب تراشتے رہنے ہی میں حسن کائنات پوشیدہ ہے۔ حسن دانش کے اس سین عطیے کا کچھ حصہ عالمتاب تشنہ کو بھی نصیب ہوا ہے۔ وہ حیرت کی قوت کا ادراک رکھتے ہیں۔ اُن کے تجسس نے انہیں ایک ایسی بے چین روح عطا کی ہے جو کسی ایک جگہ مطمئن ہونا نہیں جانتی۔ کبھی وہ کوچۂ دلدار میں قدم رکھتے ہیں اور دل کو اختیار میں رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں (گویا ناممکن کو ممکن بنانے کا شاعرانہ مشورہ دُہراتے ہیں) کبھی ماضی کو آواز دیتے ہیں۔ کبھی مستقبل سنوارنے کا احساس دلاتے ہیں۔ کبھی اپنے عصر پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ کبھی اہل عصر پر! کبھی تاریخی شعور کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں، کبھی محض تخیل کی ہنرکاری سے کیاری بھر دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کا مجموعہ مختلف النوع سوالوں کا مجمع حیرت فزا ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیتا ہے۔ سوال اٹھانا بذات خود نہایت اہم بات ہے لیکن انہوں نے ان سوالوں کے جواب بھی حسب استطاعت اور حسب مطالعہ تلاش کئے ہیں یا ان گتھیوں کو اپنے انداز میں سوچا ہے۔

زندگی محفلِ شب کی ہے بس اندازِ شراب　　　پینے بیٹھے تو بس اک گھونٹ ذرا سا نکلا

عالمتاب تشنہ گنجلک زبان استعمال کرنے اور فیشن ایبل ابہام اختیار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ شائستگی اور روانی ان کے اسلوب میں نمایاں ہیں۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے اسلوب میں ابھی پختگی اور ٹھہراؤ نہیں آیا ہے۔ موضوع کے ساتھ ساتھ اظہار بیان

کے پیمانے بدلتے رہتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف آوازیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ آوازیں جب مل جُل کر ایک ہو جائیں گی۔ تشکیل کی منزل ترتیب کے درجے پر فائز ہوگی تو عالمتاب اپنے کسی اگلے مجموعے میں ایک اہم نام کی صورت میں اُبھریں گے۔

——— ڈاکٹر ساجد امجد ———

خواب سفر | شاعر : جاوید منظر
ناشر : مکتبہ عالمین، بی ۱۶۳ بلاک این نارتھ ناظم آباد، کراچی

بیسویں صدی کی جس دہائی میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کا ایک جاندار عنصر یہ ہے کہ کتابیں کثرت سے شائع ہو رہی ہیں جس شاعر نے جو کچھ لکھا ہے اُسے کتابی شکل ملی ہے۔ اس تگ و دو کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس طرح ہر شاعر کا بُرا بھلا کام یکجا ہو کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ مستقبل کے مورخ کے لئے ہم ابھی سے سہولت پیدا کر رہے ہیں۔ جاوید منظر بھی اسی کارواں کے ایک مسافر ہیں' نوجوان نسل کے شاعر ہیں نہایت خاموشی سے ادب کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں اور اب ان کے خوابوں کا سفر "خواب سفر" کے عنوان سے ہمارے سامنے ہے۔

"خواب سفر" ایک ایسے ذہن کی تخلیق معلوم ہوتا ہے جو نہایت شائستہ، سلجھا ہوا، ابہام سے پاک اور اپنی روایت سے محبت کرنے والا ہے۔ جاوید منظر نہ تو چونکانے کے مرض میں مبتلا ہیں اور نہ ہی تقلید کے راستے پر چلتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نہایت سنبھلے ہوئے انداز میں نہایت متانت کے ساتھ انسان سے انسان کے خطاب یعنی شاعری کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی شاعری کلیشے سے لپٹی ہوئی نہیں ملتی۔ ان کی لفظیات ان کے تجربات کے بطون سے پھوٹی ہیں اس لئے ان میں تقلید کا باسی پن نہیں ہے۔ تجربے کا کورا پن ہے۔ ان کی شاعری میں کسی بڑے فلسفے کی تلاش بے سود ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور اس لئے بھی کہ فلسفیانہ اساس کے بغیر بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے۔ ان کی شاعری کا مرکز ان کی ذات ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ بنیادی کردار وہ خود ہیں اور اس کردار سے بہت سے ذیلی کردار و واقعات دھنک کی طرح بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں گفتگو کا انداز ملتا ہے۔ کبھی وہ زمانے سے مخاطب ہوتے ہیں، کبھی خود کلامی کرتے ہیں، کبھی دوستوں سے کلام کرتے ہیں اور یہ ساری گفتگو نرمی اور شائستگی سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں خلوص نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں اقدار کی شکست و ریخت کا رونا نسبتاً کم ہے۔ وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ "ہم خود معاشرہ ہیں"۔ ممکن ہے وہ اگلی جست میں ذات سے کائنات کی طرف قدم اٹھائیں۔

جاوید منظر کے ہاں فکر و جذبہ بوجھل ہو کر لفظوں میں نہیں ڈھلتے بلکہ ایک کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ بیزاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ نشاط، عزم، تلاش، امید، کامیابی کا احساس زیادہ ہے اور یہی توقع ہمیں ہر نوجوان سے رکھنی چاہئے۔ ان کی شاعری ابہام سے پاک ہے اور کسی شاعر کا یہی بنیادی وصف ہے۔ اچھی اور بڑی شاعری تو بعد کی بات ہے شعر صحیح تو ہو، ابلاغ کا حق تو ادا کرتا ہو۔ جاوید مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے جذبوں کی ترسیل کا ہنر سیکھ لیا ہے۔

——— ڈاکٹر ساجد امجد ———

واسوخت | شاعر : راشد مفتی
ناشر : مکتبۂ اسلوب، پوسٹ بکس ۲۱۱۹، ناظم آباد، کراچی۔

"واسوخت" راشد مفتی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۶۴ غزلوں اور متفرقات پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں پر رائے دیتے ہوئے منیر نیازی

نے لکھا ہے "میں اور راشد مفتی ہم شہر ہیں، یہ اُردو شاعری کا نیا شہر ہے۔" یہ نیا شہر کون سا ہے؟ اگر اس کا کھوج لگایا جائے تو راشد کا قیام اور اہمیت بہ آسانی تلاش اور متعین کی جاسکتی ہے۔ یہ نیا شہر پاکستانی غزل کی اس نئی روایت سے عبارت ہے جس میں زمین کی خوشبو اور گرد و پیش کے ماحول کو گرفت میں لانے کے واضح نشانات ملتے ہیں۔ اس روایت کے دو پہلو نہایت اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر خود اس فضا کا کردار بنتا ہے، دوسرا پہلو ایک بے باکانہ احتجاج ہے جو منفی تبدیلیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔

راشد مفتی نے اپنے لئے دوسرے پہلو کا انتخاب کیا ہے لیکن ان کی عظمت یہ ہے کہ انہیں ہر قدم پہ احساس رہتا ہے کہ وہ غزل لکھ رہے ہیں۔ اور غزل محبت اور نرمی کی زبان میں سمجھی اور سمجھائی جاسکتی ہے۔ اس لئے ان کا یہ احتجاج نہ تو محض بیانیہ (STATEMENT) نظر آتا ہے اور نہ ہی نفرت اور زہرناکی میں ڈھل سکا ہے۔ البتہ ہلکا سا طنز ضرور اُبھرتا ہے جو ایک طرف شعر کے حُسن میں اضافہ کرتا ہے، دوسری جانب غور کرنے کے لئے نئے زاویے تراشتا ہے۔

راشد مفتی کی یہ غزلیں فرد اور معاشرے کے نئے روابط، ورا قدار کی ٹوٹ پھوٹ کی زندہ کہانیاں ہیں جن میں جدید معاشرے کے جسم اور رُوح کے تضادات اُبھر کر سامنے آگئے ہیں۔ راشد صرف آپ بیتی بات نہیں کرتے بلکہ ان کی ذات تو ایک ایسا آئینہ بنتی نظر آتی ہے جس میں وہ دوسروں کے چہرے دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ اور بہ حیثیت ایک بالغ نظر شاعر ان کو ان کھدروں پر ان کی نظر فوراً جاتی ہے جو جدید معاشرے کے جسم پر داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زر پرستی، منافقت، تضاد، باطل نوازی، تنہائی وغیرہ جدید معاشرے کے انعامات ہیں جن کے عکس راشد کی غزلوں میں نمایاں ہیں۔

راشد مفتی کا اسلوب ان کے موضوعات کے اعتبار سے نہایت موزوں ہے۔ وہ لفظوں کو برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں اور نئی لفظیات کی شمولیت کا حوصلہ بھی ان میں ہے۔ انہوں نے کئی ایسے الفاظ نہایت چابک دستی سے استعمال کئے ہیں جو ہرگز غزل کے لئے مناسب نہیں، لیکن مصنف کے حوصلے نے ضرورت بنا دیا ہے۔ مثلاً

خلا میں تاکتے رہتے ہیں چیل کوّوں کو   وہ اہلِ دل جنہیں سودا تھا تیرے تکنے کا

ان کی غزل کا آہنگ مردانہ ہے اور یہی اس دَور کا تقاضا بھی ہے۔ ان کی غزلوں کی تازگی اور کشادگی اس مجموعے کو باوقعت بناتی ہے۔

—— ڈاکٹر ساجد امجد ——

لمحۂ موجود

شاعر : نصرت صدیقی
ناشر : شمع بک اسٹال، بھوانہ بازار، فیصل آباد۔

شہر میں شور ہے قیامت کا
دل کی دھڑکن کسے سنائی دے

جدید عہد کا المیہ یہی ہے کہ یہاں دل کی دھڑکن کا احساس کسی کو بھی نہیں۔ قیامت کی افراتفری اور نفسا نفسی میں سب گرفتار ہیں۔ یہ شعر اس عہد کے ایک نوجوان شاعر نصرت صدیقی کا ہے جو ہم نے ان کے مجموعے "لمحۂ موجود" سے منتخب کیا۔ اس ایک شعر ہی سے مصنّف کی افتادِ طبع کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ لمحاتِ گزراں میں سے لمحۂ موجود کو اہمیت دیتے ہیں۔ گویا وہ ایک حقیقت پسند شاعر ہیں، ایک ایسے شاعر جنہیں اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے غم عزیز ہیں، جو رومانی مزاج اور سماجی شعور کے بل بوتے پر شاعری کرتے ہیں۔ جدید غزل کا ایک بنیادی وصف یہ ہے کہ اس نے حقیقت سے آنکھیں ملانا سیکھ لیا ہے۔ اسی لئے موضوعات کے لحاظ سے اس کا دامن نہایت وسیع ہو گیا ہے۔

نصرت صدیقی کی غزلیں بھی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ پُرخلوص بھی ہو جاتے ہیں لیکن ابھی ان کا یہ خلوص یک رُخا ہے۔ وہ سماجی مسائل کا ادراک بھی رکھتے ہیں، انہیں بیان بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ابھی ان کی ذات ان مسائل کا حصہ نہیں بنی ہے اسی لئے ان کا تجربہ محض تجربہ رہتا ہے، کیفیت نہیں بنتا۔ یہ الگ بات ہے ایسا تجربہ بھی اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتا ہے۔ خارجی فکر پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے خیال انگیزی تو پیدا ہوتی ہے لیکن خیال افروزی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ ان کی غزلیں ہم پر اثر تو کرتی ہیں اور شاعر کے مشاہدے کا احساس بھی دلاتی ہیں لیکن جمالیاتی حسن کی کمی کی شکایت بھی کرتی ہیں۔ کہیں کہیں یہ شمع روشن ضرور ہوئی ہے اور اس مجموعے سے اگر محتاط انتخاب کیا جائے تو ایسے بہت سے اشعار مل جائیں گے جو تجربے اور فن کی آمیزش سے دوآتشہ ہو گئے ہیں لیکن مصنف کا عام رجحان اس طرف نہیں ہے۔

"لمحہ موجود" کی غزلیں جدید عہد کی جدید آواز ہیں جن میں ہمارا عصر اپنے تمام عیوب و ثواب کے ساتھ موجود ہے اور یہ بتا رہا ہے کہ آج کا نوجوان کیا سوچ رہا ہے۔ اگر آئندہ مجموعے میں نصرت صدیقی نے اظہار بیان میں تہ داری پیدا کر لی تو وہ ایک اہم شاعر کی صورت میں سامنے آئیں گے۔

اس مجموعے میں نظمیں بھی شامل ہیں لیکن یہ محض مصنف کا شوق معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں تجزیے اور بیان کا کوئی وصف موجود نہیں۔ نصرت صدیقی کی غزلوں میں امکانات پوشیدہ ہیں۔ وہ غزلیں اچھی کہتے ہیں۔ انہیں غزل کہنی چاہیئے۔

—— ڈاکٹر ساجد امجد ——

شاخِ ویرانۂ دل

شاعر : زوّار حسین
ناشر : مکتبۂ شجر، شاہد کالونی، ملتان۔ قیمت : ۱۲۵ روپے

"شاخِ ویرانۂ دل" زوّار حسین کا مصور شعری مجموعہ ہے۔ زوّار حسین نے اپنی مصوری کی بنیاد "نباتات" پر رکھی ہے۔ وہ شجر کی مختلف حالتوں کا عرفان و ادراک رکھتے ہیں۔ اور ان کو بطور علامت اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی مصوری کی اور ان کی مصوری ان کی شاعری کا پیرہن بن کر اس مجموعہ میں سامنے آئی ہے۔ زوّار حسین کے یہاں موضوعات کی بہتات اور اظہار کا سلیقہ فراوانی ہے جس کی بنا پر ان کی شاعری قدیم و جدید کے امتزاج سے نمو پاتی ہے اور ایک ایسی کیفیت و تاثر پیدا کرتی ہے جو عموماً بڑی شاعری کی اساس و بنیاد ہوتی ہے۔ وہ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں سے اپنی بات کہتے ہیں اور ابہام کی ایک ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جو اُن کو غالب کے رمز آشناؤں میں داخل کر دیتی ہے۔

پھر کسی راز میں کھو جائیں گے یہ برگِ وصال — شاخ کے ساتھ ترے ہاتھ کے سائے ہوں گے
صورتِ حال کی دشواری کا پیاسا میں ہوں — اپنے گرداب سے اُلجھا ہوا دریا تو ہے
صحبتِ گُل نے کیا تھا اس کی ہستی کو غبار — زندگی کی فہم کم تھی آنکھ میں کاجل بہت
ایک ننگِ نارسائی نے کیا اس کو اُداس — ساعتِ گل ٹوٹ کر بے دست و پا آتی رہی
اس طرح ہاتھ اٹھاتا ہے کوئی سوکھا درخت — شام کے وقت پرندے بھی اُتر پڑتے ہیں

زرد اُداسی کے موسم میں تو بھی اپنا حال سُنا
باہر کی سنسان گلی میں چیخ رہی ہے سرد ہوا

مجموعی طور پر زوّار حسین نہ صرف اچھے شاعر بلکہ ایک اچھے مصور بھی ہیں۔ ان کی فکری اساس بڑی مستحکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیر نظر

مجموعہ کی ہر غزل اور ہر نظم میں ایک ایسی ندرت موجود ہے جو کسی نئے فکری زاویہ کا پتہ دیتی ہے۔ اور ایسی مثالیں اُردو شاعری میں خال خال ہی ملتی ہیں۔

—— خواجہ رضی حیدر ——

خوابوں کے جزیرے

شاعر : مہر نگار
پبلشر : ۲/۲ ایم ای ایس کالونی، نیپیئر بیرکس، صدر کراچی۔ قیمت ۴۰ روپے

اردو شاعری کے حوالے سے نئے لکھنے والوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد اوزان و بحور، ردیف و قافیہ، تا قید و شتر گربگی کے آہنی حصار سے باہر نکل کر اپنے احساس کو من و عن لکھنے کی مجنونانہ خواہش میں اظہار کی جس راہ پر نکل پڑی ہے اسے نثری نظم کا نام دیا گیا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ نثری نظم ایک ایسا ذریعۂ اظہار ہے جس کے ذریعے ان احساسات کو بھی شعری قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے جو عموماً غزل اور معرّیٰ نظم میں اظہار نہیں پا سکتے۔ نثری نظم کا قضیہ ابھی جاری ہے اور یہ طے نہیں پا سکا ہے کہ اسے نثر کے خانے میں رکھا جائے یا شعر کے، لیکن یہ بات عموماً تمام نقاد لکھتے ہیں کہ نثری نظم نئے امکانات کا وسیلہ ہے۔ یہ دراصل یکسانیت کے خلاف ایک آوازِ احتجاج ہے اور اسے ان تخلیق کاروں نے اپنایا ہے جو افسانے کی طوالت اور شاعری کی قیود سے گھبرا کر سہل پسندی کی جانب مائل ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے لاتعداد تجزیے نثری نظم کے بارے میں سامنے آ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود نثری نظموں کی تخلیق کا سلسلہ جاری ہے اور کچھ تخلیق کاروں نے جن کا تعلق نئی نسل سے ہے اسے باقاعدگی کے ساتھ اختیار کر لیا ہے۔ "خوابوں کے جزیرے" بھی نثری نظموں پر مشتمل مہر نگار کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ پر محمد علی صدیقی، رئیس امروہوی، سحر انصاری اور راشدہ نثار کی آرا درج ہیں۔ ان آرا میں ہر شخص نے یہ بات لکھی ہے کہ مہر نگار نے اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نثری نظموں میں پرو دیا ہے لیکن کسی نے بھی نثری نظم کی ہیئت اور نثر داری پر گفتگو نہیں کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو تنقید کے منصب پر بذاتِ خود فائز ہیں، آنکھیں بند کر کے رائے دینے کے عادی ہو گئے ہیں اور کسی ایسے تجزیہ سے گزرنا نہیں چاہتے جو اُن کی مقبولیت کو متاثر کر دے۔ مہر نگار نے جو بڑی حد تک نو آموز ہیں اس مجموعہ میں تقریباً ایک سو چالیس نثری نظمیں شامل کی ہیں جو اُن کے مشاہدے اور احساس کی آئینہ دار ہیں۔ یہ نظمیں اپنے اندر ایک افسانوی حُسن اور معنوی تہداری رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں الفاظ کو تخلیقی سطح پر برتنے کا ایک سلیقہ موجود ہے۔ وہ آرائشی کرتبوں سے بے نیاز ہو کر موضوعاتی وحدت کو پیشِ نظر رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان کی ہر نظم میں ارتکاز کی فراوانی ہے، ایک ایسی فراوانی جو پڑھنے والے کو اپنے تاثر میں اسیر رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ زندگی سے بہت قریب ہو کر معاملات کو دیکھتی ہیں اور ان معاملات کے بین السطور جو معنوی تہداری پوشیدہ ہے اُسے الفاظ کا لباس دے دیتی ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسی گھٹن ہے جو ان کو تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ رومانویت اور جنسی بے چینی ان کی نظموں کا اساسی موضوع ہے جس کو کھل کر بیان کرنے کا ان میں حوصلہ بھی موجود ہے۔ ان کی نظم "چاہت" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

میری چاہت کی منہ بند سیپی
کھل تو جائے مگر

کیا تیرے پیار کی بارش کا
کوئی ایک بھی قطرہ
اسے سیراب کر سکے گا

یا پھر ان کی ایک اور نظم "میلی" اسی قسم کی کیفیت کی عکاس ہے۔

شریف لڑکی
جو ایک مرد کی خراب نظر سے ہی
میلی ہوگئی۔

مجموعی طور پر مہتاب نگار پرگراور زود نویس ہیں اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مستقبل میں اپنے تخلیقی تجربہ کو مزید مستحکم انداز میں پیش کریں گی۔

—— خواجہ رضی حیدر ——

بنجر ہتھیلیاں

شاعر : اختر حسین شیخ
ناشر : بحیرہ انٹرنیشنل پبلشرز، لاہور   قیمت : ۴۵ روپے

اختر حسین شیخ بنیادی طور پر پنجابی زبان کے شاعر ہیں لیکن اردو میں بھی شعر کہتے ہیں۔ "بنجر ہتھیلیاں" ان کی اردو غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ غزلیں اور نظمیں قیام پاکستان کے بعد کی اردو شاعری کے اس مزاج کی نمائندگی کرتی ہیں جو بنیادی طور پر پنجاب میں لکھی جارہی ہے۔ یہ شاعری بلاشبہ اپنے اندر غیر مانوس تراکیب و الفاظ کو سمونے میں تو بڑی حد تک کامیاب ہوگئی ہے لیکن اس کی مجموعی کیفیت کا کوئی پیمانہ ابھی ساخت نہیں ہوا ہے۔ اس بنا پر ہم اس شاعری کو تجرباتی تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی مجموعی افادیت سے انکار نہیں کرسکتے۔ اختر حسین شیخ کے یہاں دربدری اور محنت کا احساس موضوع کے طور پر بڑے مؤثر انداز میں نمایاں ہوا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ملازمت کے سلسلہ میں ملکوں ملکوں سفر اختیار کئے ہیں اور سفر و قیام کے اسی سلسلہ کے دوران انہوں نے اُن افراد کی نفسیات کا بڑے قریب سے جائزہ لیا ہے جو حصولِ معاش کی خاطر اپنی زمین ترک کرکے دیارِ غیر میں آباد ہیں۔ اس موضوع پر اختر حسین شیخ کے بعض اشعار تو اتنے پُرتاثیر ہیں کہ حافظے میں فوراً تصویر ہو جاتے ہیں۔

بنجر ہتھیلیوں پر محنت کے داغ لے کر   آیا ہوں آندھیوں میں روشن چراغ لے کر
دُوریوں کی دُھند میں کھو جائیں گے تیرے نصیب   بے سروسامان اک دن لوٹ کے گھر جائے گا
رفتہ رفتہ کھو گئے دونوں فنا کی اوٹ میں   تو فریبِ زر میں تھی اور میں فنا کی اوٹ میں
ابھی نہیں ہے ان کے لئے زر کی تیز دھوپ   بچوں کی فکر کر انہیں بھرپور پیار دے
کیوں کر قرار دے گی زمیں گردشوں میں ہے   پہلے سفر کی اپنے کوئی انتہا کرے

مجموعی طور پر اختر حسین شیخ کی شاعری اپنی روایت میں تازگی اور پُرکاری کے لحاظ سے بڑی حد تک منفرد ہے۔ اس میں زندگی کے دکھ اور سکھ ایک ساتھ روتے اور قہقہے لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ شاعری امکانات کی شاعری ہے اور یقیناً یہ امکانات اختر حسین شیخ کے معروف مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں۔

—— خواجہ رضی حیدر ——

موجِ واپسیں

شاعر : جبرئیل صدیقی
ناشر : مجلسِ مصنفین، حیدرآباد۔   قیمت : ۳۰ روپے

جبرئیل صدیقی مرحوم کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں اُن کی غزلیں شامل ہیں۔ یہ غزلیں اگرچہ زمانہ زیادہ چونکا دینے والی نہیں ہیں لیکن ان میں ایک شعری سلیقہ اور فکری تہذیب کی فراوانی ہے۔ ان کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے محسوسات کے اظہار پر قادر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اپنی بات کیسے اور کس طرح کہی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبرئیل صدیقی کی شاعری کو کسی نظریاتی یا فکری خانہ

میں نہیں رکھ سکتے بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک حساس اور باکمال شخص کے جذبات کی سچی اور اچھی تصویر ہے۔ موضوعات کی ندرت نے اشعار کی تاثیر کو جہاں دوچند کر دیا ہے وہاں یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ کسی خیال کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے اندر کی توانائی کتنا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

دل ہی سے یقین کی فضا ہے — جب جان ہے تو جہان ہو گا
دھوپ کا اتنا بھی پندار یہ کیا — جل گیا سایۂ دیوار یہ کیا
جو اندھیرے کی علامت ہے وہ گہرا سایہ — جب درختوں سے گری دھوپ فروزاں دیکھا
وہ خود ہے کہیں، اس کی نظر اور کہیں ہے — نغمے سے الگ ساز ہے معلوم نہیں کیوں
اڑتی پھرے گی خاک خرد دور دور تک — کچھ زاویے جنوں کا بڑھا کر تو دیکھئے
حیرت عشق تجلی کا سکوت — ایک کا ایک نگہبان ہے کہ بس
بلندیوں سے گرا آبشار کی صورت — مثال موج میں دریا سے بیکراں سے اٹھا

مجموعی طور پر جبریل صدیقی کی شاعری ذات و کائنات کے تمام ایسے مسائل سے تعلق رکھتی ہے جو ایک حساس آدمی کی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ "موج واپسیں" پر سہیل آغائی اور سید کاظم رضا کے علاوہ جو اس مجموعہ کے مرتب بھی ہیں، مشفق خواجہ، سرشار صدیقی اور محشر بدایونی نے بڑے فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔

— خواجہ رضی حیدر

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مرتب : مشرف احمد
ناشر : نفیس اکیڈمی، کراچی

منشی پریم چند کو اردو افسانے کا میر تقی میر کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند اردو کے پہلے باقاعدہ افسانہ نگار ہیں باقاعدہ یوں کہ ان سے پہلے اردو میں مختصر افسانے کی روایت اپنے صحیح تناظر کے ساتھ نہیں ملتی۔ یہ صنف ادب انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئی ہے اور انگریزی کی SHORT STORY کا اختصار، جامعیت اور کسی ایک خاص واقعہ کا پُرتاثر اظہار، نثری کہانی کی صورت میں پہلی بار اردو سے متعارف کرانے کا اعزاز پریم چند کو ہی ملا ہے۔ کیوں کہ ان سے پہلے منظوم مختصر کہانیاں مثنوی کی شکل میں تو اردو میں موجود تھیں مگر نثر میں مختصر کہانیوں کی کوئی روایت اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ یہ پریم چند ہی تھے کہ جنہوں نے انگریزی کی مختصر کہانی کو نہ صرف اردو سے متعارف کرایا بلکہ ڈھائی سو سے زیادہ خوبصورت کہانیاں لکھ کر اردو میں مختصر افسانے کو استحکام بخشا اور اردو ادیبوں کو اظہار کے ایک مؤثر ذریعے سے روشناس بھی کرایا۔ مگر افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے یہاں ان پر وہ تنقیدی و تحقیقی کام نہیں ہوا جس کے وہ متقاضی ہیں۔

معروف افسانہ نگار مشرف احمد نے "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" کے عنوان سے یہ کتاب مرتب کر کے اس سمت میں ایک قابل ستائش پیش رفت کی ہے۔ اس کتاب میں شامل مقالات و مضامین پہلے سے شائع شدہ ہیں۔ مگر یہ ہند و پاک کے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے تھے۔ مشرف احمد نے تنقیدی شعور کے ساتھ ان بکھرے ہوئے مقالات کا انتخاب کتابی صورت میں یکجا کیا ہے۔ پریم چند پر چوں کہ زیادہ کام بھارت میں ہوا ہے، لہٰذا یہاں ان مقالات کو ادب کے قاری تک پہنچانے کی زیادہ ضرورت تھی تاکہ پریم چند کی فنی عظمت کے نئے پہلو سامنے آسکیں۔ مشرف احمد نے مقالات کے انتخاب میں اس اہمیت کو ملحوظ رکھا ہے اور ہندوستان اور پاکستان میں پریم چند پر لکھے جانے والے قابل احترام اور اہم ناقدین کے مضامین کو اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین ، ڈاکٹر محمد حسن ، اصغر علی انجینئر ، ڈاکٹر شمیم حنفی ، غافل انصاری ، ڈاکٹر مسعود حسین ، پروفیسر وقار عظیم ، پروفیسر مجتبیٰ حسین ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور خود مشرف احمد کے مضامین میں پریم چند کی افسانہ نگاری کی مختلف جہتوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ پریم چند کی ناول نگاری پر بھی پروفیسر ممتاز حسین ، علی عباس حسینی ، ڈاکٹر قمر رئیس اور حامدی کاشمیری کے اہم مضامین شامل ہیں ۔ کتاب میں " پریم چند ۔ حیات و تصانیف " کے عنوان سے پریم چند کی پیدائش سے لے کر موت تک کی پوری زندگی کا مختصر اشاریہ بھی موجود ہے اور کتاب کے آخر میں شیش زیدی کی مرتب کردہ پریم چند کی افسانہ نگاری کے مختلف ادوار کے افسانوں کی ایک تفصیلی فہرست جو دو سو آٹھ افسانوں پر مشتمل ہے ، اشاریہ کی صورت میں شامل ہے ۔

اس طرح یہ کتاب ادب کے قاری کے لئے انتہائی اہم ہوگئی ہے ۔ اور پریم چند کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتی ہے ساتھ ہی یہ کتاب ادبیات کے طلبا کے لئے بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ ایم ۔ اے ۔ اردو کے طالب علموں کو پریم چند پر اب تک علیحدہ کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی ۔

—— صابر وسیم ——

ہم سفر بگولوں کا

مصنف : طاہر تونسوی
ناشر : سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ۔ قیمت : ۷۵ روپے

طاہر تونسوی کی یہ کتاب دراصل ڈاکٹر سلیم اختر کے فن اور شخصیت کا مطالعہ ہے ۔ اس بنا پر یہ سوانحی اور ادبی دونوں ضرورتوں کو پورا کرتی ہے ۔ سلیم اختر جنہوں نے عمرِ عزیز کی پانچ دہائیاں مکمل کر کے چھٹی دہائی میں قدم رکھا ہے نہایت زُود رقم ادیب ہیں اور شاید یہی اُن کی ایک ایسی خوبی ہے جس نے نہ صرف ان کو بہت جلد متعارف کرایا بلکہ اپنے ہم عصروں میں قدآور بھی بنا دیا ہے ۔ وہ بیک وقت ایک افسانہ نگار ، نقاد ، ماہرِ نفسیات اور ماہرِ اقبالیات کے درجے پر فائز ہیں ۔ ان کے ان گنت مضامین و مقالات برصغیر پاک و ہند کے تقریباً تمام معروف جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ علاوہ ازیں اب تک ان کی تقریباً دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ یہ تمام کام اُن کی عمر کے لحاظ سے نہ صرف زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے ۔ بسا اوقات زُود نویسی ادیب کا اعتبار مجروح کر دیتی ہے لیکن فی زمانہ سلیم اختر شاید واحد ادیب ہیں جن کا اعتبار نہ صرف مستحکم بلکہ ارتقا پذیر ہے ۔ سلیم اختر ایک ہمہ جہت ادیب ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں ایک مرکزیت موجود ہے اور وہ مرکزیت ان کی علمِ نفسیات پر دسترس ہے ۔ وہ افسانہ لکھیں یا تنقید لکھیں ان کی ہر تحریر کے باطن سے ان کا علمِ نفسیات چہرہ نمائی کرتا نظر آتا ہے ۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے مختلف عنوانات کے ساتھ ان کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے تاکہ قاری تفہیم کی منزل سے بہ آسانی گزر جائے ۔ یہ کتاب جہاں حرفِ عقیدت کا درجہ رکھتی ہے وہاں دعوتِ فکر بھی ہے اُن افراد کے لئے جو اپنے معاصرین کے حق میں کلمۂ خیر کہنے سے صرفِ نظر کرتے ہیں ۔ سلیم اختر شاید وزیر آغا کے بعد دوسرے قابلِ ذکر ادیب ہیں جن کی شخصیت اور فن کا احاطہ ان کی زندگی میں ہی ایک کتاب کی صورت میں کیا گیا ہے ۔ طاہر تونسوی اپنی اس کاوش پر مبارکباد کے مستحق ہیں ۔

—— خواجہ رضی حیدر ——

چاند میری زمیں

شاعر : ساقی جاوید
ناشر : نفیس اکیڈمی ، کراچی
قیمت : ۴۵ روپے

" چاند میری زمیں " قومی نغموں پر مشتمل مجموعۂ کلام جس کے خالق ممتاز و نامور شاعر ساقی جاوید ہیں ۔ ان کے کئی نغمے ریڈیو اور ٹی ۔ وی سے

نشر ہوکر مقبول گردش و نگاہ ہو چکے ہیں۔ اس مقبولیت سے قطع نظر اب جب کہ یہ نغمے کتابی صورت میں سامنے آئے ہیں تو ان کو ایک ادبی حیثیت بھی حاصل ہوگئی جو اپنے پڑھنے والوں سے اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

قیام پاکستان کے بعد دو اصنافِ سخن خاص طور پر مروّج و مقبول ہوئیں یعنی نعت گوئی اور قومی و ملی شاعری۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے نعتیں نہیں لکھی جاتی تھیں یا قومی نغموں کا وجود نہیں تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اب کثرت سے نعتیہ مجموعے سامنے آئے۔ قومی شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ ہماری قدیم شاعری میں بہت دن تک تو وطن کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، نہ شاعر کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ یہ ترانے الاپے۔ پہلی مرتبہ حالی وغیرہم کے یہاں وطن کا تصور ابھرتا ہے مگر یہ تصور مغرب سے درآمد شدہ تھا اور سیاسی مصالح پر مبنی تھا۔ قومی تصور اتنا واضح نہیں تھا۔ لیکن حالی ہی کے یہاں بعد میں "شکوۂ ہند" اور "صبح اُمید" وغیرہ میں قومی تشخص نمایاں ہونا شروع ہوا۔ اقبال کے ابتدائی کلام میں شامل نظموں کو چھوڑ کر سب کی سب ملی تشخص کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مگر اس وقت تک وطن کا وجود نہیں تھا۔ فقط قوم موجود تھی قیام پاکستان کے ساتھ ہی قومی شاعری کے لئے میدان ہموار ہوگیا۔

قومی شاعری کی اساس وطن سے عقیدت، مسائل و معاملات، حریت و آزادی، عزم و یقین، حوصلہ و مردانگی، وطن کے کھیت کھلیان، کسان مزدور، دریا میدان غرض ہر اس چیز پر قائم ہے جو وطن سے تعلق رکھتی ہے۔ ان موضوعات پر مشتمل نظمیں قیام پاکستان کے ساتھ ہی شعراء کی زبانوں پر آگئی تھیں لیکن ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد قومی شاعری ایک تحریک کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے وطن کو گلہائے عقیدت نہ پیش کئے ہوں۔ انہی وطن پرست شعراء میں نہایت وقیع نام ساقی جاوید کا ہے۔

ساقی جاوید کے یہ نغمے کیف و سرور، شادابی و تازگی، ہمت و جرأت، سرشاری اور جذبے کی کیفیات کے ساتھ ساتھ پختہ فکری گہرائی اور ادبی شان کے حامل ہیں۔ ان نغموں کے پیچھے ایک پرخلوص دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے، ایسا دل جو محبت کے رنگوں اور جذبوں کی خوشبو سے وطن کے ریگستانوں اور میدانوں تک میں معنویت اور تاریخی شعور کا چمن کھلا ہوا نظر آتا ہے۔

عام طور پر موضوعاتی شاعری یک رخی ہوجاتی ہے۔ شاعر کی تخلیقی قوت کا رخ محض موضوع کی جانب رہتا ہے، فنکاری و پرکاری کی طرف نہیں! ساقی کے نغمے اس کمزوری سے مبرا ہیں۔ ان میں حد درجہ تناسب موجود ہے۔ موضوع پر گرفت بھی موجود ہے اور فنی قدرت بھی۔ خوش گوار آہنگ، امیجز کی ندرت، تراکیب کی جدت اور موسیقیت کی فراوانی ہے۔ ان نغموں کی مخصوص انفرادیت ان کا مخصوص تنوع ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی اور ہیئت و اسالیب کے اعتبار سے بھی۔

اس کتاب میں آزادی کے نغمے، امن کے گیت، جنگی ترانے شخصیات، مزدور، کسان، دریا، پہاڑ سب کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ہیئت و اسلوب بار بار بدلتے رہتے ہیں۔ مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی کرکے تو کہیں مصرعوں کی تکرار سے آہنگ، تال اور سُم کو اُبھارا گیا ہے۔ اور اس شاعرانہ شعور کے ساتھ کہ یہ تجربات موضوع کا مستقل ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔

"چاند میری زمیں" ہر اعتبار سے ایک وقیع کتاب ہے اور مطالعہ کی سنجیدگی کی طالب ہے۔

——— ڈاکٹر ساجد امجد ———

یہ چراغ ہے تو جلا رہے

شاعر : سلیم کوثر
ناشر : علی فیصل پبلی کیشنز، کراچی
قیمت : ۳۵ روپے

"خالی ہاتھوں میں ارض و سما" کے بعد سلیم کوثر کا دوسرا شعری مجموعہ "یہ چراغ ہے تو جلا رہے" منظرِ عام پر آیا ہے جو اُن کی غزلوں اور

نظموں پر مشتمل ہے۔

سلیم کوثر جدید نسل کے قافلے میں شریک شعراء میں سے ایک ہیں۔ ان کی غزل کے موضوعات کم و بیش وہی ہیں جو اس نسل کا مقدر ہیں لیکن انہوں نے فنی رویوں، جدت کاری اور اظہار کی سرشاری سے اس حصار کو توڑ کر اپنی انفرادیت بھی قائم کی ہے۔ یہ انفرادیت حیرت، تجسس اور خواب دیکھنے کے عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کی غزل پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پس پردہ کوئی آواز ہے جو انہیں بلا رہی ہے۔ کوئی خوشبو ہے جو انہیں پکار رہی ہے، حیرت میں اضافہ کر رہی ہے۔ وہ اس پردے کو ہٹاتے ہیں، کبھی حیرت کا سناٹا راہ تکتا ہے، کبھی کوئی جواب مل جاتا ہے۔ یہ دونوں تاثر ان کی غزلوں میں مل جاتے ہیں۔ کہیں تحیر آمیز ابہام، کہیں فیصلہ کن انعام۔ یہی ان کی غزل کا سرمایہ ہیں۔

ایک شاعرانہ سرمستی ان کی ذات اور کلام دونوں کا حصّہ ہے۔ اسی کو انہوں نے لہو کی تال پر رقص کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ سلیم کوثر اپنے تنقیدی رویوں میں نہ تو جدید ہے نہ ترقی پسند۔ اس کی اس غیر جانب داری نے اُسے یہ شعور دیا ہے کہ وہ زندگی کو خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتا، وہ سب کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے بلکہ خود "سب" میں شریک ہوجاتا ہے اور یوں خواب حقیقت، داخل خارج، ذات کائنات سب ایک ہو کر لہو کی تال پر رقص کرتے ہیں۔

وہ غزل کا پارکھ ہے، اس لئے غزل کے محاسن پر اس کی گہری نظر ہے مگر کہیں کہیں تخلیقی بہاؤ میں بہہ کر بعض غلطیوں سے بے خبر بھی گزر گیا ہے مثلاً انکاری بمعنی "انکار"، "پتا" بمعنی خبر یا علم لکھنا یا "آخر" کو آخیر لکھ دینا۔ بظاہر یہ نہایت معمولی غلطیاں ہیں لیکن شاعری "الفاظ کا کھیل" ہے اور پھر ایسے خوبصورت مجموعے میں معمولی غلطی بھی کیوں ہو؟

اس مجموعے میں چند غزلیں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر نظمیں الگ الگ عنوانات کی حامل ہونے کے باوجود ایک مجموعی تاثر رکھتی ہیں۔ سب کی سب گمشدہ ماضی کو آواز دے رہی ہیں۔ یہ ایک ایسے جبریہ دَور کا المیہ ہیں جہاں پاؤں کی زنجیریں کسی کو بھی روحانی خواہشوں کی سمت لپکنے نہیں دیتیں۔ یہ بظاہر عشقیہ نظمیں ہیں، کسی حد تک ذاتی بھی لیکن وسیع تناظر میں اجتماعی فکر کی آئینہ دار بھی ہیں۔ ان نظموں کا آغاز و اختتام، دروبست، روانی و برجستگی، مصرعوں کی دروبست اتنی بھرپور ہے کہ سلیم کوثر ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان کی غزلیں تو با اعتبار یقیں ہی، نظموں میں وہ اور بھی زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب مجموعۂ کلام ہے جس میں عہد جدید کے روحانی تجربات نہایت تہذیب و شائستگی سے رقم ہوئے ہیں۔

——— ڈاکٹر ساجد امجد ———

میری نظمیں میرے گیت

شاعرہ : صائمہ خیری
ناشر : علامہ راشد الخیری اکیڈمی، الاکو ہاؤس، کراچی
قیمت : پچاس روپے

"میری نظمیں میرے گیت" صائمہ خیری کا مجموعۂ کلام ہے جس میں نظموں اور گیتوں کے علاوہ ان کی چند غزلیں بھی شامل ہیں۔ صائمہ کی یہ تخلیقات بہ اعتبار اسلوب ہندی سے قریب ہیں، فارسی سے دُور اور مغربی ڈکشن سے بہت دور ہیں۔ اس لئے موجودہ شعری صورت حال میں یہ مجموعہ منفرد بھی نظر آتا ہے اور اپنی طرف کھینچتا بھی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں فارسی کے زوال کے بعد بعض اصحاب کی کوششوں سے اردو شاعری کچھ دیر کے لئے ہندی روایت اور مقامی اثرات کے قریب گئی تھی لیکن جلد ہی مغربی اثرات کا غلبہ ہوا اور انگریزی ادب سے متاثر ہونے کا دَور شروع ہوگیا۔ اب صائمہ کے ہاں اسی بھولی بسری یاد کو دہرانے کا عمل نظر آتا ہے۔

زمین اور زرخیزی سے محبت ، ہندو معاشرے کے تصورِ حقیقت میں شامل ہے : اسی لئے ہندی شعری روایت زمین سے اُوپر اٹھنے کی کوشش نہیں کرتی۔ زمین سے چمٹے رہنے کی نفسیات نے مبالغے کی ماورائیت کی بجائے حقیقت بیانی کی طرف جھکاؤ کی کیفیت پیدا کی ہے۔ بُت کی پرستش نے قریبی اشیا کی ترجمانی کی طرف مائل کیا ہے۔ ہندی روایت تخیلاتی فضا کی بجائے جذباتیت پر انحصار کرتی ہے اور جذبہ ہمیشہ سادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے سادگی اور جذباتیت ہندی شاعری کی نمایاں صفات ہیں۔ صائمہ خیری ہندی شعری روایت سے متاثر ہوتے ہی فطری طور پر اس تصورِ حقیقت کے قریب چلی گئی ہیں۔ ان کے یہاں بھی جذبے کی شدت ، بیان کی سادگی ، قریبی اشیا ، جذبوں ، خواہشوں اور رشتوں سے لگاؤ ، حقیقت بیانی اور ایک محدود دنیا کے شب و روز سے بے پناہ محبت نظر آتی ہے۔ صنعتی دور کی کثافتوں کا سایہ تک ان کی نظموں پر نہیں پڑا ہے۔ اس لئے ہم تھوڑی دیر کے لئے شاعرہ کے ساتھ اس کی دنیا میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور جب اس دنیا سے باہر آتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے ، اسی باعث یہ دنیا اچھی لگتی ہے۔

ہندی شاعری میں چونکہ اظہارِ عشق عورت کی جانب سے ہوتا ہے ، اسلئے اس کے اسلوب میں زنانہ پن شامل ہو گیا ہے۔ صائمہ چونکہ عورت ہیں اس لئے یہ زنانہ پن ان کی شاعری کی خوبی بن گیا ہے (کسی مرد کی زبان سے مجھے کوئی گیت کبھی اچھا نہیں لگا)۔ صائمہ کی شاعری کے ذریعے ہمارا تعارف خالص مشرقی عورت سے ہوا ہے جس کی دنیا ، دولت سب کچھ اپنے جذبے ، بابل کا دوار ، بھائی بہنوں کی محبت اور ساجن کی گلی ہوتا ہے ورنہ مغرب کے طفیل ہماری شاعری میں ایک باغی عورت داخل ہو چکی ہے۔

اس مجموعے میں ان کی چند غزلیں بھی شامل ہیں اور یہی ان کی کتاب کا کمزور ترین حصہ ہے۔ ہندی اسلوب نظم اور گیت میں تو نبھ گیا ہے لیکن غزل کی اپنی روایت ہے۔ رمزیت ، تغزل ، تہ در تہ اندازِ بیان ، زمین سے اوپر اٹھنے کی تڑپ ، سادگی کے ساتھ پرکاری کا امتزاج وغیرہ غزل کے لازمی عناصر ہیں۔ لہٰذا جب صائمہ اس کو بھی ہندی اسلوب کی یک رُخی سادگی میں ڈھالتی ہیں تو وہ لطف نہیں آتا جو اُن کی نظموں اور گیتوں میں !

ہندی روایت کو پوری طرح قبول کر کے ہم کسی سے یہ اُمید نہیں کر سکتے کہ وہ بڑی شاعری کر سکے گا۔ مشاہدے کی جس باریکی ، فکر کی جس گہرائی اور ذہن کی جس کشادگی کی ضرورت بڑی شاعری کے لئے ہوتی ہے وہ اس روایت کو میسر نہیں۔ اس لئے صائمہ خیری کو بھی سوچنا پڑے گا کہ وہ اس محدود دنیا پہ انحصار کرتی ہیں یا آئندہ وہ اس دائرے سے باہر قدم نکالیں گی ؟ جذبے بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن صرف جذبے ہی سب کچھ نہیں۔ حقیقت اہم ہے لیکن تخیل کی جلوہ گری بھی کم مزے دار نہیں !

ــــــــ ڈاکٹر ساجد امجد ــــــــ

اعجازِ سخن

شاعر : اعجاز جودھپوری
ناشر : فنکدہ 180-A تاج چیمبرز ، نیو ٹاؤن ، میرپور خاص۔
قیمت : ۳۰ روپے

پیشِ نظر کتاب "اعجازِ سخن" جناب اعجاز جودھپوری کا مجموعۂ کلام ہے جو ۹۳ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اعجاز جودھپوری مدت دراز سے میرپور خاص میں مقیم ہیں۔ اور وہاں کی ادبی دنیا کے نہایت اہم فرد ہیں۔ چھوٹے شہر میں رہنے کی وجہ سے اور شاید اپنے مزاج کی سادگی کے طفیل وہ زیادہ مشہور نہ ہو سکے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے شب و روزِ حیات کا ایک طویل سلسلہ چمن زارِ شعر کو سنوارنے میں صرف کیا ہے۔ ان کی شعری تربیت نہایت روایتی ماحول میں ہوئی اور شاید مزاجاً بھی وہ نئی چیزوں کو قبول کرنے کے روادار نہیں۔ اس لئے ان کی شاعری ، موضوع و اسلوب ہر دو اعتبار سے روایت کی چہار دیواری میں سانس لیتی ہے۔ وہ اپنے اصولوں میں روایت پسند نہیں بلکہ روایت پرست نظر آتے ہیں۔

ساٹھ سال کی عمر سے آگے کے آدمی سے ہم اس سے زیادہ امید بھی نہیں کر سکتے۔ ویسے وہ شاعری اور اس کے فنی رموز سے واقف ہیں اور محاسن شعر کی قدیم روایات سے آگاہی رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں "تاریخ گوئی" سے متعلق ان کی کتاب "نوشتۂ تاریخ" شائع ہوئی تھی اور اب ۱۹۸۵ء میں "اعجازِ سخن" ہمارے سامنے آئی ہے۔

"اعجازِ سخن" کی غزلیں جدید ذہن کو قابلِ قبول نہ ہوں، ان کا ڈکشن نیا نہ ہو لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان میں شاعر کا خلوص اور روایت سے پاسداری نظر آتی ہے۔ ان غزلوں کی فکر تجریدی ہے، حقائق سے تعلق کم ہے، مسائلِ حیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ البتہ عشقیہ واردات و جذبات کی سرشاری ضرور نظر آتی ہے جو قدیم غزل کی ایک خاص شاخ کا نمایاں وصف ہے۔

جہاں کہیں اعجاز صاحب جدید عہد کی لفظیات سے قریب ہوئے ہیں، وہاں انہوں نے ایسے شعر بھی نکالے ہیں۔

ان کا احسان عیادت بھی تو بیمار پہ ہے　　　بوجھ اور بوجھ بھی گرتی ہوئی دیوار پہ ہے

—— ڈاکٹر ساجد امجد ——

خواب دریچہ

شاعر : جلیل عالی
ناشر : یوسف اختر صدیقی، راولپنڈی
قیمت : ۴۵ روپے

جلیل عالی ایک ایسے توانا اور باشعور شاعر کا نام ہے جو خواب دیکھتا ہے مگر حقیقت سے آنکھ ملانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ ان دو متضاد کیفیات سے گزرتے ہوئے اور ان کو ایک کرتے ہوئے جس ٹوٹ پھوٹ سے گزرنا پڑتا ہے اسی کی منظوم کہانی ہے وہ کتاب جس کا عنوان ہے "خواب دریچہ"۔

"خواب" ذاتی عمل ہے اور دریچہ کے ادھر حقیقت کی دنیا آباد ہے۔ ذات اور خارج کے تصادم سے جو حسی کیفیات رونما ہوتی ہیں جلیل عالی کے اشعار انہی کیفیات سے عبارت ہیں۔ ان میں خواہشات کا رومانس بھی ہے، حقیقت کی تلخیاں بھی! صداقت کی جستجو بھی ہے اور جستجو کی شکستیں بھی! ذات کی نفسیات بھی ہے اور خارج کی کائنات بھی! گویا جلیل عالی اس عہد کا نوجوان، سوچنے والا ذہن ہے۔ اس لئے اس کے اشعار میں اس کے عہد کے وہ عیب و ثواب جو انسانی نفسیات کو مرتب کرتے ہیں اور عمل و ردِ عمل کی کشمکش کا باعث بنتے ہیں نہایت وضاحت کے ساتھ آئے ہیں۔ عالی چوں کہ شاعر ہے اور غزل لکھ رہا ہے اس لئے اس نے حسی تصویریں بنائی ہیں اور انسانی نفسیات کے بہت سے اسرار کھولے ہیں۔ یہی اس کی کامیابی ہے۔ "شوق" اور "سوچ" کے اس سفر میں اس نے خوابوں کو بکھرتے بھی دیکھا ہے لیکن اس کی شخصیت بکھری نہیں ہے۔ اس کی یہی توانائی اس کی غزل کا مثبت پہلو ہے۔ اس کے یہاں بکھرنے کے بعد سمٹنے کا عمل بڑی تیزی سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے شعروں میں رجائیت کا عنصر غالب ہے۔

"خواب دریچہ" کی غزلیں نئی، تازہ، شاداب اور توانا غزلیں ہیں۔ عالی نے حقیقت کو بہت قریب سے چھوا ہے لیکن شاعری کی خواب آلود فضا بھی نظر آتی ہے جو شعریت کی بحالی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

جہاں تک اسلوبِ بیان کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جلیل عالی کی غزلیں جدید دھاگے کی کشیدہ کاری ہیں۔ جمالیات کی ایک نئی فضا تخلیق کرتی ہیں۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ بہت سے نوجوانوں کی طرح انہوں نے بھی تجربے کے شوق میں کچھ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ان کے ہاں دو قسم کی جدتیں (اگر انہیں جدت کہا جائے) نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اضافت اور ترکیب سازی کے اصول کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ ثانیاً یہ کہ افعال کی نئی صورتیں داخل کی ہیں۔ اس کے ان دو شعروں سے اسی جرأت کا اظہار ہوتا ہے۔

اب کی بہاروں جوبن پہ تھے شوق شجر کتنے — کس کو خبر تھی آجائیں گے درد ثمر کتنے

یا

دھا کے سورج نگر سے دل نے کرن سندیسہ نہ کوئی پایا — گزار دیں کتنی چاند راتیں فراق لمحے شمار نے میں

ان تجربات کی اس لئے بھی کوئی وقعت نہیں کہ یہ جلیل عالی کی اولیات میں سے نہیں۔ ان سے پہلے ظفر اقبال اور افتخار جالب اور انیس ناگی وغیرہ یہ کام کر کے ناکام ہو چکے۔ کتاب کے پیش لفظ میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے ان کے اس فعل کو بہت سراہا ہے اور یہاں تک کہہ گئے کہ اردو میں افعال کی جو کمی ہے اسے پورا کرنے کا ایک سہل طریقہ تجویز کر دیا ہے۔" (عالی نے)۔ ہم تو صرف اتنا عرض کریں گے کہ اسی افعال کی کمی والی اردو نے غالب، اقبال اور فیض پیدا کر دیئے۔ مزید یہ کہ اگر یہ اتنی ہی اچھی تجویز ہے تو خود قاسمی صاحب نے اب تک اس پر عمل کیوں نہیں کیا!

ان گزارشات کے بعد اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ اس کتاب میں بہت سے بہت اچھے شعر پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ممکن ہے جلیل عالی دوسری کتاب میں ان تجربات سے ہاتھ اٹھالیں اور زبان کی جمالیات کو تخلیقی غزلوں کی زک سے بچالیں۔

——— ڈاکٹر ساجد امجد ———

صلیبِ انقلاب

شاعر : پروفیسر منظور حسین شور
ناشر : ای۔ آئی پبلیکیشنز، کراچی
قیمت : ۵۷ روپے

پروفیسر منظور حسین شور ہمارے عہد کے وہ کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں جن کا شعری سفر نصف صدی کو محیط ہے۔ پیش نظر مجموعہ بہ اعتبار ترتیب ان کی پانچویں تخلیق ہے۔ اس سے پہلے "نبضِ دوراں"، "دیوارِ ابد"، "سوادِ سیم تناں" اور "میرے معبود" اشاعت سے ہم کنار ہو چکے ہیں۔

شور صاحب شعری شریعت کے اعتبار سے انسان دوست فن کار ہیں۔ یوں تو ہر فن کار اسی سنت کا پیرو ہوتا ہے لیکن شور صاحب کا پورا شعری سفر اسی ایک موضوع کے گرد گھومتا ہے۔ اس لئے یہ ان کی مخصوص انفرادیت ہے۔ وہ انسانی جذبات کا نہیں، انسانی مسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ احترامِ آدمیت کا نظریہ ان کے ہاں بڑی وضاحت سے نمایاں ہوا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ عمیق اور تجربہ کثیر ہے۔ ان صلاحیتوں کی بدولت وہ لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر کائناتی مسائل پر گرفتِ نگاہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے تنوع اور دیدۂ بیداران کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسی لئے وہ خود کو "شاعرِ حیات" کہتے ہیں۔ اور یہ حیات بھی انہیں اس لئے عزیز ہے کہ یہ انسان ہی کا دوسرا نام ہے۔ انسانی حیات، انسانی قدروں کا نام ہے۔ اس وہ ان قدروں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں جو انسان کو انسانیت کے درجہ پر لانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ انہیں قدروں کی پامالی پر دکھ ہوتا ہے۔ یہ کرب انہیں ایک نئی دنیا کی تخلیق پر اکساتا ہے اور وہ انقلاب، آزادی، امن، عدل اور ارتقا کے نغمے بلند کرتے ہیں۔ وہ جنگ و جدال کے موسم میں بقائے بشریت کے شاعر ہیں۔ قومی و بین الاقوامی مسائل پر ان کی نظر ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری اجتماعی شعور عطا کرتی ہے۔

"صلیبِ انقلاب" تین اصناف کی کہانی ہے یعنی اس میں نظمیں، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں۔ نظموں میں عصری و تاریخی مسائل کا براہِ راست بیان ہے، غزلوں میں ان مسائل کا پیدا کردہ احساس اور رباعیات میں حکیمانہ افکار!

شور صاحب تربیت کے اعتبار سے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب مصرعوں کی چستی، الفاظ کا استعمال اور دوسرے محاسن شعر کا خیال رکھا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ اوصاف ان کی شاعری کی بے مثال پہچان ہیں۔ البتہ علم کی زیادتی اور فکر کو اولیت دینے کے نتیجے میں ان کی نظموں سے شگفتگی غائب ہو گئی ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ تو نظر آتے ہیں، خوبصورت تراکیب نظر نہیں آتیں۔ یہ خشکی نظموں اور رباعیات میں کھپ جاتی ہے

غزل میں اپنے نہ ہونے کا شدید احساس دلاتی ہے۔ ان کی رباعیات نہایت جاندار ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ رباعی استادانہ مہارت اور اعلیٰ خیالات کی طلب گار ہوتی ہے اور یہ دونوں باتیں شور صاحب کو قدرت نے عطا کر دی ہیں۔

شور صاحب کا یہ شعری مجموعہ قاری کو عہد جدید کے بہت سے مسائل سے آشنا کرتا ہے، اسے لمحۂ فکریہ عطا کرتا ہے، عمل کی جانب گامزن کرتا ہے، شعری ذوق کی تسکین کا سبب بنتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ "زبان" سکھاتا ہے۔ میرے خیال میں اتنی ساری باتیں اگر ایک کتاب میں مل جائیں تو اسے پڑھ لینا گھاٹے کا سودا نہیں، بالغ نظری کا ثبوت ہے۔

—— ڈاکٹر ساجد امجد ——

قافیہ پیمائی

شاعر : ساجد امجد
ناشر : ثبات اکادمی، کراچی
قیمت : ۴۰ روپے

جواں سال شاعر ساجد امجد نے اپنی غزلوں کے مجموعے کا نام "قافیہ پیمائی" رکھا ہے۔ یہ نام رکھتے وقت بظاہر انہوں نے بڑے انکسار کا ثبوت دیا ہے لیکن انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام میں ناصر کاظمی کا یہ شعر بھی نقل کر دیا ہے ؎

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر — یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

بری غزل یقیناً قافیہ پیمائی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن اچھی غزل قافیہ پیمائی کے باوجود صرف قافیہ پیمائی نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ کیا ہوتی ہے؟ اس مشکل سوال کا جواب نہایت آسان لفظوں میں غالب نے یوں دیا ہے کہ "شاعری معنی آفرینی ہے نہ کہ قافیہ پیمائی"۔ یہ بات کہتے وقت غالب نے معنی آفرینی کے معنی وہی رکھے ہیں جو اُن کی شاعری سے برآمد ہوتے ہیں نہ کہ وہ جو مومن کی شاعری سے رُونما ہوتے ہیں۔ غالب اور مومن کی معنی آفرینی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غزل کی شاعری قافیہ پیمائی سے بچ نہیں سکتی۔ لیکن غزل کی شاعری کا کمال قافیہ پیمائی میں نہیں معنی آفرینی میں ہے یعنی انسانی تجربات کو معنویت عطا کرنے میں۔ اس معیار پر بہت کم شاعری پوری اترتی ہے۔ غزل میں سلیقے کی قافیہ پیمائی بھی مزہ دے جاتی ہے۔ اور بہت سے شعراء اسی مزے پر قناعت کر لیتے ہیں۔

ساجد امجد نے اپنے مجموعۂ کلام کے فلیپ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور احمد ہمدانی سے لکھوائے ہیں لیکن ان کے فلیپ کی رایوں سے زیادہ اہم خود ان کی معروضات ہیں جو "حال سے خیال تک" کے عنوان سے چھ صفحوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ساجد امجد نے ان صفحات میں اپنے متعلق اہم باتیں بتائی ہیں۔ اور شاعری کے بارے میں توجہ طلب تصوّرات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی نثر اور ان کے خیالات کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کاش وہ اپنی ساری ذہنی توانائی نثر نگاری ہی پر صرف کر ڈالتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی شاعری ناقابلِ توجہ ہے۔ وہ اردو کے پی۔ ایچ۔ ڈی اور کراچی کے ایک کالج میں اُردو کے استاد ہیں۔ لیکن ان کی شاعری ان کے علم و فضل کی ضمنی پیداوار نہیں۔ ان کی زندگی اور ذات کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ان کی شاعری ان کے ذاتی دکھوں سے اُبھری ہے۔ انہیں کے الفاظ میں ان کی زندگی غموں سے مالا مال رہی ہے لیکن انہیں غموں سے مغلوب ہونا نہیں آتا۔ بقول ان کے "میں زندگی کی تمام تر شکایتوں کے باوجود زندگی برتنے کا قائل ہوں۔ ان کی شاعری زندگی کی طرف ان کے حوصلہ مندانہ رویے کی ترجمان ہے۔ ان کے کچھ شعر سنیئے ؎

ہر جسم پہ یوں تنگ ہے یہ جامۂ ہستی — جس نے بھی خریدا ہے شکایت سے خریدا
جو اس نے مجھ سے کہا تھا وہی ہوا آخر — کہ میں نے اس کو فراموش کر دیا آخر
ہم بھی کچھ دیکھ کر ہیں مُہر بہ لب — وہ بھی کچھ سوچ کر نہیں کُھلتا

وہ دن سراب ہوئے قربتوں کے سال گئے　　اُسے بھی یاد نہیں، ہم بھی بھول بھال گئے
وہی زمیں ہے وہی آسماں، وہی دن رات　　مگر وہ شہر، وہ کوچے، وہ صورتیں نہ رہیں
دلوں کی بستیاں آباد ہیں خیالوں سے　　وہی قریب ہے یاں، دُور ہے جو آنکھوں سے

ساجدہ امجد کو اصنافِ سخن میں غزل سب سے زیادہ محبوب ہے وہ کہتے ہیں کہ "میں غزل کو باغِ شاعری کا سب سے حسین پھول تصور کرتا ہوں۔ میں نے زلفِ غزل کو سنوارنے میں رات دن ایک کئے ہیں"

چونکہ غزل کو اردو کے بہترین شاعروں کی توجہ حاصل رہی ہے، اس لئے غزل میں کوئی مقام حاصل کرنا انتہائی ریاضت چاہتا ہے ویسے شعر و ادب میں یہ خطرہ تو ہمیشہ ہی رہتا ہے کہ تمام عمر کی ریاضت کے باوجود آدمی کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔

"قافیہ پیمائی" کے ملنے کا پتا یہ ہے:-

۵/۲/۷۵ ، دستگیر سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸۔

اس کتاب کی قیمت ۴۰ روپے ہے۔

——— نظیر صدیقی ———

ہم کلام

شاعر : صبا اکبر آبادی
ناشر : بختیار اکیڈمی، کراچی۔
قیمت : ساٹھ روپے

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ نے اپنی ایک مجلس میں ارشاد فرمایا تھا کہ جو بزرگ زندگی میں خود کو شہرت دیتے رہتے ہیں مرنے کے بعد ان کا نام و نشان باقی نہیں رہتا لیکن جو زندگی میں خود کو چھپاتے ہیں، بعد وفات ان کا نام اور آوازہ ساری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ ہمارے محبوب و مقبول شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ زندگی میں استاد ذوق کو اُن پر دربار کی سبقت حاصل تھی۔ ان کے پیرایۂ اظہار کا مضحکہ اڑایا گیا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، غالب کی شاعرانہ شخصیت بعظمت نکھرتی گئی۔ اور آج ہم بڑے اعتماد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا عہد در اصل غالب کی شاعری کا عہد ہے۔ غالب کے بے شمار اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں کہ ان کی آفاقیت کی گونج ہر دل میں سنی جا سکتی ہے۔ ان کے مکاتیب سے ہم نے زندگی کا سلیقہ سیکھا ہے۔ کتابوں کے نام ہوں، شعری مجموعے ہوں، افسانوں کے مجموعے ہوں، تحریر ہو، تقریر ہو۔ غالب کا فیض ہر جگہ نمایاں ہے شعراء نے پورا دیوانِ غالب تضمین کر ڈالا ہے۔ غیر معمولی محنت و محبت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ عصر حاضر میں غالب کی مقبولیت کا تازہ ترین ثبوت ان کی فارسی رباعیات کے اردو ترجمے کا مجموعہ "ہم کلام" ہے جو معتبر اور بزرگ شاعر حضرت صبا اکبر آبادی کی غالب شناسی کا بہترین نمونہ ہے۔ غالب نے ساری زندگی اپنی فارسی شاعری پر فخر کیا ہے

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

بنیادی طور پر وہ فارسی ہی کے شاعر تھے۔ سعدی، خسرو، حافظ اور عرفی کے ہم آواز۔ قصیدہ، مثنوی، غزل، قطعہ، رباعی سب کچھ کہا اور اساتذۂ سلف کی روایت کو ترقی دے کر درخشاں تر بنا کر کہا۔ بالعموم شاعر سب کچھ کہنے کے باوجود کسی ایک صنفِ سخن ہی میں درجۂ کمال کو پہنچتا ہے۔ غالب نے ہر صنف میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ جس صنف کو دیکھئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غالب ہی اس کے جلیل القدر فرماں روا ہیں۔ اُردو میں غالب کی رباعیاں برائے نام ہیں۔ لیکن فارسی میں ان کی رباعیوں کا ذخیرہ کافی ہے اور اس رنگِ خاص میں ڈوبا ہوا ہے جس کے لئے غالب نے "ورائے شاعری چیزے دگر است" کہا تھا۔ انقلاب زمانہ یہ ہے کہ جس سرزمین نے غالب کی فارسی کو مہمیز کیا، اب وہاں فارسی

سمجھنے والے خال خال ہیں اور غالب کی فارسی شاعری نقش و نگار طاقِ نسیاں ہوگئی۔ لیکن اب بھی ایسے ادب دوست، غالب شناس اور فارسی آہنگ کے دل دادہ موجود ہیں جو غالب کی فارسیت کو بکمالِ فن اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ حضرت صبا انہیں دل دادگانِ غالب میں ہیں۔ غالب سے اُن کے شغف کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۹ء تک غالب کے اُردو کلام کی تضمین میں مصروف رہے اور گنجینۂ معنی کی طلسم بندی کرتے رہے۔ اور اب ایک باکمال رباعی گو کی حیثیت سے انہوں نے غالب کی فارسی رباعیوں کو اردو میں منتقل کر لیا، اسی آہنگ اور انداز کے ساتھ جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ ترجمہ مشکل فن ہے، منظوم ترجمہ مشکل تر۔ اسی لئے منظوم ترجمے بالعموم قاری کو متاثر نہیں کرتے لیکن اس کلام کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ترجمے نے تخلیق کی حدوں کو چھو لیا ہے اور اصل و ترجمہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ میں اس بات کی وضاحت کے لئے دو رباعیاں پیش کرتا ہوں ؎

ہر بات پہ اعتماد کیسے رکھتا — الفاظ سے دل کو شاد کیسے رکھتا
تو نے کئے مجھ سے لاکھ جھوٹے وعدے — سچا وعدہ میں یاد کیسے رکھتا

کیا موت سے خوفِ جاں ستانی ہے مجھے — یہ موت حیاتِ جاودانی ہے مجھے
خود سوزِ حیات سے پھنکا جاتا ہوں — خود موت سے تلخ زندگانی ہے مجھے

انہیں ترجمہ کون کہہ سکتا ہے، اور پھر غالب جیسے شاعر کا —— یہ غالب کے لئے ایک بزرگ فن کار اور عصرِ حاضر دونوں کا خراجِ عقیدت ہے۔

—— ڈاکٹر اسلم فرخی ——

پڑوسن کا کوٹ

ڈرامہ نگار : اوپندر ناتھ اشک
ناشر : نیا ادارہ، الہ آباد، بھارت
قیمت : ۲۵ روپے

اوپندر ناتھ اشک بزرگ ادیب ہیں۔ انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں، افسانے اور ڈرامے بھی۔ "پڑوسن کا کوٹ" اشک کے ڈراموں کا نیا مجموعہ ہے جس میں ان کے پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ جدید اردو ڈرامے کو مقامِ اعتبار بخشنے والوں میں مرزا ادیب کے ساتھ اوپندر ناتھ اشک کا نام بھی شریک ہے۔ "پڑوسن کا کوٹ" میں شامل ڈرامے زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے گرد گھومتے ہیں۔ اور اشک نے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کا اظہار کرتے ہوئے ان اقدار کی تبدیلی کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے جو ایک کسی بھی معاشرے کی تشکیلِ نو میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اوپندر ناتھ اشک بنیادی طور سے اُردو کے ادیب ہیں لیکن اُردو کی تصانیف سے زیادہ ان کو ہندی میں لکھی ہوئی کتابوں نے زیادہ مالی اعانت بہم پہنچائی ہے۔ اس کے باوجود اردو اُن کے خون میں شامل ہے۔ ہندی کے بے جا استعمال یا اردو کے استحصال کے سخت خلاف ہیں۔ اور اُن کا یہی جذبہ ان سے "بے بات کی بات" ڈرامہ لکھواتا ہے۔ "مقناطیس" اور "کھڑکی" رمزیہ ڈرامے ہیں جو باطنی احساسات کی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں۔ "پڑوسن کا کوٹ" معاشرتی درجہ بندی کے خلاف اشک کا احتجاج ہے۔

ان مختصر ڈراموں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ اوپندر ناتھ اشک نے کسی عہد میں بھی ادب سے اپنی وابستگی کو ختم نہیں کیا۔ اور ان کے قلم میں وہی جولانی اور جوانی ہے جو کسی ایسے ادیب کے ہاں ہو سکتی ہے جس کی ساری زندگی ادب سے عبارت ہے۔

—— سلطان جمیل نسیم ——

بڑی بڑی آنکھیں

نادل نگار : اوپندر ناتھ اشک
ناشر : نیا ادارہ، خسرو باغ، الہ آباد، بھارت
قیمت : ۴۰ روپے

وہ لوگ جو کسی آدرش کو اپناتے ہیں لیکن ذاتی آسودگی کے خیال کو بھی ترک نہیں کرتے اُن کا ملمع بہت جلد اُتر جاتا ہے۔ اعلیٰ نصب العین کے حصول کی خاطر اپنی نجی خواہشوں کی نفی کرنا ہی پڑتی ہے اور جو لوگ کسی اچھے مقصد کو اپنے ذاتی مفاد کا ذریعہ بناتے ہیں وہ منافق ہوتے ہیں۔ اس ناول کا بنیادی خیال یہی ہے۔

"بڑی بڑی آنکھیں" بظاہر ایک رومانی ناول ہے لیکن بقول اوپندر ناتھ اشک، ناول کسی رومان کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کرنے کے لئے نہیں لکھا گیا بلکہ اس رومانی فضا کو ذریعہ بنا کر معاشرے، اس کے افراد اور ملکی نظام کی برائیوں کو بے نقاب کرنے کا کام لیا گیا ہے۔

اشک نے جس خوبصورتی کے ساتھ معاشرے کو مسموم کرنے والے افراد کے خلاف اپنے قلم کو استعمال کیا ہے اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حقیقت نگاری پر لگائے جانے والے الزامات کی بنیاد غلط مفروضوں پر رکھی گئی تھی۔ حقیقت نگاری سے گریز اور پھر بغاوت دراصل اُن پامال اور فرسودہ لکھنے والوں کے خلاف، اقدام تصور کیا جانا چاہیئے تھا جو ایک ہی لکیر کو اتنا پیٹتے جارہے تھے کہ لکیر گڑھے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ لیکن روایت کو قدامت سمجھ کر حقیقت نگاری کو بھی مطعون کیا گیا۔" اوپندر ناتھ اشک نے "بڑی بڑی آنکھیں" لکھ کر ایک بار پھر حقیقت پسندی کے صحیح رُخ کا تعین کیا ہے۔

اس ناول میں اوپندر ناتھ اشک نے کوئی تجربہ نہیں کیا ہے لیکن اپنے سینئر ہونے کا ثبوت ایک مرتبہ پھر دیا ہے کہ بڑی باتوں کو ہیئت کا تجربہ کئے بغیر بھی سیدھے سبھاؤ پیش کیا جا سکتا ہے۔

—— سلطان جمیل نسیم ——

کتھا نگر

افسانہ نگار : جوگندر پال
ناشر : جوگندر پال ۔ ۲۰۴ سنداکانی انکلیو ۔ کالکاجی، نئی دہلی
قیمت : ۳۶ روپے

چالیس برس کے عرصے میں اُبھرنے والی افسانہ نگاروں کی نسل میں جوگندر پال کا نام بہت اہم ہے۔ اپنی نسل کے افسانہ نگاروں میں وہ بڑے زود نویس سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے کئی ناول اور افسانے کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

"کتھا نگر" جوگندر پال کے مختصر ترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے افسانوں میں زندگی کے بڑے واقعات کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کھل جانے کے باوجود چھپا رہنا ایک ایسا عمل ہوتا ہے جس کی کشش تا دیر برقرار رہتی ہے۔ اختصار کے ساتھ مؤثر انداز میں بات کہنے کی بھرپور کوشش اردو ادب میں سعادت حسن منٹو سے منسوب ہے۔ "سیاہ حاشیے" ۱۹۴۷ء کے فسادات پر مختصر افسانوں کی پہلی کتاب ہے۔ اس اختصار کو بہت سے لوگوں نے اپنایا اور کہانیاں لکھیں لیکن منٹو کے بعد جوگندر پال دوسرے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے مسلسل اس انداز کے افسانے لکھے اور اب انہیں اپنی کتاب کے ذریعہ پیش کر دیا ہے۔

"کتھا نگر" کیونکہ بہت سارے مختصر ترین افسانوں کا مجموعہ ہے اس لئے جہاں اس میں کچھ بہت عمدہ افسانے ہیں وہاں بعض اعتبار سے کمزور ترین افسانوی خاکے بھی موجود ہیں۔ لیکن ایسا تقریباً ہر لکھنے والے کے ہاں ہوتا ہے لیکن جوگندر پال جیسے افسانہ نگاروں سے جو اس وقت جدید نسل کے سینئر لکھنے والے سمجھے جاتے ہیں پڑھنے والوں کی توقعات زیادہ وابستہ ہوتی ہیں اور جس سے توقعات وابستہ ہوں اس کی ذمہ داریاں بھی

زیادہ ہوتی ہیں۔
کتھا نگر" بہ حیثیت مجموعی جوگندر پال کی یاد رکھے جانے والی کتابوں میں شامل ہے۔

——— سلطان جمیل نسیم ———

وقت سمندر

افسانہ نگار : منشا یاد
ناشر : ماڈرن بک ڈپو، آبپارہ، اسلام آباد
قیمت : ۶۰ روپے

محمد منشا یاد کے بیس افسانوں کا مجموعہ "وقت سمندر" ان کے افسانوں کی چوتھی کتاب ہے۔ اس سے قبل "بند مٹھی میں جگنو"، "ماس اور مٹی" اور "خلا اندر خلا" کے نام سے ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ محمد منشا یاد اپنے ہم عصروں میں اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس نے کسی عالم میں بھی کہانی کو افسانے سے الگ نہیں سمجھا۔ منشا یاد کی کہانیاں پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے کرداروں کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا ہے اور ان کو کوئی ہدایت دیئے بغیر ان کی فکر اور عمل کو بیان کرتا چلا جا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ منشا یاد کسی ایک نظریئے یا اسلوب کا پابند نہیں ہے۔ اس کی ہر کہانی کردار کے حوالے سے فضا بناتی ہے اور اس فضا کے حساب سے ہی کہانی کا اسلوب مقرر ہوتا ہے۔ "وقت سمندر" منشا یاد کے فن کا ایک سنگِ میل ہے۔ اس مجموعے میں "دام شنیدن"، "گیارہواں میل"، "لوہے کا آدمی"، "وقت سمندر"، "بچے اور بارود"، "اپنا اپنا کاگ" اور "اگلی صف کا آدمی" جیسی خوبصورت کہانیاں اس مجموعے میں شامل ہیں۔

——— سلطان جمیل نسیم ———

سُورج مُکھی

افسانہ نگار : شام بارکپوری
ناشر : کلچرل اکیڈمی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش
قیمت : ۳۰ روپے

شام بارکپوری بنگلہ دیش کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ "سُورج مُکھی" ان کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ تیسری دنیا کے عمومی حالات کو موضوع بنا کر شام بارکپوری نے اپنی کہانیوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ اس لئے کہیں رمزیہ انداز اختیار کیا ہے اور کہیں بیانیہ۔ کسی خیال کو واقعاتی سطح پر اس طرح بیان کرنا کہ اس کے اثرات بین السطور بھی محسوس کئے جا سکیں ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور اس انداز میں افسانے لکھنا بڑی مشق اور فن پر مکمل گرفت حاصل کئے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ شام نے اپنے بہت سے افسانوں میں نیم علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے۔ "سُورج مُکھی" کے تمام افسانے پڑھنے کے بعد شام بارکپوری کے مستقبل سے اُمیدیں قائم ہوتی ہیں۔ ایک ایسی جگہ بیٹھ کر جہاں اُردو کا عام چرچا نہ ہو اپنے خیالات کو افسانوں کے ذریعے اُردو داں طبقے تک پہنچانے کے سلسلے میں ہم شام بارکپوری کی مساعی کو قابلِ مبارکباد سمجھتے ہوئے ان کی کوششوں کے اس مجموعے کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

——— سلطان جمیل نسیم ———

مُسکراتا ہوا شخص

افسانہ نگار : قیوم راہی
ناشر : شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی
قیمت : ۳۰ روپے

قیوم راہی کے بیس افسانوں کا تیسرا مجموعہ "مسکراتا ہوا شخص" اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ قیوم راہی اپنے فن کے ساتھ ایک پُرخلوص

رویہ قائم کئے ہوئے ہے۔ قیوم راہی کے افسانے کسی بڑے موضوع کا احاطہ نہیں کرتے لیکن انسانی رشتوں کو وہ جتنے احترام کے ساتھ اپنے افسانوں کا موضوع بناتا ہے اور بیان میں کوئی پیچ و خم پیدا کئے بغیر جس قدر سادگی اور صفائی سے ان کا اظہار کرتا رہا ہے وہ اس کی انفرادیت کا جزو بن گئے ہیں۔

"مسکراتا ہوا شخص" میں شامل تمام افسانے زندگی کے عام واقعات کے گرد گھومتے ہیں اور ان رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو کسی بھی شخص کی زندگی میں کبھی بھی پیش آ سکتے ہیں۔ قیوم راہی کا کمال یہ ہے کہ گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے واقعات کو سمیٹ کر وہ افسانے کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ اصل زندگی کو دیکھنے کے لیے مختلف زاویوں سے نظریں گھمانے کی ضرورت نہیں۔ اس کو تو بس نظریں اٹھاؤ اور دیکھ لو۔

——— سلطان جمیل نسیم ———

۲۴ گھنٹے کا شہر

افسانہ نگار : احمد یوسف
ملنے کا پتہ : بُک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
قیمت : ۲۰ روپے

احمد یوسف بھارت کے معروف افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ اب تک ان کے تین افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک "۲۴ گھنٹے کا شہر" ہے جس میں بیس افسانے شامل ہیں۔

احمد یوسف نے زندگی کی سفاکیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور ان موضوعات کو علامتی اور نیم علامتی پیرایۂ اظہار کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ احمد یوسف کی کہانیوں میں ابلاغ کا مسئلہ نہیں ہوتا یعنی وہ ذہنی گنجلک نہیں ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے بات کی تہ تک نہ پہنچ سکیں بلکہ بعض کہانیوں میں تو علامتوں کی تشریح بھی کر دی گئی ہے لیکن جن کہانیوں میں علامتوں کو برتنے کے ساتھ افسانہ نگار نے اپنے فنی شعور کا بھی بھرپور طریقے سے اظہار کیا ہے وہاں تاثر بہت گہرا ہو گیا ہے جیسے ان کی کہانی "فرد" ہے۔

"۲۴ گھنٹے کا شہر" پڑھنے کے بعد خوشی اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ بھارت سے تواتر کے ساتھ اچھے افسانوی مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔

——— سلطان جمیل نسیم ———

نہیں

افسانہ نگار : علی امام
ناشر : سیدہ فردوسی معرفت سید نورالدین احمد، بنگلہ خان مرزا، پٹنہ، بھارت
قیمت : ۱۲ روپے

علی امام کی دوسری کہانیوں کا مجموعہ "نہیں" اردو افسانے کے اس رجحان کا نمائندہ ہے جہاں بات کو براہِ راست کہنے کے بجائے اظہار کے اس راستے کو اختیار کیا جاتا ہے جس کو بیس پچیس برس کے عرصے میں ہموار و استوار کیا گیا ہے اور جو کہانی کی طرف بھی جاتا ہے۔

"نہیں" کے افسانوں میں روایتی کہانی کی وہ دلچسپی نہیں ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار کتاب اُٹھا کر ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے۔" علی امام کے افسانے فکری دریچوں پر دستک دیتے ہیں اس لئے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ "سلسلہ"، "پرانے کمرے میں تنہا آدمی" اور "نہیں" کے سلسلے کی لکھی ہوئی آخری پانچ کہانیاں "نہیں" کی نمائندہ کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔ علی امام کے اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ خیال بھی آتا ہے کہ افسانہ نگار نے موضوعات کے چناؤ میں اور ان کے بیان میں جو ایک علیحدہ رویّہ رکھا ہے اگر وہ زبان کے اعتبار سے بھی محتاط رہتے تو یقیناً ان کے افسانوں کا تاثر زیادہ دیرپا اور گہرا ہو سکتا تھا۔ لیکن "نہیں" کے افسانے پڑھنے کے بعد علی امام کی افسانہ نگاری

سے امیدیں بندھتی ہیں۔ اور یہ ان کے افسانوں کی بڑی خوبی ہے۔

—— سلطان جمیل نسیم ——

تعریف اُس خدا کی

افسانہ نگار : شفیع جاوید
ملنے کا پتہ : پیپلز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، کنکر باغ، پٹنہ، بھارت
قیمت : ۵۰ روپے

شفیع جاوید کا نام بھارت کے قابلِ ذکر افسانہ نگاروں میں شامل ہے۔ "تعریف اُس خدا کی" ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ "تعریف اُس خدا کی" میں شامل افسانے پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ شفیع جاوید اپنے عصر کی رُوح کو گرفت میں لینے کے لئے کوشاں ہے۔ اسی لئے اس کی کہانیوں کے باطن سے علامتیں اُبھر کر آتی ہیں۔ اس مجموعے میں تیرہ افسانے ہیں اور یہ تمام افسانے بیان کی مختلف سطحوں سے ضرور اُبھرے ہیں لیکن واقعاتی شہادتوں کو نظر انداز کرنے کی دانستہ کوشش بھی نظر نہیں آتی ہے۔ اس لئے ان کا تاثر بھی دیر تک قائم رہتا ہے۔

وہ لوگ جو آج کے زمانے میں بھی افسانے کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں اور مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے نہیں چُوکتے ان پر ابھی افسانے کے امکانات پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے ہیں اور ان ہی لوگوں کو یہ مشورہ ہے کہ وہ شفیع جاوید کے افسانے پڑھیں۔ "تعریف اس خدا کی" میں شامل تمام افسانے انسانی رشتوں کی کہانی اس طرح سناتے ہیں کہ اجنبیت نہ ہونے کے باوجود بیان کی تازہ کاری برقرار رہتی ہے۔

—— سلطان جمیل نسیم ——